کتاب سے متعلق ضروری معلومات

نام کتاب	:	نقوش وآثار مفکر اسلامؒ
مؤلفہ	:	شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمرالزمان صاحب الٰہ آبادی دامت برکاتہم
تعداد اشاعت	:	پندرہ سو (۱۵۰۰)
صفحات	:	۴۶۴
ناشر	:	مکتبہ دارالمعارف الٰہ آباد و ادارہ فیضان معرفت بلساڑ
کمپوزنگ	:	مولانا فضل محمود فلاحی
سن اشاعت	:	رجب المرجب ۱۴۲۵ھ اگست ۲۰۰۴ء
قیمت	:	Rs. 120.

ملنے کے پتے:

☆......مکتبہ دارالمعارف الٰہ آباد، بی/۶۳۹ وصی آباد، الٰہ آباد، یوپی، ۲۱۱۰۰۳

☆......ادارہ فیضان معرفت، ۱۱/امن اپارٹمنٹ، مشتاق نگر، بلساڑ، گجرات ۳۹۶۰۰۱

☆......کتب خانہ فیض ابرار، نزد: فے بینا کلاتھ اسٹور، اسٹیشن روڈ، انکلیشور، ضلع بھروچ، گجرات

☆......مکتبہ رحمانیہ، دارالعلوم عربیہ اسلامیہ بھروچ، محمود نگر کنتھاریہ، بھروچ، گجرات

☆......نورانی کتب خانہ، چھاپی، ضلع بناس کانٹھا، شمالی گجرات، ☆ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی

☆......دارالکتاب ☆ مکتبہ نعیمیہ ☆ زمزم بک ڈپو ☆ مسعود پبلشنگ ہاؤس ☆ مکتبہ حبیبیہ، دیوبند

☆......آل انڈیا تعلیمی وملی فاؤنڈیشن، پوسٹ باکس نمبر ۹۷۲۴ ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی ۲۵

☆......الفرقان بکڈپو، ۱۱۴/۳۱ نظیر آباد، لکھنؤ، ☆ اشرفی کتب خانہ، ۴۱۷/بخشی بازار، الٰہ آباد

☆......مکتبہ نفیس، محمد علی روڈ، مالیگاؤں، ناسک ☆ نورانی بک ڈپو، نیا پورہ، مالیگاؤں، ناسک

☆......مکتبہ علمیہ، محلّہ مبارک شاہ، سہارنپور، یوپی۔

فہرست مضامین

نقوش وآثار مفکر اسلامؒ

یہ راز وہ ہے جس کو سمجھتے ہیں اہل عشق

کچھ کھورہے ہیں شوق سے کچھ پارہے ہیں ہم

حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتا بگڈھی نوراللہ مرقدہ

عرض ناشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

الحمدللہ تعالیٰ علیٰ احسانہ مکتبہ دارالمعارف الٰہ آباد کوبیش قیمت قابل قدر مطبوعات کی طباعت واشاعت کی سعادت حاصل ہورہی ہے ، اللہ کے فضل سے اس کی مطبوعات کا سلسلہ ۳۹ تک پہنچ چکا ہے ، جس میں بعض کتابوں کے دو دو اڈیشن بھی طبع ہوئے ، اقوال سلفؒ حصہ پنجم کا دوسرا اڈیشن بعض اضافات کے ساتھ ابھی جلد ہی منظر عام پر آیا ہے، اسی طرح ’’تربیت اولاد کا اسلامی نظام‘‘ کا گجراتی ترجمہ اور’’درس قرآن‘‘ کا اردو وانگریزی اڈیشن بھی طبع ہوکر نظرنواز ناظرین ہو چکا ہے۔

اس وقت حضرت والد مخدوم مولانا محمد قمرالزمان صاحب دامت برکاتہم کی ایک تازہ اورمفید تالیف ’’نقوش وآثار مفکر اسلامؒ‘‘ کے نام سے آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے، ہم اس کتاب کومکتبہ دارالمعارف الٰہ آباد سے شائع کرتے ہوئے انتہائی مسرت محسوس کررہے ہیں کہ ایک بین الاقوامی شخصیت کے تابندہ نقوش وآثار کو ہدیہ ناظرین کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ، اللہ تعالیٰ ان نقوش کونقش دوام عطافرمائے۔

جن حضرات نے ہمارے اشاعتی پروگرام میں جس انداز پر بھی ہمارا تعاون کیا ہے ہم اپنے تمام ہی معاونین کے شکرگذار ہیں جن کے تعاون سے یہ ادارہ اپنے اشاعتی پروگرام میں روبہ ترقی ہے۔ الحمدللہ

اوراس کے ساتھ ہی انشاء اللہ ’’جامع الاحکام‘‘ مؤلفہ حضرت مولانا شمس الدین صاحب زیورطبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آرہی ہے۔

خادم ادارہ

محمد عبداللہ قمرالزمان قاسمی الٰہ آبادی

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

ناظرین کی خدمت میں یہ حقیر محمد قمرالزمان الہ آبادی عرض پرداز ہے کہ عارف باللہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے جب رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ میں اس عالم فانی سے رحلت فرمائی تو یہ حقیر نظام خانقاہ کے لئے دارالعلوم کنتھاریہ بھروچ (گجرات) کی مسجد میں معتکف تھا۔ یہ خبر اس حقیر کیلئے انتہائی حزن وغم اور رقت قلب کا سبب بنی، اس سے پہلے ہمارے والد محترم کی وفات ۱۴۱۹ھ رمضان المبارک میں ہوئی تھی اس وقت بھی میں خانقاہ کنتھاریہ ہی میں مقیم ومعتکف تھا، اس قدر اس کی وجہ سے غم ہوا کہ تراویح کی نماز کے بعد عمومی بیان پر قادر نہ ہوسکا اس لئے مکرم حضرت مولانا ابوبکر سعید ترکیسری (حال مقیم لندن) نے نہایت تسلی وتقویت آمیز بیان فرمایا۔ **فجزاهم الله احسن الجزاء**

حضرت مولانا علی میاںؒ جو دراصل ہمارے صدر پدر کے قائم مقام تھے اس لئے ان کی وفات سے سوگنا رنج کا ہونا بعید نہیں مگر چونکہ بروقت مولاناؒ کے کمالات علمیہ وعملیہ سے آگاہ کرنا بھی ضروری تھا اس لئے بیحد افسردگی وشکستگی کے باوجود نہایت جوش وجذبہ سے مولاناؒ کی خصوصیات کو بیان کیا اور آپ کی خاص صفت اللہ کی طلب اور آخرت کی فکر کو آشکارا کیا۔ جس سے حاضرین وسامعین بیحد متأثر ہوئے اور بعض اہل علم نے بصد حسرت یہاں تک کہا کہ ہم لوگ حضرت مولاناؒ کی

ان صفات وکمالات سے بالکل واقف نہ تھے۔ اس طرح اس حقیر نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "**العلماء ورثة الانبیاء**" پر دو دن ایک ایک گھنٹہ بیان کیا۔ مخلصین نے ضبط کرلیا اور صاف کر کے رسالہ الشارق[1] میں شائع ہوا۔ اور پسند کیا گیا۔ **فلله الحمد والمنة**

لہٰذا اس بیان کو کسی قدر حذف وترمیم کے ساتھ حضرت مولانا کی اس مختصر سوانح مسمیٰ بہ "نقوش وآثار مفکر اسلام" میں شامل کردی اللہ اسے مفید بنائے۔ آمین

یوں تو حضرت مولاناؒ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جائے گا مگر اس کے باوجود یہ حقیر ناتواں نے مولانا کے متعلق کچھ لکھنے کی اس لئے کوشش کی تا کہ مولانا کے مداحین میں شمار ہونے کی مجھے بھی سعادت نصیب ہوجائے۔

حضرت مولاناؒ سے ابتدائی تعلق:

سب سے پہلی زیارت تو خانقاہ وصی اللّٰہی فتح پور تال نرجا ضلع مئو میں ہوئی جب کہ آپ حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی خدمت میں تشریف لائے تھے۔ جس کا ذکر خود پرانے چراغ میں حضرت مصلح الامتؒ کے تذکرہ کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے۔ پھر اس کے بعد برابر الہ آباد، لکھنؤ، رائے بریلی، بمبئی میں ملاقات کی سعادت حاصل ہوتی رہی۔ **ذالک فضل الله یوتیه من یشآء**

---

[1] یہ مؤقر رسالہ مکرم حضرت مولانا تقی الدین صاحب ندوی مظاہری کی سرپرستی میں مظفر پور ضلع اعظم گڈھ سے نکلتا ہے، ماشاء اللہ مفید ونافع مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔ فجزاهم اللہ احسن الجزاء

القرأة الراشدہ کی تجویز:

حضرت مصلح الامتؒ کو درس نظامیہ کے مجوزہ نصاب میں ادب کی بعض کتابوں کی تدریس پسند نہ تھی اس لئے آپ کو فکر ہوئی کہ اس کی جگہ دوسری کتابیں پڑھائی جائیں۔ چنانچہ مشورہ میں یہ بات طے ہوئی کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کی تصنیف کردہ کتاب القرأة الراشدة وغیرہ پڑھائی جائے۔ چنانچہ وہ منگائی گئی اور حضرتؒ خود اپنی بچیوں کو پڑھانے لگے اور مجھے برادرم مولوی نورالہدیٰ اور برادرم حافظ ثناء اللہ وغیرہ کو پڑھانے کا امر فرمایا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد حضرتؒ نے اپنی بچیوں کے پڑھانے کی ذمہ داری بھی حقیر کو سونپ دی۔ غرض حضرت مصلح الامتؒ کے القرأة الراشدة کے درس کی تجویز اور تدریس کے علم سے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو بہت خوشی ہوئی اور مزید قرب وانس کا سبب ہوا۔ اس کے بعد تو مدرسہ وصیة العلوم الہ آباد و مدرسہ عربیہ بیت المعارف الہ آباد کے نصاب میں با قاعدہ القرأة الراشدة، قصص النبیین، منثورات، مختارات سب ہی ادب کی کتابیں داخل کی گئیں۔ فللہ الحمد والمنة

الہ آباد میں تشریف آوری:

۱۹۵۷ء میں جب حضرت مصلح الامتؒ الہ آباد تشریف لائے اور مستقل اقامت اختیار فرمائی تو متعدد بار حضرت مولانا ندویؒ کی یہاں تشریف آوری ہوئی بلکہ جب بھی کسی دینی یا سیاسی جلسہ میں تشریف لاتے تو قیام حضرت مصلح الامتؒ

کی خانقاہ ہی میں ہوتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب الہ آباد کے اصلاح المسلمین کے مشہور جلسہ میں بیان کے لئے تشریف لائے تو حضرت والاؒ ہی کی خانقاہ میں قیام فرمایا، حضرت مصلح الامتؒ نے فرمایا کہ جلسہ میں جنت ودوزخ کے متعلق بیان فرمائیے گا، تو حضرت مولاناؒ نے بلاتکلف فرمایا کہ حضرت اس کا تو میرے پاس مواد ہی نہیں ہے۔ تو حضرت مصلح الامتؒ نے جنت ودوزخ کے متعلق بہت سی آیات واحادیث سنائیں جس سے حضرت مولاناؒ متاثر ومسرور ہوئے۔ اور اس کے مطابق جلسہ میں بیان فرمایا۔

غرض حضرت مولاناؒ کا حضرت مصلح الامتؒ سے اس قدر خصوصی تعلق بڑھا کہ حضرت مصلح الامتؒ نے اپنے مکتوب میں حضرت مولاناؒ کو یہ تحریر فرمایا:

> ''جو حضرات اہل علم میرے پاس آمد ورفت فرماتے ہیں ان میں غالباً سب سے زیادہ قلب کا رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے''

حضرت مصلح الامتؒ کی وفات کے بعد:

حضرت مصلح الامتؒ جب کہ ۱۳۸۷ھ ۱۹۶۷ء میں حج کے مبارک سفر میں اللہ کی رحمت میں پہنچ گئے اور سمندر ہی میں جدہ کے قریب تدفین واقع ہوئی تو حضرت مولاناؒ نے غایت محبت سے اس حقیر کو تحریر فرمایا کہ انشاء اللہ جلد ہی تعزیت کیلئے الہ آباد آؤں گا مگر متعدد بار لکھنے کے باوجود تشریف نہ لا سکے تو اس حقیر نے لکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں لوگوں کے اندر اخلاص نہیں ہے جس کی وجہ سے حضرت والا کی زیارت سے ہم لوگ اب تک محروم ہیں، اس خط کا حضرت والا پر

بہت اثر ہوا اور تحریر فرمایا کہ اب تو ضرور آؤں گا۔ چنانچہ آپ تشریف لائے اور حضرت مصلح الامتؒ کی مجلس کی جگہ بیٹھ کر بیان فرمایا جس میں خانقاہ کے آباد رکھنے کی ضرورت پر تفصیل سے کلام فرمایا اور ہم لوگوں کو اصل باطنی دولت کی تحصیل کی طرف ترغیب دی۔ **فجزاهم الله احسن الجزاء**

دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ رائے بریلی کی حاضری:

اس کے بعد حضرت مولاناؒ سے مزید تعلق استوار ہوگیا۔ چنانچہ اس حقیر نے دائرہ شاہ علم اللہ کے لئے رخت سفر باندھا، حضرت مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت مولانا بیحد مسرور ہوئے۔ اور بہت شفقت وعنایت کا معاملہ فرمایا اور ایک عمدہ عربی رومال سے نوازا۔ اس کے بعد قرب بڑھتا ہی گیا اور حضرت مولاناؒ بھی مزید لطف وکرم سے مشرف فرماتے رہے یہاں تک کہ تقریبات میں بھی حضرت مولاناؒ مدعو فرمانے لگے۔ چنانچہ جب حضرت مکرم سید مولانا محمد ثانی صاحبؒ کے صاحبزادہ مولانا حمزہ صاحب سلمہ کا رشتہ نکاح حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی صاحبزادی سے منعقد ہوا تو یہ حقیر نکاح میں شریک ہوا تو مولانا سید محمد رابع صاحب کی طرف سے کھانا کھایا اور الٰہ آباد واپسی کیلئے جب حضرت مولاناؒ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو فرمایا کہ دعوت ولیمہ کل ہے، ٹھہر جایئے اور اس میں شرکت کر لیجئے ورنہ محمد ثانی کو خیال ہوگا۔ چنانچہ یہ حقیر ٹھہر گیا اور دعوت ولیمہ میں شرکت کرکے ہی واپس ہوا۔

فلله الحمد والمنة

ستائیسویں رمضان کو حاضری:

الحمدللہ علی احسانہ کہ عموماً رمضان المبارک کی ستائیسویں شب میں دائرہ شاہ علم اللہ حاضری ہوتی تھی حضرت مولاناؒ کے ساتھ ہی افطار وطعام کا نظم ہوتا تھا، حضرت والاؒ شب قدر کی فضیلت اور اس میں پڑھی جانے والی دعا ''**اللهم انك عفو تحب العفو فاعف عنى**'' پر بیان فرماتے تھے۔ اسی بیان کے درمیان حضرت سید احمد شہیدؒ کا ذکر آیا تو نہایت تأثر سے فرمایا کہ حضرت سید صاحبؒ نے مال یہاں لٹایا اور گردن بالاکوٹ میں کٹائی۔ مولاناؒ نے اس بات کو ایسے وجد وکیف سے فرمایا کہ خود اپنے کو بھی بہت اثر ہوا اور قلب نے عجیب کیفیت محسوس کی۔

مگر جب سے یعنی ۱۴۱۲ھ کے رمضان المبارک سے اعتکاف اور خانقاہ کے نظام کے لئے کنتھاریہ بھروچ (گجرات) آنا جانا شروع ہوا اس وقت سے رمضان کی ستائیسویں تاریخ میں دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کا آنا جانا موقوف ہوگیا اور اس سعادت سے محرومی ہوگئی۔ مگر الحمدللہ حضرت والاؒ کی خدمت میں درمیان سال حاضری کا سلسلہ جاری رہا۔ اور رمضان المبارک میں دعا کیلئے عریضہ ضرور ارسال کرتا۔ چنانچہ حضرت والاؒ کی جس رمضان میں وفات ہوئی اس سال بھی دعا کیلئے خط لکھا تھا جس کا جواب باصواب حضرتؒ نے ارقام فرمایا تھا جو مکتوب مرقومہ میں درج ہے، جس کو میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

حضرتؒ کا محبت وعنایت کی باتیں:

رابطہ ادب عربی میں شرکت کے لئے حضرتؒ کی طرف سے دعوت دیجاتی

تھی ۔کبھی کبھی شرکت بھی کی ،ایک مرتبہ ادب عربی کا جلسہ ہو رہا تھا ۔میں حضرت
مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ آپ خوب آئے میں تنہا تھا آپ کے
آنے سے ہم دو ہوگئے ۔اسی طرح کے اور بھی محبت وعنایت بلکہ حسن ظن کی
باتیں فرمائیں ۔جس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پیام انسانیت کے افتتاح کے
لئے حضرت مولانا ندویؒ الہ آباد تشریف لائے تو ایک صاحب کے گھر میں ایک
خصوصی مجلس میں فرمایا کہ میں نے اس تحریک کا آغاز الہ آباد سے اس لئے کیا ہے
کہ اکثر تحریکیں الہ آباد ہی سے شروع ہوئی ہیں مگر ان کا کمال دکن میں ہوا ہے ۔
اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں آپ لوگ موجود ہیں ۔اس وقت یہ حقیر اور مکرم ڈاکٹر
حافظ صلاح الدین صاحب موجود تھے ۔

سبحان اللہ! یہ بات کس قدر محبت وعنایت اور حسن ظن کی ہے ۔**فجزاھم
اللہ تعالیٰ احسن الجزاء**

ایک مرتبہ یہ حقیر خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت بعض
نامساعد حالات کی بناء پر کچھ متأسف اور متأثر ہیں تو آکر الہ آباد سے عریضہ ارسال
کیا جس میں یہ شعر لکھا ؎

گویند سنگ لعل شود در مقام صبر　　آرے بود ولیک بخون جگر شود

حضرت اس شعر کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور تحریر فرمایا کہ یہ شعر آپ نے کہاں
سے لکھا ہے؟ تو میں نے جواب میں عرض کیا کہ یہ شعر حضرت حکیم الامت مولانا شاہ ولی
اللہ محدث دہلویؒ کی تصنیف لطیف تفہیمات الٰہیہ میں درج ہے اسی سے نقل کیا ہے۔

آپ کی غایت عنایت تھی کہ جب بھی حضرت کی خدمت میں حاضری ہوتی

تو واپسی کا کرایہ مرحمت فرماتے مگر ایک مرتبہ عنایت نہ فرمایا ،لیکن چند روز کے بعد
مولاناؒ کا مکتوب گرامی موصول ہوا جس میں ارقام فرمایا تھا کہ اس مرتبہ آپ کو میں
نے زاد راہ نہ دیا معاف فرمایئے گا ،اسلئے کہ اس وقت میرے پاس خود کچھ نہ تھا ۔

غایت تواضع :

یہ حقیر ١٣٩٨ھ ١٩٧٨ء میں حج کیلئے گیا تو حضرت مولانا سید محمد طاہر صاحبؒ
والد مولانا سید سلمان صاحب ندوی کے ہاتھ حضرت مولاناؒ کیلئے مدینہ منورہ سے
ایک جوڑا موزہ ارسال خدمت کیا ۔مجھے تو اس کا خیال بھی نہ تھا مگر میں جب
مہینوں کے بعد حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کہ آپ نے مدینہ منورہ سے بڑے موقع
سے موزہ بھیجا تھا ۔اسلئے کہ اس وقت پہننے کے لئے میرے پاس موزہ موجود نہ تھا ۔

ایک مرتبہ الہ آباد کسی خاص جلسہ میں تشریف لائے تھے رات میں جلد سونا
چاہتے تھے ۔مگر جہاں دعوت تھی وہاں سے کھانا نہیں آیا تھا ۔قیام مدرسہ عربیہ بیت
المعارف میں ہی تھا ،جب زیادہ دیر ہونے لگی تو کھانے کی اشتہا ظاہر فرمائی تو
فوراً یہ حقیر انڈا فرائی اور گرم گرم روٹی تیار کرا کے گھر سے لایا ،حضرت نے خوشی خوشی
تناول فرمایا اور ہماری تسلی کے لئے فرمایا کہ یہ کھانا تو ہمیں بہت مرغوب ہے ۔

سبحان اللہ! کیسی دلجوئی ودلداری کی باتیں ہیں جو آپ کی شرافت نفس بلکہ
سیادت نسب پر دال ہیں ۔اللہ ہم تمام منتسبین کو ان صفات حسنہ سے متصف
فرمائے ،آمین ۔

ایک مرتبہ اپنے بچوں مقبول احمد ،سعید احمد ،عزیز احمد ،محبوب احمد کو لے کر

حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کہ یہ لوگ کیا پڑھتے ہیں۔ میں نے کہا عربی، تو تعجب سے فرمایا سب عربی پڑھ رہے ہیں؟ اور خوشی کا اظہار فرمایا۔ الحمدللہ یہ چاروں لڑکے تو عالم ہو ہی گئے۔ ان کے علاوہ ان سے چھوٹے محمد عبداللہ، محمد عبیداللہ بھی عالم ہوگئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ وفات سے کچھ دنوں پہلے میں نے حضرت مولانا سے عرض کیا کہ حضرت میرے چھ لڑکے ہیں ان میں سے تین قاسمی ہیں اور تین ندوی ہیں۔ مولاناؒ نے خوش ہوکر فرمایا کہ آپ نے خوب تقسیم کیا۔

عزیزی مولوی سعید احمد کا ندوہ میں داخلہ:

جب نور چشم سعید احمد دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے تو اس حقیر نے ادب پڑھنے کیلئے دارالعلوم ندوہ لکھنؤ میں داخل کیا، اس سے حضرت مولانا بہت خوش ہوئے اور باہم ربط وتعلق میں اضافہ کا سبب ہوا۔ چنانچہ عزیزی سعید احمد سلمہ کی وجہ سے گاہے گاہے دارالعلوم ندوہ آنا جانا رہتا تھا، اس طرح حضرت مولانا سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا تھا اور مجلس میں بھی شرکت کی سعادت نصیب ہوتی تھی، آخر دو سال پڑھنے کے بعد ادب عربی کا نصاب پورا ہوا، اس اثناء میں سعید احمد سلمہ پر آپ کی خاص عنایت مبذول رہی اور اکثر سعید کو اسم بامسمیٰ فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولاناؒ نے حضرت مصلح الامت کی نسبت کی بناء پر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلے کا خصوصی انتظام فرمایا، چنانچہ جامعہ کے کلیۃ الدعوۃ میں داخلہ ہوگیا، اور چار سال وہاں پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد حکومت سعودیہ کی طرف سے افریقہ کے ممالک زامبیا، ملاوی وغیرہ میں مبعوث ہوئے، اسکے بعد کچھ دنوں ریاض تقرر رہا پھر بحرین میں بھیجے گئے اور اب تو ماشاء اللہ

ان کو بحرین کی سکونت کا حق مل گیا ہے۔ یہ سب حضرت مصلح الامتؒ اور حضرت مولانا ندویؒ کی محبت وعنایت اور دعا وتوجہ کا ثمرہ ہے۔ **جزاھم اللہ احسن الجزاء**

ایک مبارک خواب:

اس حقیر نے خواب دیکھا کہ حضرت مولانا ندویؒ کہیں تشریف فرما ہیں اور میں بھی حاضر ہوں، اتنے میں مجھے سینہ سے چمٹا کر فرمایا گھبرائیں نہیں آپکی اولاد میری اولاد ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خواب اس پریشان حال کیلئے کس قدر تسلی بخش ہوا ہوگا۔[1] **فللہ الحمد والمنۃ**

اس حقیر نے جب اس خواب کا ذکر حضرت مولاناؒ سے کیا تو بہت خوش ہوئے، ساتھ ہی میں نے یہ بھی عرض کیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے فرمایا تھا کہ آپ کی اولاد میری اولاد ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے لئے کتنی بڑی بشارت تھی، اسی طرح اس حقیر کی تسلی وطمانیت کے لئے سلسلۂ نبوت کے چشم وچراغ کی زبان سے یہ بات کہلائی۔ اس بات کو بھی سن کر مولانا ندویؒ بہت مسرور وخوش ہوئے۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتابگڈھیؒ کی خدمت میں:

حضرت مولانا ندویؒ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی وفات کے بعد

---

[1] اس خواب کو یہ حقیر بیان نہ کرتا مگر حضرت شاہ صاحبؒ نے آخر بیان فرمایا جبھی تو ہم سب کو معلوم ہوا اسی اصول کی بناء پر ہمت کرکے اس خواب کو زیر قلم لایا۔ اللہ معاف فرمائے عجب وغیرہ سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھیؒ کی خدمت میں تشریف لاتے تھے تو اکثر مدرسہ بیت المعارف بخشی بازار الہ آباد میں قیام فرماتے تھے۔ بعض دفعہ متعدد علماء ومشائخ مثلاً حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمیؒ، حضرت مولانا ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم اور حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم وغیرہم کا اجتماع ہوجاتا تھا، جس سے دینی وایمانی خوشگوار فضا قائم ہوجاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس دور میں بھی زیادہ سے زیادہ اصحاب نسبت ومعرفت پیدا فرمائے تاکہ جگہ جگہ محبت ومعرفت کی دکانیں کھل جائیں، **وماذالک علی اللہ بعزیز**

ایک دفعہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے جب کہ مدرسہ بیت المعارف میں قیام فرماتھے تو حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سے فرمایا کہ حضرت آپ ندوہ کو بیت المعارف کی طرح سمجھ لیجئے۔ یہ حضرت مولاناؒ کی غایت تواضع ومسکنت کی بات تھی جو اللہ عزوجل کو بہت پسند ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ چند دنوں کیلئے دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف لے گئے اور آپ کی مجلسیں ہوئیں لوگ کافی متأثر ہوئے۔

حضرت مولاناؒ کی تصانیف سے مناسبت:

الحمدللہ حضرت مولاناؒ کی تصانیف سے پہلے ہی سے مناسبت تھی اسلئے اس کا برابر مطالعہ رہا اور ہے، حضرت مولاناؒ بھی اکثر اپنی نئی تصانیف عطا فرماتے تھے ورنہ خود یہ حقیر موقع بموقع خرید لیا کرتا تھا جس کے اقتباسات مجالس ومواعظ میں پیش کرتا رہتا تھا اور اب اپنی تصنیفات میں درج کرنیکا سلسلہ بھی جاری ہے، خاص

طور سے دعوت وعزیمت سے کافی اقتباسات اقوال سلفؒ میں درج کئے ہیں۔

چنانچہ خود حضرت مولاناؒ نے اقوال سلفؒ حصہ دوم وپنجم کو اپنے مقدمہ ثمینہ سے زینت بخشا اور حصہ ششم پر حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ العالی نے مقدمہ ارقام فرمایا۔

الحمدللہ کہ حضرت مولاناؒ کے والدو والدہ محترمہ وہمشیرہ، نیز خاندان کے دوسرے متعدد حضرات رحمہم اللہ کے تذکرے اقوال سلفؒ میں درج کئے ہیں۔ اس سے بھی حضرت مولاناؒ خوش ہوئے اور اس کا اظہار اقوال سلفؒ حصہ پنجم کے مقدمہ میں فرمایا ہے۔ **فجزاھم اللہ احسن الجزاء**،

عزیزم محبوب احمد وعزیزم محمد عبید اللہ کا داخلہ:

الحمدللہ کہ ندوۃ العلماء سے مولوی سعید احمد سلمہٗ کی فراغت ۱۳۹۵ھ میں ہوئی اسی سن کے ماہ شوال میں ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ اجلاس پورے شان وشوکت کے ساتھ منعقد ہوا۔ اس کے ایک سال کے بعد نور چشم محبوب احمد سلمہٗ کو ندوۃ العلماء میں داخل کیا جنہوں نے ۱۹۸۳ء میں عالمیت کی سند حاصل کی، اس کے بعد محمد عبید اللہ سلمہٗ کو ندوہ میں شوال ۱۴۱۵ھ ۱۹۹۵ء میں داخل کیا اور انہوں نے ۱۴۲۱ھ ۲۰۰۱ء میں عالمیت کا نصاب پورا کیا اور فارغ ہوگئے۔ حضرت مولاناؒ کی وفات سے کچھ دنوں پہلے خدمت میں حاضر ہوا تو بہت ہی خوشی سے فرمایا کہ ابھی میری خیریت معلوم کرنے کے لئے مولوی سعید کا فون آیا تھا۔ اور اس وقت بھی فرمایا کہ سعید اسم بامسمّیٰ ہیں ان کو فلاں فلاں کتابیں بھیج دیں وہاں کے علماء کو

پہنچادیں۔الحمدللہ وہ کتابیں اس حقیر نے بھیج دی تھی۔

عزیزم محبوب احمد کی بیعت:

اس مجلس میں محبوب احمد کی بیعت کے لئے میں نے عرض کیا تو بخوشی بیعت فرمالیا یہ محبوب احمد سلمہٗ کی خوش نصیبی کی بات ہے۔**بارک اللہ فیہ وتقبلہ** ، اللہ تعالیٰ جملہ سلاسل کے بزرگوں کی روحانیت وباطنی توجہات سے مالامال فرمائے۔اوراپنی نسبت سے مشرف فرمائے۔آمین۔

چونکہ حضرت مولاناؒ کے مواعظ ومجالس میں شرکت کی بکثرت توفیق ہوتی رہی اسلئے بہت سے ملفوظات وارشادات ذہن نشین ہیں ان میں سے بعض باتیں قید کتابت میں لا کر محفوظ کرنے کی سعی کی جو ملفوظات شنیدہ کے تحت آگے درج کئے جارہے ہیں۔

اسی طرح مکاتبت کا سلسلہ بھی عرصہ تک رہا اسلئے آپ کے بہت سے خطوط میرے پاس محفوظ ہیں،ان میں سے چند خطوط ''مکتوبات مرقومہ'' کے عنوان سے درج کئے جارہے ہیں جن سے حضرت مولاناؒ کی محبت وشفقت کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی زیدمجدہم اوران کے بھائیوں اوراہل خاندان کواس حقیر سے غایت تعلق ومحبت ہے، جو میں اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا ہوں ، اسی تعلق کی بنا پر اس کتاب کا مقدمہ حضرت مولانا ندوی کے بھانجے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی زیدمجدہ نے ارقام فرمایا جو مولانا کے ظاہری وباطنی دونوں سلسلوں کے امین ہیں یعنی جیسے مولانا کی نیابت میں دارالعلوم ندوہ کی نظامت کا حق ادا کررہے ہیں ویسے ہی ماشاء اللہ تصوف وسلوک کے سلسلہ کو مولانا کے مجاز وخلیفہ ہونے کی

حیثیت سے بخوبی جاری فرمارہے ہیں۔

ان حضرات کے غایت تعلق ہی کا نتیجہ ہے کہ اپنی بے بضاعتی کے باوجود اپنے مؤقر ادارہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا رکن شوریٰ نامزد فرمایا۔

ہم نے اس سوانح میں حضرت مولاناؒ کی تصانیف کے اقتباسات اور متعدد مقالات نقل کرنے کی سعی کی تاکہ حضرت مولاناؒ کے صلاح واصلاح اور تعلیم وتعلم ، دعوت وتبلیغ اور تصوف وسلوک میں مہارت وحذاقت مثل آفتاب کے ہر پڑھنے والے پر روشن ہوجائے،خاص طور سے ہم نے ''ارکان اربعہ'' سے زیادہ تر اقتباسات درج کئے تاکہ ناظرین کرام ان پرحکمت اور پرکیف مضامین سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہوجائیں، اللہ تعالیٰ مجھے اس مقصد میں کامیابی عطا فرمائے اوراس سے ہر مسلمان کو مستفیض فرمائے،خاص طور سے ہم منتسبین ومتعلقین کو حضرت مولاناؒ کی علمی،فکری وباطنی صفات وکمالات کی طرف متوجہ فرمائے اور بہرہ ورفرمائے۔آمین

اخیر میں اپنے معاونین کا شکریہ ضروری سمجھتا ہوں ،مثلاً مولانا مفتی زین الاسلام صاحب،مولانا مقصود احمد صاحب ومولوی فیروز عالم سلمہ (اساتذہ مدرسہ عربیہ بیت المعارف الٰہ آباد) جنھوں نے ترتیب وتصحیح میں کافی جدوجہد کی۔نیز عزیزم مولانا فضل محمود سلمہ جنھوں نے اس کی ترتیب وتبویب میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی،اورکمپوزنگ بھی نہایت صفائی وعمدگی سے کی یقیناً وہ قابل صد تحسین ہیں۔اور عزیزم مولوی حافظ عبیداللہ ندوی سلمہ نے بھی کمپوزنگ میں حصہ لیا۔ **فجزاھم اللہ احسن الجزاء**

میری خوش نصیبی ہے کہ مشفقی المکرّم حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی (مقیم حال کینیڈا) اورمحبی المحترم مولانا قاری محمد احسن صاحب فتح پوری (بانی وناظم

مدرسہ تجوید الفرقان فتح پور) اور صدیقی العزیز مولانا محمد ایوب صاحب سورتی (مقیم حال برطانیہ) نے اپنے تأثرات وتعارف کولکھ کراس کتاب کوزینت بخشا۔

فجزاهم الله تعالى أحسن الجزاء

اب اس کے بعد آپ کی ولادت ، خاندان ، تعلیم وتدریس اور وفات وغیرہ کے بیان کا سلسلہ شروع ہورہا ہے جس کے لئے ''سوانح مفکر اسلام'' مرتبہ عزیزم مولانا سید بلال عبدالحی حسنی صاحب کو ماخذ بنایا ہے اسلئے کہ اس سے بڑھ کر قابل اعتماد ماخذ ومواد میسر نہیں ہوسکتا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزم مولانا سید بلال سلمہ کو مزید اس قسم کی تحقیقی کتابوں کے لکھنے کی توفیق مرحمت فرمائے ، نیز جن حضرات [۱] کی تصنیفات سے اقتباسات اپنی تالیف میں درج کئے ہیں ان سب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر مرحمت فرمائے۔ آمین

اس سوانح کا نام اس حقیر نے کسی صاحب نسبت ومعرفت بزرگ کے اس شعر ؎

تلک آثارنا تدلّ علینا　　　فانظروا بعدنا الیٰ الآثار

کی روشنی میں احباب کے مشورہ کے بعد ''نقوش وآثار مفکر اسلامؒ '' تجویز کیا اللہ تعالیٰ اسم بامسمیٰ بنائے اور میری اس سعی کو قبول فرمائے اور بفحوائے حدیث ''**عند ذکر الصالحین تتنزل الرحمة**'' اس کے سننے سنانے ، پڑھنے پڑھانے کے وقت اپنی خاص رحمت کا نزول فرمائے۔ آمین

فالله الموفق وهويهدى الى سواء السبيل

محمد قمر الزمان الہ آبادی عفی عنہ

۱۳؍جمادی الثانیہ ۱۴۲۵ھ　یکم اگست ۲۰۰۴ء

[۱] مکرم مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی، مکرم مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب، مولانا ممشاد علی صاحب قاسمی اور ڈاکٹر مسعود الحسن صاحب عثمانی۔

مقدمۂ کتاب

از حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب ندوی دامت برکاتہم

ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وخلیفہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين و خاتم النبيين محمد وعلى آله وصحبه اجمعين و من تبعهم باحسان ، ودعا بدعوتهم الى يوم الدين و بعد !

یوپی کے مشرقی اضلاع کا خطہ جس میں رائے بریلی تا الہ آباد تا اعظم گڈھ کے اضلاع شامل ہیں ، خاص طور پر اس خصوصیت کا حامل رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی طلب میں اپنی زندگی لگانے اور لوگوں میں صحت عقیدہ اور اطاعت الٰہی کی طرف رجحان بنانے کے کام کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئی بزرگوں کو خصوصی طور پر توفیق ملی ، ان میں حالیہ دور میں خاص طور پر حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اعظمی ثم الہ آبادی (جو مرشد کبیر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اجل خلفاء میں ہیں) کا نام نامی نمایاں ہے ان کا فیض اس خطہ میں خاصا پھیلا اور لوگوں میں روحانیت اور للّٰہیت کی زندگی اختیار کرنے کی مثالیں مختلف افراد میں ظاہر ہوئیں ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ ہی میں اس خطہ میں حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری (جو بیک واسطہ اویس زمانہ حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ ہیں) نے بھی اسی خطہ میں دعوت وارشاد کا خاموش اور پرمشقت دوروں کے ذریعہ کام کیا اور اس طرح

ارشاد وتربیت کے کام میں طویل وقت گذارا، اور فیض پہنچایا اور حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کی وفات کے بعد ان کو خصوصی طور پر یہ کام انجام دینا پڑا، ان دونوں سے جو فیض پھیلا اسکے نتیجہ میں انکے اجازت یافتہ مسترشدین حضرات متعدد جگہوں پر اپنے شیخ سے حاصل کردہ تربیت وارشاد کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

ان حضرات میں مولانا شاہ محمد قمر الزمان صاحب اعظمی ثم الہ آبادی جو حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کے مسترشد ومجاز ہونے کے ساتھ ان کے داماد بھی رہے، اور ان کو حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی وفات کے بعد مولانا شاہ محمد احمد صاحب پھولپوری سے بھی استرشاد کا خصوصی تعلق رہا اور ان سے خلافت بھی ملی، تربیت وارشاد کا کام انجام دے رہے ہیں اور ان کی کوششوں کا سلسلہ صرف خطۂ مشرقی یوپی تک محدود نہیں بلکہ گجرات، افریقہ، یوروپ وکینیڈا وغیرہ کے حلقوں تک پھیلا ہوا ہے، ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اصلاح وارشاد کے موضوع پر وہ صاحب تصانیف بھی ہیں، اور ان کا تصنیفی سلسلہ برابر جاری ہے، ان کی تصنیفی خصوصیات میں یہ خصوصیت خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے مذکورہ بالا بزرگوں کے ساتھ ساتھ دوسرے بزرگوں سے بھی تعلق خاطر رکھتے ہیں، اور ان کے تذکرہ کو بھی اپنے حلقہ کے بزرگوں کے تذکرہ کی طرح سمجھتے اور کرتے ہیں، چنانچہ اصلاح وارشاد کے سلسلہ کی ان کی تصنیفات میں اس کے نمونے ملتے ہیں، اور زیر نظر کتاب اس کی ایک بڑی شہادت ہے، یہ انہوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے سبق آموز واقعات وحالات پر مستقل تصنیف کے طور پر تیار کی ہے، اور اس میں حضرت مولاناؒ سے اپنی ملاقاتوں کے دوران جو تاثر لیا اور ان کی شخصیت کے جو سبق آموز پہلو محسوس کئے ان کے تذکرے کے ساتھ ساتھ دعوت وارشاد اور

دین متین کی شرح ووضاحت کے موضوعات پر ان کی جو تصنیفات ہیں ان کے اقتباسات بھی جمع کئے ہیں، اس طریقہ سے انہوں نے اپنے دل کی اس آواز کو کہ مولاناؒ نے جو دین وملت کی خدمت کی ہے اور تربیت وارشاد کے سلسلہ میں جو کام کیا ہے اس کا تعارف کرانے میں ان کا بھی حصہ ہو، دوسروں تک پہنچایا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندویؒ سے مولانا محمد قمر الزمان صاحب اطال اللہ بقاءہ کا تعلق اس وقت سے شروع ہوا جب مولاناؒ کا حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے پاس جانا ہوا اور ملاقات کا سلسلہ رہا اور شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا بھی مولانا سے تعلق خاطر ظاہر ہوا، اور خط وکتابت اور استفسار حال کا سلسلہ بھی رہا، مولانا علی میاں ندویؒ اور مولانا محمد احمد صاحب پھولپوریؒ کے درمیان بھی قریبی تعلق تھا، اس کے علاوہ مولانا علی میاں صاحبؒ کے نانا حضرت شاہ ضیاء النبی صاحبؒ اور خاندان کے دوسرے بزرگ مولانا سید محمد امین صاحب نصیر آبادی کا حلقۂ ارشاد موجودہ عہد سے پہلے عہد میں اس پورے خطہ میں قائم رہ چکا تھا جس کی یادیں تاحال باقی ہیں، اور اس خطہ کی جو رائے بریلی سے جونپور اور اعظم گڈھ تک پھیلا ہوا ہے بڑے بوڑھے ان بزرگوں کو یاد کرتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ بزرگ حضرات حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ وغیرہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو ان بزرگوں اور اسلاف کی وجہ سے اپنے دل سے قریب محسوس کرتے رہے، اور غالباً اس ربط وتعلق کا اثر مولانا محمد قمر الزمان صاحب کے تعلق میں بھی آیا۔

مولانا علی میاں صاحبؒ نے اپنے خاندان کے ان بزرگ اسلاف کے طریقہ کو اپنایا بھی تھا اور اصلاح وارشاد کے کام کو زیادہ وسیع رقبہ میں اور تحریر وتقریر

دونوں ذریعوں سے پھیلایا، مولاناؒ کی ایک خصوصیت یہ رہی تھی کہ اپنے عہد کے سب ہی بزرگوں سے نیازمندی اور استفادہ کا تعلق رکھتے تھے، اور ان سے فیض بھی اٹھایا اور ان سب کی شفقت ودعاؤں سے مستفید ہوئے، دوسری خصوصیت یہ رہی کہ پھر انہوں نے اپنے عملی پہلو میں دین کی نصرت اور مسترشدین کی اصلاح و تربیت کی متنوع صفات کو اختیار کیا، چنانچہ امت مسلمہ کی ضرورت کے تعلیمی، معاشرتی، اصلاحی اور فکری اور ملکی پہلوؤں میں اپنی عملی وتربیتی صلاحیتوں کے ذریعہ تحریراً وتقریراً کام انجام دیا، اور یہی وجہ ہے کہ امت کے مختلف النوع طبقات میں مولاناؒ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

مولاناؒ کے قدردانوں میں مولانا محمد قمر الزمان صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کی اس قدردانی اور مولاناؒ سے محبت اور تعلق ہونے کی یہ ایک اچھی مثال ہے کہ مولاناؒ پر کتاب تیار فرمائی، مولانا محمد قمر الزمان صاحب اپنے اس تعلق میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندویؒ سے تعلق کے ساتھ ساتھ ان کے عزیزوں سے بھی محبت وشفقت کا معاملہ رکھتے ہیں، انہیں میں یہ کاتب الحروف بھی ہے کہ جس کی بے بضاعتی کے باوجود مولانا موصوف نے اس سے کتاب کا مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی، کتاب کے مشتملات میں کیا خوبیاں ہیں اور خود مصنف کی کیا تصنیفی خصوصیات ہیں اس کو انشاء اللہ خود قارئین اپنے مطالعہ سے سمجھ سکیں گے کہ:

شنیدہ کے بود مانندۂ دیدہ

محمد رابع حسنی ندوی

دار عرفات، دائرۂ حضرت شاہ علم اللہ

تکیہ کلاں رائے بریلی

۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ بروز شنبہ

''کچھ تأثرات کچھ یادیں''

از حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم

سابق رئیس الجامعہ دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر سورت گجرات

حضرت مولانا علی میاں رحمہ اللہ کی شخصیت امت کیلئے عطیۂ الٰہی تھی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت امت اسلامیہ کے لئے عطیۂ الٰہی تھی، اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ان کی ذات میں ایسی ایسی صفات عالیہ جمع فرمادی تھیں جو بہت کم اشخاص کے اندر پائی جاتی ہیں، حضرت رحمہ اللہ کی وفات کے بعد ہندوپاک کے علاوہ عالم عرب بلکہ یورپ اور امریکہ میں بھی تعزیتی مضامین، سیمینار، اخباروں اور رسائل کے خصوصی نمبرات کے ذریعہ حضرت کی خدمات جلیلہ پر اتنا لکھا گیا ہے کہ حضرت کی زندگی، آپ کے افکار واعمال کے بارے میں شاید ہی کوئی گوشہ تشنہ رہ گیا ہو۔

اس کے باوجود حضرت کے متعلقین اس عبقری شخصیت کی زندگی اور ان کے اعمال عظیمہ کے بارے میں مختلف انداز اور مختلف طریقوں سے روشنی ڈالتے رہتے ہیں۔

شیخ طریقت مدظلہ کو حضرت مولاناؒ سے خصوصی ربط

شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الٰہ آبادی مدظلہ کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کے ساتھ خصوصی ربط وتعلق رہا ہے، اس لئے مولانا مدظلہ نے حضرت مولانا علی میاں رحمہ اللہ کے بارے میں اپنے تعلقات کی روشنی میں قلم اٹھایا ہے، مولانا محمد قمر الزمان صاحب مدظلہ کو اللہ تعالیٰ نے بزرگوں کی سوانح اور ملفوظات جمع کرنے اور اس کو آسان زبان میں پیش کرنے کا ایک خاص سلیقہ عطا فرمایا ہے، اس لئے اس اطلاع سے ہمیں بہت مسرت ہوئی۔

حضرت اقدس مدظلہ نے از راہ ذرہ نوازی اس ناچیز کو بھی حکم فرمایا کہ حضرت مولانا علی میاں رحمہ اللہ کے بارے میں اپنے تأثرات لکھ بھیجوں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی رحمہ اللہ جیسی عظیم شخصیت کے بارے میں میرے ایسے کم مایہ طالب علم کا کچھ لکھنا بہت ہی دشوار کام ہے، مگر بزرگوں کے حکم کی تعمیل بھی ضروری ہے، اس لئے چند کلمات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں تاکہ خریدارانِ یوسف میں ہمارا نام بھی شامل ہوجائے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کیساتھ ناچیز کا غائبانہ تعلق

یہ ناچیز غالباً ۱۹۵۱ء سے جب کہ اس کا پنجم کا تعلیمی سال تھا حضرت مولانا ندویؒ کے بعض مقالات ومضامین سے ''الفرقان'' کے ذریعہ واقف ہوا، نیز مولانا رحمہ اللہ کے کچھ رسائل بھی اردو زبان میں پڑھنے کا اتفاق ہوا، مولانا کا اسلوب ہی

ایسا ہے کہ ہر شخص کو فوراً اپنی طرف مائل کرلیتا ہے، اس لئے ایک کے بعد دوسرا مضمون تلاش کیا جانے لگا، اور اس طرح حضرتؒ کے ساتھ اوائل عمر میں تعلق پیدا ہوگیا، اور دل میں حضرت مولانا سے ملنے کی شدید خواہش پیدا ہونے لگی، مگر طالب علمی کی زندگی میں اسکی نوبت نہ آسکی۔

۱۹۵۹ء میں پہلی ملاقات اور زیارت

۱۹۵۹ء میں مولانا اسماعیل گارڈیؒ کے صاحبزادگان کے ساتھ دار العلوم دیوبند میں قیام ہوا، تو اتفاق سے ایک دوست نے اطلاع دی کہ حضرت شاہ عبد القادر رائپوری رحمہ اللہ آج کل بہٹ ہاؤس سہارنپور میں تشریف لائے ہیں اور حضرت اقدس کے بہت سے خدام کے علاوہ لکھنؤ سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ بھی حضرت کے ساتھ مقیم ہیں۔

ان دونوں عظیم ہستیوں کے سہارنپور میں تشریف لانے کی خبر سے بہت مسرت ہوئی اور دل کی دیرینہ تمنا برآنے کی سبیل پیدا ہوگئی، شام کی گاڑی سے سہارنپور روانہ ہوکر حضرت رائپوریؒ کی قیام گاہ پہنچے اور اکابرین کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

یہ حضرت مولانا رحمہ اللہ کے ساتھ سب سے پہلی ملاقات تھی، پہلی ہی ملاقات میں حضرت کی سادگی، اور محبت بھری باتوں نے بہت متأثر کیا، حضرت رائپوریؒ کے خدام میں پاکستان کے علماء بھی تھے اور مولانا رحمہ اللہ ان کے ساتھ ضروری گفتگو میں مصروف تھے اس لئے مولانا علی میاں صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ

زیادہ بات چیت کا موقع نہ مل سکا، مگر حضرت کے دیدار سے مشرف ہونے سے دل بہت خوش ہوا۔

حضرت رحمہ اللہ سے دوسری ملاقات اور مولانا کے مفید مشورے

پھر دارالعلوم دیوبند کے قیام کے ان ہی دنوں میں چند دوستوں کے ساتھ مشورہ ہوا کہ ہم لوگوں کو عربی زبان میں کوئی پرچہ شائع کرنا چاہیئے، اس زمانہ میں جامعہ ازھر کے مبعوث شیخ محمود عبدالوہاب محمود طنطاوی عربی زبان کے استاذ کی حیثیت سے دارالعلوم میں مقیم تھے ان سے اس بارے میں مشورہ ہوا تو انہوں نے ہمت افزائی فرمائی، چنانچہ "الیقظة" نامی پرچہ شائع کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا گیا، مولانا عمید الزمان کیرانوی صاحبؒ کو اس کی ادارت سونپی گئی اور ہم چند احباب بھی لکھنے کی مشق کرتے رہے۔

ابھی شاید دو شمارے شائع ہوئے تھے کہ دارالعلوم کے دروازہ پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی فیضِ عام کالج میرٹھ میں تشریف آوری اور خطاب کا اشتہار نظر سے گذرا ہم نے موقع غنیمت سمجھا اور مولانا عمید الزمان کیرانوی صاحب کے ہمراہ حضرت رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور "الیقظة" کی اشاعت کی اطلاع اور شائع کردہ پرچے خدمت اقدس میں پیش کئے، حضرت رحمہ اللہ نے بہت ہی ہمت افزائی فرمائی اور عالم عرب کے علمی پرچوں اور عرب ادباء کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا۔

مصری اساتذہ شیخ عبدالمنعمؒ اور شیخ عبدالعالؒ کی دارالعلوم تشریف آوری کے

بعد دارالعلوم میں ادباء مصر کی کتابیں آگئی تھیں، طٰہٰ حسین، مصطفیٰ صادق الرافعی مصطفیٰ منفلوطی، محمود عباس عقاد، احمد امین کی کتابیں نظر آنے لگی تھیں، ان میں سے بعض کے مطالعہ کا موقع ملتا تھا مگر ہم اس کو مکمل طور سے سمجھ نہیں سکتے تھے، حضرت مولانا علی میاں رحمہ اللہ کے سامنے اس کا ذکر کیا تو فرمانے لگے بس مطالعہ کرتے رہو، آہستہ آہستہ ان حضرات کے اسالیب سے واقفیت ہوتی جائیگی اور عبارت سمجھ میں آنے لگے گی، ہماری ہمت افزائی کے لئے یہ بھی فرمایا کہ "ہم کئی سال سے عرب مصنفین کی کتابیں پڑھتے ہیں اور عربی میں لکھتے ہیں پھر بھی بعض الفاظ سمجھ میں نہیں آتے مگر سیاق وسباق سے مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے، اس لئے مایوس ہوکر مطالعہ ترک نہ کریں۔"

الحمدللہ حضرت رحمہ اللہ کے اس مشورہ نے ہم کو بہت نفع پہنچایا، طٰہٰ حسین کی "**علیٰ ھامش السیرة**" اور "الایام" احمد امین کی "**زعماء الاصلاح**" "**الی والدی**"، منفلوطی کی "**عبرات**" و "**نظرات**" السباعی کی "انی راحلة" وغیرہ کتابیں حضرت رحمہ اللہ کے مشورہ کے بعد تلاش کرکے پڑھنا شروع کی۔

شیخ محمود عبدالوہاب طنطاویؒ کی توصیف

ہم شیخ محمود عبدالوہاب طنطاویؒ کی خدمت میں روزانہ حاضر ہوتے تھے، جب بھی شیخ محمودؒ کے سامنے حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کا ذکر کیا گیا شیخ محمودؒ بہت ہی وقیع الفاظ میں مولانا کی عربی زبان کی قدرت ومہارت اور ان کے بلند

عربی اسلوب کی تعریف فرماتے تھے، فرماتے تھے کہ سید ابوالحسن ادباء مصر وشام کے صف اول کے لکھنے والوں کی ہمسری کررہے ہیں اور فرماتے تھے ایک ہندوستانی عالم کی اس طرح کی عربی تحریر سے ہم سب بہت متأثر ہیں، حضرت رحمہ اللہ کا جب کوئی نیا مضمون یا رسالہ شائع ہوتا ہم شیخ کی خدمت میں پیش کرتے اور شیخ اس کو بہت ہی شوق ومحبت سے پڑھتے، حضرت کی شستہ عربی زبان، اخلاص بھری تحریر سے شیخ بہت اثر لیتے تھے۔

شیخ محمود عبدالوہابؒ مولانا رحمہ اللہ کی کتاب "**ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین**" کے بارے میں فرماتے تھے کہ "دور حاضر کے کسی مصنف کو تاریخ کو اس انداز میں پیش کرنے کی توفیق نہیں ملی جس طرح شیخ ابوالحسن نے پیش فرمایا ہے، واقعی یہ ایک انقلابی کتاب ہے جو بہت مؤثر اور جذاب اسلوب میں لکھی گئی ہے۔"

عرب ممالک میں مولاناؒ کی مقبولیت

شیخ محمودؒ کی بات بالکل صحیح تھی، ۱۹۶۸ء میں جب ہم عراق، اردن اور سعودی عرب تبلیغی جماعت کے ہمراہ گئے تو بغداد، فلوجہ، عمان وغیرہ شہروں میں جن اہل علم سے ملاقات کا موقع ملتا فوراً مولانا علی میاںؒ اور ان کی "**ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین**" کا تذکرہ ضرور ہوتا، جس سے اندازہ ہوا کہ مولانا رحمہ اللہ کی اس کتاب نے عرب پڑھے لکھے لوگوں کو بہت متأثر کیا ہے، وہ لوگ ہم سے مولانا کی دوسری کتابوں کے بارے میں سوالات کرتے اور اس کے مطالعہ کی

خواہش کرتے تھے۔

بغداد کے قیام کے زمانہ میں ہمیں وہاں کے اکابر علماء کی ہفتہ واری مجلس میں شرکت کا موقع ملا تھا، جو "**رابطة علماء بغداد**" کے نام سے معروف تھی، وہاں بھی سب سے پہلا سوال حضرت مولانا علی میاں رحمہ اللہ کی صحت وعافیت اور ان کی جدید کتابوں کے بارے میں ہوا، اس وقت ہمیں اندازہ ہوا کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ کی مقبولیت اور ان کی علمی کاوشوں کی دھاک ہندوستان کے باہر بہت زیادہ ہے، ہندوستان کے بہت سے علاقے ابھی تک حضرتؒ کی خدمات سے اتنے واقف نہیں ہیں جتنا یہ عرب لوگ ہیں:

ذلک فضل اللہ یؤتیه من یشاء

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں رحمہ اللہ کی خدمات کے متعدد میدان رہے ہیں؛ تدریس، تالیف، دعوت وتبلیغ، اصلاح معاشرہ، اصلاح ادب وثقافت، تربیت اساتذہ، قیام مکاتیب، عالم اسلام میں نوجوانوں کی صحیح رہنمائی، مسلم پرسنل لاء بورڈ کی صدارت اور امت کے مسائل پر صاف صاف رائے کا اظہار، باطل افکار ونظریات پر متوازن اور علمی انداز میں تنقید، عالم عربی کے مسائل پر بے لاگ تبصرہ وغیرہ کتنے میدان ہیں جن میں آپ نے زندگی بھر کام کیا، زندگی کے آخری دور میں ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت اور مذہبی جنون وتشدد کی روک تھام کے لئے "پیام انسانیت" کے نام سے تحریک چلا کر انسانیت کے ضمیر کو بیدار کرنے کی سعی کی۔ پھر حضرتؒ کی خدمات کا یہ دائرہ ہندوستان تک موقوف نہیں تھا، بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش، برما، افغانستان اور یورپ کے ممالک میں بھی پھیلا ہوا تھا۔

پچھلے رمضان المبارک سے قبل ناچیز اندلس کے سفر پر تھا، وہاں مراکش کے عالم کی ایک کتاب نظر سے گذری ''الاسلام فی اسبانیا'' انہوں نے اندلس میں اسلامی بیداری اور مساجد اور دعوتی مراکز کا تذکرہ کیا ہے، قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ وغیرہ شہروں میں اسلامی انجمنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اندلس میں اس دینی بیداری میں ہندوستان کے عالم سید ابوالحسن علی ندویؒ کا بڑا حصہ ہے کہ انہوں نے اپنے سفر اندلس کے وقت مسلم نوجوانوں کو اجتماعی طور پر مراکز قائم کرنے، نماز باجماعت کا اہتمام کرنے اور دینی دعوت میں وقت لگانے کی دعوت دی، اور الحمدللہ اس کا اچھا نتیجہ ظاہر ہوا۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ کی بعض تقاریر سننے کے بعد ایسا صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو بھرپور ایمانی فراست سے مالا مال فرمایا تھا، برما کے شہر رنگون میں مولانا نے برما کے فوجی انقلاب سے قبل ایک پرسوز تقریر فرما کر وہاں کے مسلمانوں کو جن خطرات کی طرف متوجہ فرمایا تھا چند ہی سالوں میں دنیا نے دیکھا کہ وہ حالات پیدا ہوگئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؒ ان خطرات وحوادث کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ کر بیان فرمارہے ہیں، برما انقلاب کے بعد اکثر لوگوں نے کہا واقعی ؎

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

اس طرح کے کئی واقعات مولانا رحمہ اللہ کی ایمانی بصیرت اور روشن ضمیری پر شاہد ہیں۔

ڈاکٹر فرحان نظامی اور مولاناؒ

برطانیہ کے ایک سفر میں ناچیز آکسفورڈ حاضر ہو کر ڈاکٹر فرحان نظامی مدظلہ سے ملا تھا انہوں نے فرمایا کہ حضرت مولانا کے ہمراہ برطانیہ کے کئی مقامات پر جانے اور مولانا کے بیانات سننے کا موقع ملا، حضرت مولانا اگر عام مسلمانوں اور دعوتی مراکز میں تقریر فرماتے تو ان کو جمود چھوڑنے اور دین میں جو سہولتیں دی گئی ہیں ان سے فائدہ اٹھانے اور توحید کی حفاظت پر زور دیتے تھے، اور جب تعلیم یافتہ لوگوں میں بات کرتے تو ان کو دین میں تصلب اختیار کرنے کی تلقین فرماتے، ڈاکٹر فرحان حضرت کے دونوں حلقوں میں جس انداز سے گفتگو فرماتے اور جو انداز اختیار فرماتے اس کا خاص تذکرہ فرماتے تھے۔

اہل مدارس کیلئے مفید مشورے

حضرت مولانا رحمہ اللہ اپنے تعلیمی اور دعوتی طویل تجربوں کے سبب مختلف مواقع پر بہت ہی اختصار اور جامعیت کے ساتھ اہم مشورے پیش فرماتے تھے، مثلاً ''دارالعلوم فلاح دارین'' تشریف آوری کے موقع پر اساتذہ کے انتخاب کے بارے میں فرمایا کہ اساتذہ کے انتخاب میں دو چیزیں پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ان میں ''اخلاص'' ہو اور ''اختصاص'' ہو، اگر ان دونوں وصفوں میں سے کسی ایک میں کمی ہوگی تو ادارہ کو فائدہ نہیں ہوگا، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک مفوضہ مضمون پڑھانے کی صحیح صلاحیت نہ ہو مدرس کی صرف دینداری اور سادگی

کام نہیں آسکتی، اور اگر علم میں کامل ہو، اختصاص حاصل ہو مگر اخلاص اور دلسوزی نہ ہو تب بھی طالب علموں کو نفع نہیں ہوسکتا، ماشاء اللہ! حضرت نے دو لفظوں میں ایک عمدہ معیار و مقیاس عطا فرمادیا، اس کی تائید میں سورۂ یوسف کی ﴿ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ﴾ سے بھی استدلال فرماتے تھے۔

طلباء کو قیمتی نصیحت

مدارس عربیہ کے طلباء کو حضرت رحمہ اللہ ہمیشہ فرماتے تھے کہ کسی کتاب کا سرسری مطالعہ کافی نہیں ہوتا بلکہ اس طرح مطالعہ کریں گویا پوری کتاب کو آپ نے چاٹ لیا ہے، اور فرماتے تھے کہ ہم نے احمد امین کی "**فجر الاسلام، ضحی الاسلام** اور **ظهر الاسلام**" کو اتنا پڑھا ہے کہ اس کے صفحات ازبر ہوگئے، اس دور میں جو سرسری مطالعہ کی عادت ہوگئی ہے اس سے مطالعہ کرنے والوں کو کماحقہ نفع نہیں پہنچتا۔

بلند علمی مقام کیساتھ انتہائی سادگی

حضرت رحمہ اللہ اپنے علمی اور عملی بلند مقام کے باوجود نہایت درجہ سادہ مزاج، خوش اخلاق، اور زہد و قناعت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، آپ کے سوانح نگاروں نے حضرت کی دنیا سے بے رغبتی کے کئی حیرت انگیز واقعات ذکر فرمائے ہیں۔

دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر آپ جب شام کے سفر پر تشریف لے گئے تو

وہاں کے علماء آپ کی سادگی اور اونچے درجہ کے ہوٹل میں قیام کے بجائے مسجد کے کمرے میں قیام کرنے پر انگشت بدنداں تھے، رابطۂ عالم اسلامی اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجالس میں حاضری کے وقت بھی حضرت رحمہ اللہ پنج تارہ ہوٹلوں کے بجائے مدرسہ صولتیہ یا کسی اور عزیز کے معمولی کمرہ میں قیام کو پسند فرماتے تھے۔

ایک عرب عالم کی قیمتی بات

ایک عرب عالم نے مولانا رحمہ اللہ کے اس عمل کے بارے میں بہت اچھی بات لکھی ہے کہ:

" ان الدعوة الى الله تعالىٰ تفتقر الى اعدادٍ روحيٍ و خلوة مع الله تعالىٰ حتى يكون الكلام منبعثاً من الروح و القلب ، ليحل في الروح والقلب و هذا ما حدث وشعر به كل من استمع الى محاضراته التي ألقاها "

دعوت الی اللہ روح کی پاکی اور خلوت مع اللہ کی محتاج ہے تاکہ داعی کی زبان سے جو بات نکلے وہ قلب و روح کی گہرائی سے نکلے اور سامع کے قلب و روح میں پیوست ہوجائے، ہر وہ شخص جس نے سید ابوالحسن کے محاضرات کو سنا ہے اس نے اس کو ضرور محسوس کیا۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے اساتذہ اور طلباء کے سامنے حضرتؒ نے ایک پرسوز تقریر فرمائی تو دیکھنے والوں نے بتایا کہ کوئی آنکھ نہیں ہوگی جو اشکبار نہ ہوئی ہو۔

ے جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

بس.......

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللھم أمطر علیه شآبیب رحمتک ورضوانک و أدخله فی جنتک جنة الخلد وارفع درجته فی أعلی العلیین برحمتک و فضلک یا أرحم الراحمین .

والسلام

احقر عبداللہ غفرلہ کاپودروی

صفرالمظفر ۱۴۲۵ھ یکم اپریل ۲۰۰۴ء

تعارف

از: حضرت مولانا قاری محمد احسن صاحب زید مجدہٗ

بانی وناظم مدرسہ تجوید الفرقان، ضلع فتح پور

حامداً و مصلیاً و مسلماً

مفکر اسلام حضرت سید ندوی رحمۃ اللہ علیہ دور حاضر کی ایسی شخصیت تھے کہ جس کے متعلق ناچیز کے خیالات یہ ہیں کہ بس خالق کائنات کی حکمت بالغہ ہی تھی جس نے اس عظیم شخصیت کے لئے دنیا کے اس دور پرفتن کا انتخاب کر کے ان کو وجود بخشا۔ ماضی میں تو بہت سی عظیم شخصیتوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو سرفراز کیا جن کا نام سنکر ہم پر یہ تاثر ہوا کرتا تھا کہ یہ پہلے زمانہ کی باتیں ہیں اب اس کائنات کے دور آخر میں ایسے اصحاب کمال اور بلند ترین انسانوں کے لائق یہ دنیا کہاں رہی۔ لیکن شیخ ندوی علیہ الرحمۃ جیسی صاحب کمال عالمی شخصیت نے اس تاثر کو یکسر ختم کر دیا اور یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے عظیم شخصیتوں سے ابھی اس عالم کی محرومی کا فیصلہ نہیں کیا۔ مفکر اسلام شیخ ندوی علیہ الرحمۃ کو اس ناچیز نے قریب سے دیکھا، پڑھا اور سنا۔ امت محمدیہ علیہا الصلوٰۃ والتحیہ کے لئے ان کی گونا گوں عالمی پیمانے کی خدمات، عرب وعجم سے داد تحسین حاصل کی ہوئیں ان کی شاہکار

تصانیف ، ان کی مفکرانہ پُر سوز تقریریں ، مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے عظیم ادارہ کی صدارت، داعیانہ اسفار اور ندوۃ العلماء جیسے عالمی شہرت یافتہ ادارہ کی نظامت وغیرہ جیسی بے شمار وقیع خدمات سے ان کی حیات عبارت ہے۔ان کی مذکورہ ذمہ داریوں کی پُر بہار ومبارک زندگی پر اب تک لکھنے والوں نے خوب لکھا اور لکھتے رہیں گے زیر مطالعہ یہ مجموعہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کے سلسلہ میں بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک عظیم شخصیت کی سوانح حیات پر ایک عظیم شخصیت نے قلم اٹھایا ہے۔ یہ ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ درِدل کو سمجھنے کے لئے صاحبِ دل ہونا ضروری ہے۔ ایک عظیم شخصیت کے کارناموں کے کماحقہٗ سمجھنے کا حق ادا کرنے کے لئے صاحب قلم کا نکتہ فہم ،نکتہ سنج ،نکتہ رس ،لطیف ذوق ، وسیع مطالعہ، قوتِ فیصلہ کے صحیح وجدان وغیرہ جیسی صلاحتیں درکار ہوتی ہیں،سوانح نگار مرشد کامل، شیخ وقت حضرت مولانا شاہ محمد قمر الزمان صاحب زیدت معالیہ کو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ تمام صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں صاحب سوانح حضرت مفکر اسلام شیخ ندوی کے وہ خطوط جو سوانح نگار جل مجدہٗ کے نام لکھے گئے ہیں اور وہ شامل کتاب ہیں اس کے لئے شاہد عدل ہیں ۔نصف صدی سے زائد کی خدمات جلیلہ کے پھیلے حقائق ہزاروں صفحات پر مشتمل ہیں ان حقائق میں سے اپنی کتاب کے صفحات کی گنجائش کے مطابق بعض کا انتخاب اہم مسئلہ تھا حضرت زید مجدہٗ کے حسن انتخاب نے اس میں کتنی کامیابی حاصل کی ہے اس کیلئے کتاب کے صفحات کی شہادت کافی ہے۔ وہ اقوال زرّیں جن کے امین حضرت سوانح نگار دامت برکاتہم کی ذات والا صفات ہی تھی اس امانت کو مکمل دیانت کے ساتھ اس کتاب کے صفحات کے ذریعہ امت

مسلمہ کے حوالہ کر کے حضرت اقدس نے ایک عظیم خدمت انجام دی اور گراں قدر سرمایہ سے ملت کو نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ پوری امت کی طرف سے ان کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائے ۔حضرت مولانا شاہ محمد قمر الزمان صاحب کی پہلی تقریر تعزیت بھی شامل کتاب ہے جس کو پڑھ کر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انداز خطابت کی یاد تازہ ہوگئی۔ بات سے بات نکالتے ہوئے معلومات کا ایک بیش بہا ذخیرہ اور پند ونصیحت کی گراں قدر دولت سے مخاطبین کو نوازا اور اس کتاب میں اس کو شامل کر کے ہم سب کو بھی محروم نہیں ہونے دیا۔اس عظیم سانحہ پر درد دردوں اور سوز دل کو جس والہانہ انداز میں پیش فرمایا ہے یہ حضرت ہی کا حصہ تھا۔

پوری کتاب پر اپنے تاثرات کے اظہار کے لئے لکھنے کی جو آزادی درکار تھی اس سے یہ ناکارہ محروم ہے انتہائی مختصر لکھنے کی ہدایت کے پیش نظر انھیں چند کلمات پر اکتفاء کررہا ہوں۔

ناکارہ

محمد احسن قاسمی

مدرسہ تجوید الفرقان،

سول لائن، ضلع فتح پور

۲۳ر محرم الحرام ۱۴۲۵ھ

تأثرات

مولانا محمد ایوب صاحب سورتی ابن مکرم قاری بندۂ الٰہی صاحب زید مجدہم

خلیفہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم

حامداً و مصلیاً و مسلماً اما بعد !

مفکر اسلام قائد ملت داعی الیٰ دین اللہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمہ اللہ امت اسلامیہ کیلئے اللہ تعالیٰ کا وہ عظیم عطیہ وبخشش تھے جو بہت کم کبھی کبھی ملا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو زبان وقلم پر یکساں قدرت عطا فرمائی تھی جس کو ساری زندگی بلاخوف لومۃ لائم اسلام کے دفاع اور ملت اسلامیہ کی صحیح رہبری ورہنمائی میں استعمال کرتے رہے، اور ہندوستان کے کسی فرد کیلئے یہ انتہائی فخر وشرف کی بات ہے کہ اردو کی بہ نسبت عربی زبان میں لکھنے پڑھنے کی غیر معمولی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی۔ یقیناً انہوں نے اپنی زندگی کے تقریباً ستر سال تدریس وتصنیف، دعوت وتبلیغ، تزکیہ وارشاد، وعظ وخطاب کے ہر میدان میں بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔

آپ کی سب سے پہلی تصنیف جو نوعمری میں ہی تحریر فرمائی ہے وہ سیرت سید احمد شہیدؒ ہے جو دو جلدوں میں ہے، اور اسی کتاب نے اس وقت کے اکابر کی نظروں میں آپ کے علو مرتبت کی پیشین گوئی کی ہے، حضرت مولاناؒ کو اللہ تعالیٰ

نے وہ کمالات وحسنات عطا فرمائے ہیں جو بہت کم کسی میں جمع ہوتے ہیں، سچ کہا کسی نے ؎

ولیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

وہ جہاں نسباً حسنی حسینی ہیں وہیں حسباً وعلماً وعملاً رشک خلائق ہیں، وہ موہوب فی اللہ، اخلاق وشمائل کی بنا پر تمام افراد میں مقبول ومحبوب تھے، احقر کے نزدیک ان میں توازن واعتدال اور جامعیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اور ان کی باتیں حکمت وموعظت حسنہ کا مجموعہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں میں گئے مگر دین کی بات پوری حکمت کے ساتھ بغیر کسی مداہنت کے پیش فرمادی۔

راقم الحروف کو برطانیہ قیام کے دوران حضرت کے متعدد بیانات ومجالس میں شرکت کا موقع ملا اور ایک مرتبہ احقر کی دعوت پر احقر کے قائم کردہ ادارہ مجلس دعوۃ الحق لیسٹر میں بھی تشریف لائے، نماز عصر ادا فرمائی، بعدہ مختصر سی مجلس رہی جس میں قرب وجوار کے احباب جمع ہوگئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ احقر الہ آباد ماہ مبارک میں حضرت اقدس شاہ محمد احمد صاحب پرتاپگڈھیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، قیام مدرسہ بیت المعارف میں حضرت اقدس مولانا محمد قمر الزمان صاحب مدظلہ العالی کے پاس تھا، واپسی ہردوئی کیلئے تھی تو حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب نے فرمایا کہ مجھے رائے بریلی ایک روز کیلئے جانا ہے، احقر حضرت کے ساتھ ہولیا، اس طرح پہلی مرتبہ حضرت مولانا مدظلہ کے ہمراہ حضرت مولاناؒ کی خدمت میں اور آپ کی خانقاہ تکیہ میں یک روزہ حاضری ہوگئی اور حضرت مولاناؒ کے مہمان ہوئے اور حضرت کی

روحانیت سے مستفید ہونے کا موقع مل گیا۔

راقم الحروف کے نزدیک حضرت مولاناؒ کی جامعیت کا بہترین نمونہ آپ کی وہ کتابیں اور رسائل ہیں جو ساری زندگی کی محنت کا نچوڑ ہے، ان کتابوں کی فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً بہت سے اہم اہم موضوعات پر آپ کا لازوال شاہکار ہے، گو آپ کی تصنیف وتالیف کا زیادہ تر موضوع تاریخ وسیرت رہا مگر دیگر موضوعات بھی تشنہ نہیں رہے۔

بہرحال اس مرد خدا نے قلم اور زبان سے ملت اسلامیہ کی وہ خدمتیں کی ہیں جن کو بھلایا نہیں جاسکتا، جو شخص بھی مولاناؒ کی اردو یا عربی تصنیف وتقریر دیکھے گا یا سنے گا اس میں دینی حمیت اور اسلامی عزت بیدار ہوجائیگی، حضرت مولانا علیہ الرحمۃ پر بہت کچھ لکھا گیا اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا، ہر ایک اپنے اپنے تعلق خاطر کا اظہار کریگا، اور یہ قبول عامہ کی علامت اور ''**یوضع لہ القبول فی الارض**'' کا مصداق ہے، اور یہ کیوں نہ ہو؟ حضرت مولاناؒ نے بھی مصلحین و مشائخ علماء واکابر کے بیشمار تذکرے اور حالات لکھے ہیں، اللہ تعالیٰ کا قانون ہے ﴿**ھل جزاء الاحسان الا الاحسان**﴾ اصل بدلہ تو آخرت میں ملے گا مگر دنیا میں اس کا بدلہ ثنائے حسن اور ثناء الخلق سے ملنا مستبعد نہیں، ﴿**ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ**﴾ کی ایک تفسیر علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے ثناء الخلق سے کی، اللہ تعالیٰ حضرت مولاناؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور امت مسلمہ کی طرف سے بہترین بدلہ عطا فرمائے، اور حضرتؒ کے سچے وارث اور جانشین پیدا فرمائے۔

اس وقت ہمارے محترم بزرگ حضرت اقدس مولانا محمد قمر الزمان صاحب مدظلہ العالی کی کتاب ''نقوش وآثار مفکر اسلامؒ'' تیار ہورہی ہے اور ان کے مسترشد خاص مولانا فضل محمود صاحب پروف ریڈنگ کررہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے سورت سے الٰہ آباد تک کے سفر میں ان کی معیت نصیب فرمادی، ماحول کا اثر ہوتا ہی ہے، ان نقوش وآثار کی برکت سے چند کلمات کے تحریر کی سعادت نصیب ہوگئی۔

حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب مدظلہ العالی ان موفق من اللہ حضرات میں ہیں جو تزکیہ واحسان اور تصنیف وتالیف کی لائن سے بیشمار خلق خدا کو روحانی عرفانی فیض پہنچارہے ہیں، ان کی یہ کتاب بھی اس سلسلہ کی عظیم کڑی ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کے فیض کو عالم گیر فرمادے اور دیگر کتابوں کی طرح اس کتاب کو بھی قبول حسن سے نوازے۔ آمین

والسلام

بندہ محمد ایوب سورتی

۲۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۵ھ

۱۵/ اگست ۲۰۰۴ء

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اقتباسات

از

سوانح مفکر اسلامؒ

مؤلفہ

مولانا سید بلال عبدالحی حسنی صاحب

مفکر اسلام کے خاندان وولادت وتعلیم وتعلم اور درس وتدریس کے حالات

خاندان عالی شان:

آپ کا سلسلۂ نسب سادات سے حسنی حسینی ہے، آپ کے والد محترم کا اسم گرامی حکیم سید عبدالحی حسنی تھا (المتوفی ۱۵ر جمادی الاخریٰ ۱۳۴۱ھ ۲ر فروری ۱۹۲۳ء) آپ ہندوستان کے مایہ ناز مؤرخ، صاحب ذوق محدث اور صاحب دل عالم تھے، ۱۸ر رمضان المبارک ۱۲۸۶ھ میں دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں ولادت ہوئی، نانی صاحبہ جو حضرت سید احمد شہید سے بیعت تھیں، اور بڑی عابدہ زاہدہ خاتون تھیں، بچپن کا کچھ حصہ ان کی آغوش تربیت میں گذرا۔

حضرت والا کی والدہ ماجدہ مخدومہ سیدہ خیر النساء بہترؔ صاحبہ (المتوفیہ ۶ر جمادی الاخریٰ ۱۳۸۸ھ ۳۱ر اگست ۱۹۶۸ء) اپنے زمانہ کی ممتاز ترین خواتین میں سے تھیں زہد وعبادت، ورع وتقویٰ اور دعا ومناجات کا خاص ذوق رکھتی تھیں۔

ولادت باسعادت

آپ کی ولادت ۶ر محرم الحرام ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۳ء کو رائے بریلی

کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوئی (جو دائرہ شاہ علم اللہ کے نام سے موسوم اور تکیہ
کلاں کے نام سے مشہور ہے جس کو کوئی سو سال سے توحید وسنت اور تحریکِ جہاد کے مرکز
ہونے کا شرف حاصل رہا ہے) ساتویں دن عقیقہ کی سنت ادا کی گئی اور حضرت علی رضی
اللہ عنہ کے نام نامی پر ''ابوالحسن علی'' نام تجویز کیا گیا۔

تعلیم کا آغاز:

غالباً چار سال کی عمر میں رائے بریلی کے قیام میں تسمیہ خوانی ہوئی جو حضرت
کے چچا مولانا سید عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے کرائی کیونکہ زیادہ قیام لکھنؤ میں ہی رہتا
تھا اس لئے باقاعدہ تعلیم کا آغاز وہیں سے ہوا، خاندان کے دستور کے مطابق
سات سال کی عمر میں قرآن مجید ختم ہوا، اس کی خوشی میں والد صاحب نے ہلکی سی
دعوت کا اہتمام فرمایا۔

باقاعدہ تعلیم:

اردو کی باقاعدہ تعلیم عم محترم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کے یہاں شروع ہوئی
جو اس وقت دفتر ندوۃ العلماء میں کام کرتے تھے، اس زمانہ میں دار العلوم کا دفتر اور
کتب خانہ گولہ گنج میں خاتون منزل کے قریب ایک عمارت میں واقع تھا، حضرت
کے مکان سے اس کا فاصلہ کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ ہوگا جو اس عمر کے اعتبار سے خاصا
تھا، اردو حروف شناسی تو قاعدہ بغدادی سے شروع ہوئی تھی، اردو بقدر ضرورت
پڑھ لینے کے بعد خاندانی دستور کے مطابق فارسی شروع ہوئی، سب سے پہلے
انجمن حمایت الاسلام کی فارسی کی پہلی کتاب دی گئی اور تعلیم دینے کے لئے ایک کہنہ

مشق استاذ مولوی محمود علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتخاب ہوا جن کے بارے میں
حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ ''وہ بڑے مہذب، شفیق اور دیرینہ سال معلم تھے'' فارسی
کے ساتھ اسی زمانہ میں والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی تصنیف کی ہوئی
کتابیں ''تعلیم الاسلام'' اور ''نور الایمان'' پڑھی، خوش خطی کی مشق بھی اسی زمانہ
میں کی جو تعلیم کا ایک اہم جزء اور ضروری نصاب تھا۔

کتابی شوق اور خاندانی ذوق:

اس عمر میں جو عام طور سے کھیل کود کی ہوتی ہے اور جس میں کتاب سے ایک
توحش سا ہوتا ہے، حضرت کو کتابوں سے بڑا شغف تھا بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ وہی
حضرت کا کھیل اور دلچسپی کا سامان تھا، اس میں گھر کے ماحول کو بھی بڑا دخل تھا۔

والد صاحب کی وفات اور برادر معظم کی آغوش تربیت میں:

۱۵/جمادی الاخریٰ ۱۳۴۱ھ جمعہ کے دن والد ماجد نے معمولی علالت کے
بعد رحلت فرمائی، اخیر وقت میں خدمت کی سعادت بھی حضرت کے حصہ میں آئی،
تحریر فرماتے ہیں کہ ''میری خوش قسمتی کہ میں نے بغیر کسی ہدایت یا ان کے
اشارے کے پیر دابنے شروع کئے'' اس میں بھی شاید کوئی حکمت تھی کہ والد
صاحب نے وفات سے کچھ پہلے سنترے منگوائے اور فرمایا کہ علی کو دے دو، وفات
کے وقت فرزندِ اکبر مولانا سید عبدالعلی صاحب ایک ہزار میل دور مدراس میں تھے،
انہوں نے یہ خبر بمبئی میں سنی، جب لکھنؤ واپس ہوئے اور رائے بریلی پہنچے تو
سیدھے قبر پر گئے، حضرت فرماتے ہیں کہ میں بھی ساتھ ہولیا، قبر پر پہنچ کر پیمانۂ صبر

لبریز ہوگیا، بس اسی دن سے غیر معمولی تبدیلی ان کے اندر پیدا ہوگئی۔

تکیہ کا عبوری قیام اور والدہ صاحبہ کی تربیت:

والد صاحب کی وفات کے بعد لکھنؤ قیام کا مسئلہ ہی نہ تھا، برادر اکبر ڈاکٹر عبدالعلی صاحب زیر تعلیم تھے، گھر میں کوئی جائداد یا دوسرا ذریعۂ آمدنی نہ تھا، اس لئے عبوری طور پر تقریباً ڈیڑھ سال رائے بریلی ہی میں قیام رہا، فارسی کی ابتدا لکھنؤ میں مولوی محمود صاحب کے پاس ہوگئی تھی، ڈاکٹر صاحب کی ہدایت سے اس کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہا، سید محمد اسماعیل صاحبؒ جو حضرت سید صاحبؒ کے نواسہ کے فرزند تھے، ان کو فارسی کا اچھا ملکہ تھا، ان سے اسی زمانہ میں بوستاں پڑھنی شروع کی، حساب سکھانے اور اردو عبارت نویسی کی مشق کے لئے ماسٹر محمد زماں صاحب کو متعین کیا گیا جو قریبی گاؤں لوہانی پور سے آتے تھے، حضرت کے چھوٹے ماموں مولوی حافظ عبیداللہ صاحب کو بڑی شفقت و محبت تھی، وہ بھی تعلیم کی فکر رکھتے تھے، لیکن اس زمانہ میں اصل تربیت والدہ صاحبہ نے فرمائی۔

عربی تعلیم کی ابتداء:

ہندوستان میں عربی زبان کی تعلیم کا صرف یہی مقصد گردانا جاتا تھا کہ اس سے حدیث وفقہ اور علم کلام کی ضروری کتابیں سمجھ لی جائیں، اس کو گہرائی کے ساتھ پڑھنے اور مہارت پیدا کرنے کا اس وقت کوئی تصور نہیں تھا، اس کی جگہ فارسی ہی پر ساری محنتیں صرف کی جاتی تھیں، اور عمومی طور پر شریف گھرانوں میں اس پر سارا زور دیا جاتا تھا، حضرت کے خاندان میں بھی فارسی کا بڑا رواج تھا، جد امجد مولانا

حکیم سید فخر الدین خیالیؒ فارسی کے ادیب وشاعر تھے، والد صاحب کو بھی اس کا اچھا ذوق تھا، برادر اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب خود بھی فارسی میں مہارت رکھتے تھے اور بے تکلف گفتگو کر لیتے تھے، لیکن ان کی دوررس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اب ہندوستان میں فارسی کا ورق الٹ رہا ہے اور قریبی زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ اس کی اہمیت بالکل ختم ہوجائے گی اور صرف اسی حد تک اس کی افادیت محدود ہوکر رہ جائے گی کہ بزرگوں کے ملفوظات و مکاتیب یا شعراء کے دواوین سے استفادہ ممکن ہوسکے، حضرتؒ کی فارسی تعلیم اس حد کو پہنچ رہی تھی، اس لئے ڈاکٹر صاحبؒ نے فارسی کو وہیں روک دیا، اور ایک طرف انگریزی کی ایک ریڈر شروع کرائی اور دوسری طرف انہوں نے عربی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ کی اور ایسا حکیمانہ انتظام کیا جس کو توفیق الٰہی کے سوا اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، قرین قیاس تھا کہ وہ حضرتؒ کو دارالعلوم میں داخل کر دیتے جس کے وہ خود اہم ذمہ داروں میں سے تھے اور بعد میں اس کے ناظم بنائے گئے، لیکن یہ خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے ایک غیبی انتظام تھا اور حضرت کو عالمی سطح پر جو اصلاحی وتجدیدی خدمت انجام دینی تھی اور جس طرح سے عربوں کو خطاب کرکے ان کو ان کے فرائض یاد دلانے تھے اس کی قدرت کی طرف سے ایک غیبی صورت تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے حضرت کو شیخ خلیل بن محمد عرب یمانیؒ کے سپرد کیا جو اس وقت عربی کے ایک کامیاب ترین استاذ اور بقول حضرتؒ اس کا ذوق ہی نہیں بلکہ ذائقہ رکھتے تھے، ڈاکٹر صاحبؒ سے ان کے دوستانہ تعلقات اور بے تکلفی تھی اور اسی محلّہ میں ان کی بھی سکونت تھی جس میں ایک طویل عرصہ مولانا عبدالحی صاحبؒ نے گذارا

تھا، پھر جلد ہی ڈاکٹر صاحب بھی اسی محلّہ میں منتقل ہوگئے، عرب صاحبؒ کے درس میں حضرتؒ کے شریک صرف ان کے حقیقی بھائی شیخ حسین عربؒ تھے اس لئے عرب صاحبؒ کی توجہ اور قدرت تدریس کا بڑا حصہ حضرتؒ کو ملا جو عام طور پر بڑی جماعت کے طلبہ کو میسر نہیں آتا، پھر حضرتؒ کے ذوق وشوق کو دیکھ کر عرب صاحب نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا، حضرتؒ کی عربی تعلیم پر خاندان کے بعض بزرگوں نے ڈاکٹر صاحبؒ پر نکتہ چینی بھی کی اور یہ مطالبہ کیا کہ ان کو آئی سی ایس (I.C.S.) کے لئے تیار کرنا چاہئے اور عصری تعلیم دینی چاہئے، ڈاکٹر صاحبؒ نے جو بڑے کم گو اور متین واقع ہوئے تھے برجستہ کہا کہ ہم علی کو وہی تعلیم دے رہے ہیں جو میاں (ڈاکٹر صاحبؒ اپنے والد محترم کو میاں کہتے تھے) ان کو دیتے، یہ ایسا دوٹوک جواب تھا کہ لوگوں کی زبانیں بند ہوگئیں، پھر زمانہ نے دیکھ لیا کہ یہ فیصلہ کیسا حکیمانہ اور دوراندیشی پر مبنی ثابت ہوا، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعد میں جب حضرتؒ نے لاہور کا پہلا سفر کیا پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحبؒ نے ایک دن اورنٹیل کالج کے پرنسپل مولوی محمد شفیع صاحبؒ سے ملوایا اور ان سے رائے طلب کی کہ یہ بچہ کون سی لائن اختیار کرے، تو انہوں نے اس وقت کے بعض مضامین اور تحریریں دیکھنے کے بعد کہا کہ یہ عربی کو ہی اپنا مضمون بنائیں، اسی میں ترقی کریں اور کمال پیدا کریں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلق

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے حضرت کا تعلق خاندانی اور موروثی تھا، والد ماجد

اور برادر معظم اسی طرز فکر کے حامل بلکہ داعی تھے، حضرتؒ کی نشو ونما بھی اسی فکر میں ہوئی تھی لیکن باقاعدہ اور براہ راست استفادہ کی نوبت اس وقت آئی جب حضرتؒ نے دارالعلوم کے قدیم ومقبول استاذ مولانا شبلی صاحب جیراجپوریؒ سے فقہ پڑھنی شروع کی، یہ غالباً ۱۹۲۸ء کے اواخر کی بات ہے، مولانا شبلیؒ حضرتؒ پر بڑے شفیق تھے اور ان کا حضرتؒ کے خاندان سے قدیم تعلق تھا، اس کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے دوران درس حضرتؒ سے فرمایا کہ ہمارے علاقہ میں شرک وبدعت نام کی کوئی چیز نہیں ہے، پھر فرمایا جانتے ہو کیوں؟ حضرتؒ نے عرض کیا آپ ہی فرمائیں، تو فرمانے لگے یہ تمہارے بزرگوں حضرت خواجہ احمد صاحبؒ اور مولانا محمد امین صاحبؒ کا فیض ہے۔

حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب دین پوریؒ سے بیعت

حضرتؒ خود فرماتے ہیں کہ :

''۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء کے جون کی کوئی تاریخ تھی کہ میں کراچی میل سے خانپور کے لئے روانہ ہوا، ایک رفیق درس اور دوست مولوی محمد موسیٰ سندھی رفیق سفر تھے، جو خود بڑے صاحب صلاح اور قوی الاستعداد نوجوان تھے، مغرب کو ہم لوگ خانپور پہنچے، وہاں سے دین پور کی طرف روانہ ہوئے، غالباً رات ہی کو حضرت کی زیارت ہوگئی، ایسا منور چہرہ غالباً اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا، نہایت کم گو اور کم سخن بزرگ تھے، گفتگو بھی فرماتے تو ٹھیٹھ ریاستی زبان میں جو ملتانی وسندھی کا مجموعہ ہے اور جس سے میں بالکل ناآشنا تھا، دین پور کی دنیا ہی نرالی تھی، وہ صحیح معنی میں

دین پور تھا، قادری طریقہ پر ذکر جہر سے مسجد وخانقاہ اور بستی ہر وقت گونجتی رہتی تھی، اگر کوئی کسی کو آواز بھی دیتا تو پکارنے والا بھی اِلا اللہ کہتا اور جواب دینے والا بھی اِلا اللہ سے اس کا جواب دیتا، اس طرح اذان، ذکر جہر اور صدائے اِلا اللہ کے سوا کوئی اور بلند آواز سننے میں نہ آئی، یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں حضرتؒ کے متعلقین آباد تھے، نیم پختہ چند مکانات، جن کی تعداد پانچ سات سے زیادہ نہ ہوگی ایک سادہ سی مسجد، چند خام حجرے ذاکرین کے لئے، کچھ کھجوروں کے درخت جن کو دیکھ کر عرب کے بادیہ کی بستیاں یاد آتی تھیں، آب وہوا بھی بادیہ عرب سے ملتی جلتی تھی، مقیمین خانقاہ کے لئے ایک لنگر تھا، جس میں خالص سندھی اور بہاولپوری مذاق کا ایسا کھانا ہوتا تھا جو قوت لایموت کا صحیح مصداق تھا، اور ہم اودھ کے نازک مزاج مہمانوں کے لئے اس کا کھانا بڑا مجاہدہ اور امتحان تھا، گرمی شدت کی تھی، دن بھر لو چلتی، رات کسی قدر ٹھنڈی ہوتی۔

یہ تھا دین پور کا نقشہ جہاں عمر بھر میں صرف دو مرتبہ جانا ہوا، ایک اسی ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں، دوسرے ۱۹۵۸ء یا اس کے بعد خلیفہ صاحبؒ کی وفات کے عرصہ کے بعد ایک شب کے لئے جانا ہوا، حضرت خلیفہ صاحب کی عمر اس وقت بھی نوے سے متجاوز تھی، مولانا احمد علی صاحب کا خط آپ کو سنایا گیا جس میں غالباً حضرت سید صاحبؒ کی نسبت سے میرا تعارف تھا، حضرتؒ نے سلسلہ میں داخل فرمالیا اور ذکر قلبی کی تلقین کی۔''

حضرتؒ نے یہ واقعہ بھی بارہا سنایا کہ بیعت کے بعد مجھے کچھ خدمت کا شوق ہوا اس وقت چھت کے ان پنکھوں کا رواج تھا جو ہاتھ سے کھینچے جاتے تھے، میں

نے وہ کھینچنا شروع کیا، تھوڑی دیر میں احساس ہوا کہ یہ میرے بس سے باہر ہے مگر چونکہ اپنے شوق سے لیا تھا اس لئے نہ ہی وہ چھوڑتے بنتا اور نہ کھینچتے بنتا، حضرت خلیفہ صاحبؒ کو بطریق کشف احساس ہوگیا، انہوں نے میری طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ پانی پلادو، میں پانی لے کر حاضر ہوا، حضرت خلیفہ صاحبؒ نے کچھ پانی پیا بقیہ مجھے دے کر فرمایا کہ تم پی لو، تین چار دن دین پور ٹھہر کر لکھنؤ تشریف لے آئے، اس کے بعد حضرت خلیفہ صاحبؒ کا وصال ہوگیا اور حضرتؒ مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کو ہی اپنا شیخ ومربی سمجھتے رہے، اور ان سے مراسلت کا سلسلہ بھی جاری رہا اور تعلق بھی بڑھتا گیا۔

دیوبند کا قیام:

۱۹۳۲ء کے کسی قیام میں ایک دن ڈاکٹر صاحبؒ نے حضرت کو بطور خاص حضرت مدنی کو پیش کیا، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ عرصہ کیلئے دیوبند قیام کا مشورہ دیا، اس کی تعمیل میں ربیع الاول یا ربیع الثانی کی کسی تاریخ کو حضرتؒ دیوبند تشریف لے گئے، حضرت مدنیؒ نے اپنا مہمان بنایا، حضرتؒ نے درس میں بھی شرکت فرمائی اور اس کے علاوہ بھی حضرت مدنی سے استفادہ کا سلسلہ جاری رہا، خاص طور سے قرآن مجید کی بعض مشکل آیات کو سمجھنے کے لئے حضرتؒ نے مولانا مدنیؒ سے خصوصی وقت چاہا، مولانا نے جمعہ کا وقت دیا، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مولانا کے تدبر قرآن کا اندازہ ہوا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کو جب حضرتؒ کے باقاعدہ قیام کا علم ہوا تو انہوں نے حضرتؒ

سے دارالاقامہ میں رہنے اور مطبخ سے کھانا جاری کرالینے کی ہدایت کی، حضرتؒ
نے اجازت چاہی تو حضرت مدنیؒ نے کسی قدر ناگواری اور مجبوری کے ساتھ
اجازت دی، لیکن فرمایا ناشتہ ساتھ ہوا کریگا۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے فرزند مولانا حبیب اللہ صاحبؒ بھی اس
زمانہ میں دیوبند میں طالب علم تھے، مولانا سے تعلق کیوجہ سے ان سے بھی خاص
ربط رہا۔

حضرتؒ نے اسی زمانہ میں مولانا اعزاز علی صاحبؒ (شیخ الادب دارالعلوم
دیوبند) کے درس ''شرح نقایہ'' میں بھی شرکت فرمائی، حضرت فرماتے ہیں کہ:

''مجھے اس درس سے بہت فائدہ ہوا، مولانا اس وقت سے مجھ پر بہت شفقت
فرمانے لگے تھے اور یہ شفقت اخیر تک قائم رہی، جب میری کتاب مختارات
چھپ کران کے پاس پہنچی تو بعض حاضرین مجلس سے بلند الفاظ میں اس کا تعارف
اور تعریف فرمائی'' (کاروان زندگی اول ص/ ۱۳۱)

اسی زمانہ قیام میں ایک مرتبہ مولانا انور شاہ صاحبؒ ڈابھیل سے تشریف
لائے، ڈاکٹر صاحبؒ نے ان کی زیارت وملاقات اور سلام پہنچانے کی ہدایت کی
تھی، حضرت نے سلام پہنچایا تو انہوں نے پہچان لیا، اور خیریت وحالات دریافت
کئے، دوتین مرتبہ حضرتؒ ان کی عصر کی مجلس میں شریک ہوئے، اسی زمانۂ قیام میں
حضرت نے قاری اصغر علی صاحبؒ سے قرأت حفص بھی پڑھی، حضرتؒ دیوبند کے
اس قیام کے بارے میں فرماتے ہیں:

''دارالعلوم کے اس چار ماہ کے قیام میں میری دلبستگی کا سامان اور میرے

اُنس وعقیدت کا مرکز مولانا مدنیؒ کی ذات تھی اور اصل مناسبت انہیں سے تھی،
مجھے یاد ہے کہ وہ صبح کبھی اپنے خاص لہجہ میں مجھ سے مخاطب ہوتے اور فرماتے:
''کہئے مولوی علی میاں صاحب! آج اخبار میں آپ نے کیا پڑھا!'' تو مجھے دن بھر
اس کا مزہ آتا رہتا اور دل مسرت سے معمور بلکہ مخمور رہتا۔ بقول شاعر ؎

بہر تسکیں دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
جو بوقت ناز کچھ جنبش تیرے ابرو میں تھی

دارالعلوم میں امتحانات کی تیاری شروع ہوئی اور کتابیں ختم ہوئیں تو حضرتؒ
شعبان ہی میں لکھنؤ واپس ہوئے۔

لاہور کا سفر اور حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے درس کی تکمیل:

حضرتؒ نے دیوبند ہی کے قیام میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ
کے درس میں شرکت اور اس کی تکمیل کا ارادہ فرمالیا تھا، دیوبند سے واپس ہوتے
ہی چند روز قیام کے بعد حضرت لاہور روانہ ہوگئے، وہاں قیام کی تفصیل حضرت ہی
کے الفاظ میں نقل کی جاتی ہے:

''۱۳۵۱ھ کے شعبان کے آخر یا رمضان کے اوائل میں (۱۹۳۲ء کے غالباً
دسمبر میں) میں نے لاہور کے لئے رخت سفر باندھا، اور مدرسہ قاسم العلوم کا
باقاعدہ طالب علم بن گیا، اس درس میں جس میں پورا قرآن مجید پڑھایا جاتا تھا،
صرف مدارس اسلامیہ کے فارغین یا منتہی طلبہ شریک ہوتے تھے، یہ ''علماء کلاس''
کہلاتی تھی، آخر شعبان سے شروع ہوکر وسط ذی قعدہ تک اس کا سلسلہ جاری

رہتا، میں جب پہنچا ہوں تو اس درجہ میں پچاس کے قریب طلبہ تھے، جن میں اکثریت دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کی تھی، انہیں میں ہمارے درس حدیث کے ساتھی مولانا صبغۃ اللہ بختیاریؒ بھی تھے، یہ درس بڑی محنت اور قوی حافظہ کا طالب تھا کہ ہر رکوع کا خلاصہ اور اس کا مآخذ تیار کرنا پڑتا تھا، اور نیا درس شروع ہونے سے پہلے پچھلے درس کا امتحان ہوتا تھا، جس کی جس رکوع کی باری آجائے اس کو اس کا خلاصہ مولانا سندھی کے مقرر کئے ہوئے لفظوں میں اور اس کا قرآنی مآخذ سنانا پڑتا تھا۔

تعلیم وتدریس کا آغاز اور دارالعلوم میں قیام

یکم اگست ۱۹۳۴ء سے حضرت مولاناؒ کا بحیثیت استاد تفسیر وادب تقرر ہوا۔

تدریس کی ابتداء ہوئی تو حضرت نے باقاعدہ دارالعلوم ہی میں قیام پسند فرمایا تا کہ پوری توجہ وانہماک کے ساتھ تدریس وتعلیم میں مشغول ہوسکیں، جس کمرہ میں حضرت کا قیام تھا اس میں مولانا مسعود عالم صاحب ندویؒ بھی مقیم تھے، اس طرح وہ رہائش گاہ بھی تھا اور ''الضیـاء'' کا دفتر بھی۔ مولانا مسعود صاحب اگرچہ دارالعلوم میں دورانِ تعلیم ایک سال آگے تھے لیکن ان سے بڑی ذہنی وفکری مناسبت اور اتحاد تھا۔ پہلے ہی سال حضرتؒ کو درجہ ششم میں ترمذی شریف کا نصف ثانی اور قرآن شریف کے ابتدائی دس پاروں کی تفسیر پڑھانے کے لئے دی گئی، اس کے علاوہ ادب میں دیوان حماسہ کا کچھ حصہ اور خُضری کی ''تاریخ الامم الاسلامیۃ'' اور ابتدائی درجات میں بھی کوئی ایک عربی ریڈر حصہ میں آئی۔

درس تفسیر کی تیاری کے سلسلہ میں حضرت تحریر فرماتے ہیں:

''میں کتب خانہ سے تفسیر کی قدیم بڑی کتابیں اور اہم بنیادی مآخذ لے آیا ان میں سے بعض تفسیریں مثلاً ''**کشاف**''، ''**معالم النزیل**'' ''**بغوی**'' و ''**مدارک**'' تقریباً لفظاً لفظاً پڑھیں۔ جدید تفاسیر میں سے ''**تفسیر المنار**'' پھر مولانا آزاد کی ''ترجمان القرآن'' سے پورا استفادہ کیا۔ تدریس اور طلباء کے سوالات کے جواب میں علامہ آلوسی کی ''روح المعانی'' سے سب سے زیادہ مدد لی، جدید معلومات اور تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے خط وکتابت شروع کی اور سوالات کے حل میں ان سے مدد لی، اس کے لئے کئی بار دریاباد حاضر ہوا اور مولانا سے استفادہ کیا۔

☆......**ف**: غور فرمائیں کہ درس وتدریس میں کس قدر توجہ انہماک اور مطالعہ کتب کے لئے کتنی جدوجہد اور جانفشانی برداشت کرنی پڑتی ہے تب کہیں جا کر علی میاں جیسا عالم ومعلم بنتا ہے، اس لئے طلباء کو اس کی طرف خوب توجہ کرنی چاہئے اور محنت ومشقت برداشت کر کے علم دین میں مہارت وکمال حاصل کرنا چاہئے۔

(محمد قمر الزمان)

رشتۂ ازدواج:

دارالعلوم کے قیام کے پہلے ہی سال میں حضرتؒ کی شادی حقیقی ماموں زاد بہن سیدہ طیب النساء صاحبہؒ سے ہوئی جو حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کی پوتی اور مولانا سید عبدالرزاق کلامی، ''**صاحبِ صمصام الاسلام**' کی نواسی تھیں، حضرت مولانا

حیدر حسن خاں صاحبؒ نے نکاح پڑھایا اور ڈاکٹر صاحب نے بڑے اہتمام سے ولیمہ کا انتظام فرمایا۔

مسلم لیگ اور خاکسار تحریک کا زور اور حضرتؒ کا اس پر تنقیدی مضمون:

اس زمانہ میں مسلم لیگ کی تحریک زور پر تھی ، جمیعۃ العلماء اور خاص طور پر حضرت مدنیؒ کے اختلاف کی وجہ سے اس کے اندر علماء کی تحقیر کا پہلو بھی شامل ہو گیا تھا، ڈاکٹر صاحبؒ حضرت مدنیؒ کے دست گرفتہ اور معتقد تھے اور پورا گھر جمعیت کا حامی اور مؤید تھا، مزید خاکسار تحریک نے اس میں آگ لگا دی تھی ، لوگوں کی زبانیں بڑی بیباک ہو گئی تھیں ۔اسی زمانہ میں حضرتؒ نے خاکسار تحریک پر تنقیدی مضمون لکھا، جو ''الفرقان'' میں شائع ہوا۔حضرت مضمون کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے علمی انداز میں اس تحریک کا محاسبہ کیا تھا، اور خوارج اور باطنیوں کی مثال سامنے رکھ کر اس سے اس کا موازنہ کیا تھا اور ثابت کیا تھا کہ محض نظم واتحاد جوش وخروش ،قربانی ، ڈسپلن اور نظام حتی کہ کثرت عبادت بھی (جو خوارج کا طرۂ امتیاز تھا) حقانیت اور مقبولیت عنداللہ کی ضامن نہیں اصل چیز صحت اعتقاد، مقصد کا درست ہونا، اور اتباع شریعت ہے۔

☆......ف : ماشاءاللہ کیا خوب مضمون ہے جس میں اصل حقیقت کو واضح فرما دیا ہر تحریک کے لئے اس میں غور وفکر کی ضرورت ہے کہ کسی عمل حتیٰ کہ عبادت کی وجہ سے غرور اور دھوکہ میں نہ پڑنا چاہئے، اور برابر **اللھم اھدنا وسددنا** دعا کرنی

چاہئے یعنی اللہ ہدایت پر رکھے۔ (محمد قمر الزمان)

مطالعۂ قرآن اور اس کے اصول ومبادی:

درس قرآن کا سلسلہ شروع سے ہی جاری تھا اور کئی سال سے ابتدائی دس پاروں کی تفسیر حضرتؒ کے ذمہ تھی ۔۴۰-۱۹۳۹ء کا قصہ ہے کہ حضرتؒ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ طلباء مطالعہ قرآن اور اس سے صحیح استفادہ کرنے کے بہت سے مقدمات اور اصول ومبادی سے ناواقف ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ قرآن مجید سے پورا فائدہ نہیں اٹھا پاتے ۔ضرورت ہے کہ ایسے مضامین تیار کئے جائیں جو اس سلسلہ میں معاون ثابت ہوں۔اس کیلئے حضرت نے ایک سلسلۂ مضامین تحریر فرمایا جو قسط وار ''الندوہ'' میں شائع ہوا اور بعد میں ''مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی'' کے نام سے یہ کتاب مکتبہ اسلام سے شائع ہوئی۔اس میں ایسے مضامین ہیں جو قرآن مجید سے اشتغال رکھنے والوں کے لئے بہت مفید، ضروری اور بصیرت افروز ہیں۔

''جماعت اسلامی'' میں شرکت اور اس سے علیحدگی:

مولانا مودودیؒ سے پہلی ملاقات لاہور کے ایک سفر میں ہو چکی تھی ، ان کے مضامین سے واقفیت اور مطالعہ کا سلسلہ بھی ۳۵-۱۹۳۴ء سے جاری تھا حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ''میرے مولانا کی تحریروں اور جماعت کے لٹریچر سے تاثر اور وابستگی کی بنیاد مولانا کے وہ فاضلانہ تنقیدی مضامین تھے جو انہوں نے مغربی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات اور موجودہ مادی نقطۂ نظر کے خلاف لکھے تھے۔''

۱۹۴۱ء کی ابتدا میں وہ لکھنؤ تشریف لائے اور دار العلوم کے مہمان خانہ میں قیام کیا۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کی تحریک پر حضرتؒ باقاعدہ رکن بنے اور حلقۂ لکھنؤ کے ذمہ دار قرار پائے۔ اس کے بعد مولانا کا ایک سفر لکھنؤ اور ہوا، جس میں انہوں نے حضرت کی خواہش پر دار العلوم میں ''نیا تعلیمی نظام'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ۱۹۴۲ء میں حضرت نے جماعت کے جلسہ عاملہ میں شرکت کے لئے لاہور کا سفر کیا اور اسی سال فروری میں دہلی میں عاملہ کا جلسہ ہوا جس میں حضرتؒ شریک ہوئے۔ وہاں سے مولانا کے ساتھ ہی حضرت علی گڑھ تشریف لے گئے اور ایک دو روز ساتھ ہی قیام رہا۔ حضرت فرماتے ہیں:

''میں نے یونیورسٹی کے حلقہ میں مولانا کی مقبولیت کا اندازہ کیا جو اس وقت کے حالات اور مسلمان نوجوانوں کی ذہنی بے چینی اور روحانی پیاس کا عین تقاضا تھا۔

تقریباً تین سال حضرت باقاعدہ جماعت سے وابستہ رہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ:

''اس عرصہ میں میرے اندر تین احساسات پیدا ہوئے جنہوں نے مجھے جماعت سے وابستگی اور انتساب پر ازسرنو غور کرنے پر مجبور کیا۔

ایک یہ کہ میں دیکھتا تھا کہ مولانا کی شخصیت کے بارے میں جماعت کے افراد میں بڑا غلو پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ وہ ان کے علاوہ کسی اور مفکر، مصنف اور داعی کے متعلق بلند خیال قائم کرنے، اس پر اعتماد کرنے اور اس کی تحریروں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ان میں تنقید کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے اور علماء و دینی حلقوں کے بارے میں ان کی زبانیں بیباک ہو رہی ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ ان میں دین کے ذوق و عمل میں کوئی ترقی، اصلاح نفس کا کوئی نمایاں جذبہ اور تعلق مع اللہ میں ترقی کی کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی تھی۔''

☆...... **ف** : اس سے معلوم ہوا کہ مندرجہ بالا تین باتیں کسی بھی جماعت میں پائی جائیں گی تو ہر صاحب احساس کو اس جماعت سے وابستگی اور انتساب پر ازسر نو غور کرنا لازمی ہے ورنہ مداہنت ہوگی، العیاذ باللہ۔ (مرتب)

مزید فرماتے ہیں:

''پھر مولانا الیاس صاحبؒ کی ملاقات، وہاں کی آمد و رفت اور ان کے حالات سے جتنا تاثر بڑھتا گیا جو مجھے مزاج نبوت، سیرت طیبہ اور دین کی دعوت کی روح سے قریب تر نظر آئے، میری ذہنی کشمکش بڑھتی گئی، یہاں تک کہ خود میں نے اس کی اطلاع مولانا مودودی کو دی۔ اور مجھے مولانا نے یکسو ہو جانے کا مشورہ دیا۔''

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ کی خدمت میں حاضری:

آپ حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں ۱۹۴۲ء میں حاضر ہوئے جس کی صورت یہ ہوئی ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ صاحب کے ہمراہ شاہدرہ سے سہارنپور تشریف لے جا رہے تھے، تھانہ بھون راستہ میں پڑتا تھا حضرتؒ نے پہلے اپنی حاضری کی اطلاع ایک مکتوب کے ذریعہ سے فرمادی اور مولانا الیاس صاحبؒ سے اجازت لے کر تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ آگے کا حال حضرت ہی

کی زبانی اختصار سے نقل کیا جاتا ہے۔فرماتے ہیں کہ:

’’میں خانقاہ میں داخل ہوا، گرمی اور دوپہر کی وجہ سے سناٹا تھا، ایک طرف سامان رکھ کر بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد ظہر کی اذان ہوئی۔مولانا تشریف لائے۔میں نے اس وقت اپنا تعارف مناسب نہیں سمجھا۔ظہر کی نماز کے بعد مجلس شروع ہوئی میں بھی حاضر ہوا اور کنارے بیٹھ گیا۔داخل ہوتے ہی اس ڈیسک پر نظر پڑی جو مولانا کے سامنے تھی، اس پر سیرت سید احمد شہید بھی رکھی ہوئی تھی، اس سے اجنبیت کے احساس میں بہت کمی ہوئی۔مولانا خطوط کے جوابات دینے میں مصروف تھے۔چند منٹ کے بعد خواجہ عزیز الحسن صاحب سے فرمایا کہ ڈاکٹر عبد العلی صاحب کے بھائی آنے والے تھے، آئے نہیں؟ میں آگے بڑھا اور عرض کیا کہ حاضر ہوں۔فرمایا آپ نے بتایا نہیں؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت کے حرج کے خیال سے عرض نہیں کیا۔فرمایا اس سے بڑھ کر کیا حرج ہوتا کہ مجھے آپ کی آمد کا علم نہ ہوتا، خجالت ہوتی، ندامت ہوتی، افسوس ہوتا۔مکرر کئی لفظ فرمائے۔خلاف معمول اپنا مہمان بنایا اور دونوں وقت پر تکلف کھانے کا اہتمام فرمایا۔فرمایا کہ میں نے آپ کی وجہ سے خطوط کا بہت سا کام پہلے کر لیا تھا تا کہ اطمینان سے باتیں کرنے کا موقع ملے، یہ حضرت کی طرف سے انتہائی اعزاز تھا۔(انتہیٰ)

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں حاضری:

سب سے پہلے حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں حاضری ۱۹۴۰ء میں ہوئی حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے پہلی ہی ملاقات میں خصوصی

توجہ والتفات فرمایا جس سے مولانا علی میاںؒ بہت متاثر ہوئے، اس کے بعد کے حالات و واقعات کے علم کے لئے اصل کتاب سوانح مفکر اسلام یا اس کی اصل کاروان زندگی کا مطالعہ فرمائیں۔

حضرت پر خصوصی شفقت وتوجہ:

اس پورے عرصہ میں مولانا کی توجہ بڑھتی رہی۔خطوط میں اس طرح خطاب فرماتے کہ اس سے صرف شفقت ومحبت ہی نہیں بلکہ عظمت وعقیدت کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: ’’جناب کا گرامی نامہ کنول قلب کے کھلنے کا سبب ہوا۔‘‘ ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں: ’’جناب کی تشریف آوری کا مژدہ روئیں روئیں کو تر وتازہ کر رہا ہے، حق تعالیٰ ہمیں آپ کی ذات گرامی سے دارین میں متنفع فرمائیں‘‘۔ایک خط میں ’’سیدی وسید عالم‘‘ سے خطاب فرمایا۔

حضرت کا بھی حال یہ تھا کہ ہر مہینہ نظام الدین تشریف لے جاتے، اہم دوروں اور اجتماعات میں شرکت فرماتے۔ڈاکٹر صاحبؒ بھی مولاناؒ اور ان کی دعوت وتحریک کے بڑے موید اور قدرداں تھے۔

میوات کے کسی دورہ میں قیام گاہ پر کسی نے مولانا کی چارپائی اس طرح بچھا دی کہ اس کا پائے تانہ حضرتؒ کی چارپائی کے سرہانے کی طرف ہو رہا تھا، یہ دیکھ کر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور ساتھ رہنے والوں سے فرمایا کہ ’’تم اتنے دن سے ساتھ رہتے ہو مگر اتنی سی حس نہیں۔‘‘

اس پورے عرصہ میں حضرت کو بار بار ترجمانی کا شرف بھی حاصل ہوتا رہا

اور مولانا کا اعتماد بڑھتا رہا۔اہم اہم مواقع پر حضرتؒ کو خطاب کے لئے فرماتے۔ حضرت فرماتے ہیں:

’’ایک مرتبہ لکھنؤ سے رات کو نظام الدین پہنچا، صبح مولانا نے مجھی کو نماز پڑھانے کا حکم دیا۔سلام پھیرنے کے بعد فرمایا کہ کچھ کہئے، میں نے عرض کیا کہ میں بالکل خالی الذہن ہوں۔فرمایا آپ کہنا تو شروع کیجئے۔ میں نے کہنا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ مولانا متوجہ ہیں اور مضامین کا ورود ہو رہا ہے، اسی اعتماد اور تجربہ کی بنا پر میں نے مولانا کے گرامی ناموں اور ارشادات کو سامنے رکھ کر جو میرے نام آئے تھے، ایک رسالہ ’’ایک اہم دینی دعوت‘‘ کے نام سے مرتب کیا۔ مولانا نے اسکو من اولہٖ الیٰ آخرہٖ لفظاً لفظاً سنا۔ چند جگہ خفیف سی لفظی ترمیمیں کیں، سننے کے بعد بہت دعائیں دیں۔

اسی مناسبت واعتماد کی بنا پر حضرت زیادہ سے زیادہ میرا قرب اور مجالس میں میری شرکت پسند فرماتے تھے۔ایک مرتبہ شہر کے کسی گشت یا قرب وجوار کے کسی نظام میں ذمہ داروں نے مجھے بھی بھیج دیا، مولانا کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ ایک آدمی میری باتیں سمجھنے والا تھا، تم نے اس کو بھی بھیج دیا، اب میں کس سے بات کروں؟‘‘

☆......ف : معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سب کے ساتھ یکساں معاملہ نہیں فرماتے تھے، اور نہ ایک ہی عمل تجویز فرماتے تھے اور نہ ایک ہی لکڑی سے سب کو ہانکتے تھے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حکمت وبصیرت کے ساتھ عمل کی توفیق مرحمت فرمائے۔آمین

(محمد قمر الزمان)

تبلیغ ودعوت میں انہماک:

حضرت دہلویؒ کی شفقتیں بڑھتی رہیں، اور حضرتؒ کا دعوت وتبلیغ میں انہماک بڑھتا گیا، یہاں تک کہ حضرت نے دار العلوم سے ضابطہ کا تعلق اور ملازمت ترک کرنے کا ارادہ فرمالیا۔حضرت مولانا محمد الیاس صاحب دہلوی کے سامنے جب حضرت نے اپنے اس رجحان کا ذکر فرمایا تو فرمانے لگے: ’’ہمارے بزرگ کسی ذریعہ معاش اور ملازمت کو اس وقت تک ترک کرنے کا مشورہ نہیں دیتے جب تک اس کا نعم البدل مہیا نہ ہوجائے۔‘‘ حضرت نے دوسری بار پھر عرض کیا تو مولانا نے وہی جواب دیا۔حضرت فرماتے ہیں:

’’غالباً مولانا میری طبیعت اور عزم وفیصلہ کی پختگی کا اندازہ فرمارہے تھے، فجر کی نماز اور تقریر کے بعد مجھ سے خود فرمایا کہ مولانا آپ کو دار العلوم سے کیا ملتا ہے؟ میں نے کہا پچاس روپیہ۔ یہ سن کر بڑے جوش کے ساتھ فرمایا اجی حضرت! ایسے ہزاروں پچاس آپ کے غلاموں کے قدموں پر نثار ہوں گے۔ یہ کہہ کر اجازت دے دی۔‘‘

۱۹۴۳ء کے اختتام تک حضرت اعزازی طور پر دار العلوم کی خدمت کرتے رہے، اس دوران تبلیغی دوروں کا سلسلہ پورے زور وشور سے جاری رہا، لیکن پھر علامہ سید سلیمان ندویؒ کے اصرار پر دوبارہ یکم دسمبر ۱۹۴۳ء کو دار العلوم سے باضابطہ منسلک ہوگئے اور سید صاحب ہی کے حکم پر تنخواہ لینا بھی قبول فرمالیا جس کا سلسلہ صرف ایک سال جاری رہا۔

ان تبلیغی اسفار میں مختلف دینی مدارس میں جانا ہوتا، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مدارس کے درمیان جو ایک خلیج حائل تھی، وہ دور ہوئی۔ خاص طور پر دارالعلوم ندوۃ العلماء اور قدیم دینی مدارس (جن میں دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سرفہرست ہے) کے درمیان جو ایک حجاب تھا وہ دور ہوا اور وہ قرب و ارتباط اور تعارف و اعتماد پیدا ہوا جس کی ایک مسلک و مقصد کی تعلیم گاہوں اور دینی مرکزوں میں عرصہ سے ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔

حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی وفات کے بعد حضرتؒ کا موقف

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی حیات میں حضرت پوری طرح تبلیغی کام میں منہمک رہے۔ حضرت دہلوی کی بے پایاں شفقتیں اور عنایتیں حضرت پر اتنی تھیں کہ کسی دوسری فکر یا تحریک کی طرف نظر کرنے کا باقاعدہ خیال بھی نہیں ہوتا تھا، لیکن حضرت دہلوی کی وفات کے بعد وہ کیفیت نہیں رہی۔

اس باب میں حضرتؒ نے امام غزالیؒ کے بارے میں جو دو سطریں تحریر فرمائی ہیں وہ پوری طرح خود حضرت پر صادق آتی ہیں ''علوِ ہمت ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز تھا، انھوں نے فکر و عمل کے دائرے میں اپنے زمانہ کی سطح اور ہم عصروں کی کسی منزل پر قناعت نہیں کی، اور جس ترقی یافتہ مقام پر پہنچے ان کے کانوں میں یہی صدا آئی۔

مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں ہے''

حضرتؒ نے ''میرا موقف اور طریقِ فکر'' کے عنوان سے اس کو تفصیل سے

بیان فرمایا ہے یہاں قدرے اختصار کے ساتھ اسکو نقل کیا جاتا ہے:

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی سے گہری عقیدت، ان کے فہم دینی و اخلاص پر کامل اعتماد، اس کام کی افادیت وضرورت پر یقین اور نہ صرف عملی شرکت بلکہ ایک داعی و ترجمان کے فرائض انجام دینے کے ساتھ واقعہ یہ ہے کہ میرے ذہن کے سانچہ کی مکمل شکست و ریخت عمل میں نہیں آئی تھی اور اس کی جگہ کسی دوسرے ذہنی اور فکری سانچہ نے نہیں لی تھی۔

میرا ایک فکری وعلمی پس منظر (Background) تھا۔ اصلاحی اور تجدیدی تحریکوں اور ان کی مرکزی شخصیتوں کا میں نے نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ ان کے تعارف وتذکرہ نویسی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ میں ہر دور میں منصوصات وغیر منصوصات اور مقاصد ووسائل میں فرق کرتا رہا، اور میرے نزدیک خوب سے خوب تر کی تلاش اور نافع سے انفع کی جستجو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اسی طرح میرے نزدیک ہر تحریک، ہر دعوت اور ہر ادارہ میں جو دین کی خدمت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے قائم ہو، نمو وارتقاء زندگی اور اس کے مسائل سے واقفیت، اور جائز اور ضروری حد تک ان کی تکمیل اور زندگی سے تطبیق کی کوشش ضروری ہے ورنہ وہ تحریک اور ادارہ نمو اور زندگی کی صلاحیت سے محروم اور جمود کا شکار ہو جائے گا اور اسکی افادیت محدود سے محدود تر ہو کر رہ جائے گی۔

ان خیالات نے جو میرے خاص ماحول، مطالعہ اور ذہنی ساخت کا نتیجہ تھے کسی دور میں ساتھ نہیں چھوڑا، اور میں مولانا کی حیات میں بھی کبھی کبھی تنہائی میں اقبال کا یہ شعر پڑھتا تھا۔

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی ، کبھی پیچ و تاب رازی

لیکن مولانا کی قوت نسبت اور بے پایاں شفقت اور عملی مشغولیت نے ان کی حیات کے پورے عرصہ میں اس فکر کو دبا رکھا تھا۔ مولانا کی وفات کے بعد وہ نمایاں طریقہ پر ابھرنے لگی، اس نے پہلے یہ شکل اختیار کی کہ کام کو جواب سارے ہندوستان میں تقریباً پھیل چکا تھا اور دوسرے ممالک کی طرف بڑھ رہا تھا، کچھ زیادہ منظّم، موثر اور ذہین و علمی طبقہ کے لئے اطمینان بخش اور پرکشش بنانے کے لئے اصول دعوت اور اس کے ان اجزاء کو قائم رکھتے ہوئے (جن کو اس تحریک میں چھ نمبر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا) کم تبدیلیوں اور زیادہ اضافوں کی ضرورت ہے۔ مختلف مجالس میں مولانا محمد یوسف صاحبؒ اور ان کے اہل شوریٰ سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی مگر اندازہ ہوا کہ ان کا ذہن اس کا ساتھ نہیں دیتا اور وہ اس کی تائید میں نہیں ہیں اور شاید مولانا کی وفات کے بعد دعوت کے اس ابتدائی مرحلہ میں اسی احتیاط کی کسی قدر ضرورت بھی تھی۔ کئی بار متوجہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب تک خود اصل داعی کے ذہن میں جو دعوت کا روح رواں ہے کسی ضرورت کا احساس اور کسی تبدیلی کا تقاضا پیدا نہ ہو باہر سے مشورہ دینا مفید اور موثر نہیں ہوا کرتا۔''

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے دل میں حضرت کی پوری قدر و منزلت تھی کام کے سلسلہ میں حضرتؒ کی قربانیوں کا اعتراف بھی تھا مگر وہ اس کام کو بالکل اسی طریقہ پر لے کر چلنا چاہتے تھے جو حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے اختیار فرمایا تھا اور کام کی وسعت کے باوجود وہ اس کے طریقہ کار میں

وسعت کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ اسی زمانہ کے ایک طویل یادگار مکتوب کے بعض اقتباسات یہاں پر پیش کئے جارہے ہیں جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے حضرتؒ کو تحریر فرمایا تھا:

''مخدوم و مکرم و معظم و محترم جناب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت عالی! مجھے دل سے اعتراف ہے کہ آپ نے حضرت مرحوم کی اس وقت قدر کی جس وقت یہ ناچیز ناقدری کر رہا تھا، آپ نے اس عمل کی طرف قدم اٹھایا جس وقت یہ حقیر اس سے پہلو تہی کر رہا تھا۔ آپ سنتے تھے، تعمیل کرتے تھے، سمجھتے تھے اور محفوظ رکھتے تھے اور اس کام کے انہماک اور دعوت کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتے چلے جارہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعوت میں تاثیر دی اور اضلاع متصلہ سے باہر یہ کام آپ ہی کی وساطت و دعوت سے پھیلا اور علمی حلقہ میں آپ ہی کی وساطت سے یہ چیز پہنچی۔

علماء میں جماعتوں کو لیکر پھرنے کی طرف آپ ہی نے سبقت فرمائی، علمی حلقہ کی طرف اس دعوت کو لیکر آپ ہی بڑھے، علماء کی طبائع کا جائزہ حضرتؒ مرحوم آپ ہی کی وساطت سے لیا کرتے اور ان کے شکوک وشبہات کا ازالہ آپ ہی کے ذریعہ فرماتے۔

غرض کہ حق تعالیٰ شانہ آپ کو نہایت ہی جزائے خیر عطا فرمائے آپ نے خوب ساتھ دیا۔ (مکتوب مولانا محمد یوسف صاحبؒ تمام شد)

اس کے بعد حضرت مولانا ندویؒ نے یہ طے فرمالیا کہ مرکز نظام الدین

سے تعلق اور دعوت کی مشغولیت کو جاری رکھتے ہوئے اپنے دائرہ کار میں اس کو زیادہ مفید بنانے اور دعوت وتفہیم کے لئے اپنی زبان استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۴ء سے لیکر ۵۳-۱۹۵۲ء تک جاری رہا۔اس کے لکھنؤ اور اس کے اطراف پر بڑے اچھے اثرات مرتب ہوئے ،اور یہاں کا صاحب علم وفکر طبقہ اس کام کی طرف متوجہ ہوا۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی طرف سے اجازت وخلافت اور خصوصی شفقت ومحبت:

حضرتؒ نے حضرت لاہوریؒ کے شیخ حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ سے بیعت کی تھی لیکن تربیت وسلوک کا تعلق حضرت لاہوریؒ سے ہی رہا،تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف، دعوت وتبلیغ اور حضرت دہلویؒ وحضرت رائپوریؒ سے عقیدت ومحبت کے باوجود حضرت لاہوریؒ سے وہ روحانی تعلق نہ صرف یہ کہ قائم رہا بلکہ اس میں ترقی ہوتی رہی ،۱۹۴۶ء میں حضرت لاہوریؒ نے حج کا سفر کیا ،واپسی پر حضرتؒ نے اپنے شیخ کو تہنیت کا خط لکھا۔اس کے جواب میں حضرت لاہوری نے حضرتؒ کو لاہور بلایا اور ایک روز تنہائی میں اپنے سلسلہ قادریہ میں اجازت مرحمت فرمائی اور مسجد خیف منیٰ میں انہوں نے جو غیر معمولی دعا واستخارہ کا اہتمام کیا تھا اور جسکے نتیجہ میں اشارہ غیبی پاکر انہوں نے اجازت وخلافت کا ارادہ فرمایا تھا اس کا بھی تذکرہ کیا۔

حضرت لاہوریؒ کی شفقتوں کا کچھ اندازہ ان خطوط سے کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے اپنے محبوب ترین مسترشد کو ارسال فرمائے ہیں۔

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

’’میرے دل میں آپ کی جو عزت ہے اسے ضبط تحریر میں لانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میں نے حج کی رات مسجد خیف میں آپ کے درجات کی ترقی کیلئے بارگاہ الٰہی سے استدعا کی اور الحمدللہ اس نے بارگاہ الٰہی میں قبولیت پائی۔‘‘

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

’’چونکہ آپ میرے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کا جو فضل آپ پر ہے وہ میرے لئے صد فخر ہے۔ مجھے جس طرح مولوی حبیب اللہ سلمہٗ (فرزند اکبر) کی ترقی سے فرحت ہوسکتی ہے اسی طرح بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر اس سے زیادہ خوشی اور سرور آپ کے درجات کی ترقی سے ہوتا ہے۔

ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

’’آپ کی ہر کامیابی سے میرے دل میں جتنا سرور اور فرحت حاصل ہوتی ہے غالباً دنیا میں اور کوئی نہیں جس کو اس درجہ کی راحت حاصل ہو، میرا دل آپ کی ترقیٔ دارین کے لئے بارگاہ الٰہی میں ملتجی ہے۔‘‘

ایک مرتبہ شاہی مسجد میں تالاب کے کنارے مجلس ہورہی تھی ، بلاکسی سابقہ تمہید کے اچانک فرمانے لگے’’مولوی ابوالحسن صاحب! میں آپ کی شرافت کا قائل ہوگیا۔‘‘ تین دفعہ اس جملہ کو دہرایا۔

پنجاب کے ایک عالم مولانا عبدالحنان صاحب کہتے تھے کہ ہم لوگ ملتان جیل میں تھے ،مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے حضرات تشریف رکھتے تھے۔ بلا کسی سابقہ تمہید وتقریب کے مولانا احمد علی صاحب نے ایک مجلس میں فرمایا کہ آپ

لوگ مولوی ابوالحسن صاحب کیلئے دعا کیجئے ،سب نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی۔

حضرتؒ کے تعلق ومحبت کا اندازہ اس مضمون سے کیا جا سکتا ہے جو پرانے چراغ میں حضرت لاہوریؒ پر لکھا گیا ہے۔ان مکتوبات کے متعلق حضرت تحریر فرماتے ہیں:

’’میں مولانا کے مکتوبات پڑھتا ہوں تو ان کی پدرانہ شفقت اور مربیانہ عنایت کو دیکھ کر دل پر چوٹ لگتی ہے۔‘‘

یہ خطوط قلب حزیں کی تسکین اور یاس ودل شکستگی کے شدید حملوں کے وقت سکون وتقویت کا بڑا ذریعہ ہیں۔

بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
جو بوقت ناز کچھ جنبش ترے ابرو میں تھی

حضرت مولانا رائے پوری سے خلافت:

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی وفات کے بعد حضرت رائے پوری سے ربط وتعلق میں مزید استحکام پیدا ہوا۔اور حضرت رائے پوری کی شفقت وتوجہ بڑھنے لگی حضرت مولانا علی میاں فرماتے ہیں کہ رائے پور جا کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ مادیت وعقلیت کے بحر ظلمات میں جو چاروں طرف پھیلا ہوا ہے یہی ایک جزیرہ ہے جہاں ذکر وفکر کے علاوہ کوئی موضوع گفتگو اور مشغلہ زندگی نہیں اور جہاں پتہ پتہ سے اللہ اللہ کی آواز آتی ہے۔۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہوگیا تو حضرت کے لئے بار بار لاہور جانا اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی خدمت میں حاضری دینا

مشکل ہوگیا حضرت لاہوریؒ نے جو خود بھی حضرت رائے پوریؒ کے بڑے قدر شناس اور عقیدت مند تھے۔حضرت کو ان کی خدمت میں جانے اور استفادہ کرنے کا مشورہ دیا اس طرح حضرت کا تعلق بڑھتا گیا اور حضرت رائے پوری کی شفقت و عنایت اور محبت بھی بڑھتی گئی اور اس کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت رائے پوری کو حضرت کی آمد کا علم ہوتا تو انتظار شروع ہوجاتا اگر حاضری میں تاخیر ہوتی تو ملاقات کا اشتیاق ظاہر فرماتے اور قیام کے دوران بڑی خصوصیت کا معاملہ فرماتے۔

حضرت سے اسی تعلق ومحبت کا اثر تھا کہ لکھنؤ کو سات مرتبہ حضرت رائے پوری کی تشریف آوری کا شرف حاصل ہوا۔دو مرتبہ حضرت کے وطن رائے بریلی بھی تشریف لائے اور دوسرے سفر میں جو ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا ایک روز مسجد سے نکلتے ہوئے حضرت کو چاروں سلسلوں ،خاص طور سے حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ میں اجازت وخلافت عطا فرمائی۔

’’دینی تعلیمی کونسل‘‘ کا قیام:

حضرتؒ کے اسی ملی درد کا نتیجہ تھا کہ جب تقسیم ملک کے بعد یہاں مسلمانوں کی بنیادی تعلیم ،ان کے عقائد، ایمانیات اور ان کے تشخص وامتیاز کا باقی رہنا مشکل ہوگیا تو حضرت نے باضابطہ صوبائی سطح پر یہ تحریک چلائی کہ اپنے آزاد مدارس و مکاتب قائم کئے جائیں جن میں بنیادی تعلیم کا انتظام ہو۔مولانا نعمانیؒ کی رفاقت اور قاضی عدیل عباسی اور ظفر احمد صدیقی کی معاونت سے باضابطہ اس تحریک کی بنیاد پڑی اور اس کا پہلا اجلاس قاضی صاحب کی دعوت پر بستی میں ۳۰؍۳۱؍دسمبر

۱۹۵۹ء یکم جنوری ۱۹۶۰ء کو منعقد ہوا، اجلاس کی صدارت کیلئے حضرتؒ ہی کا انتخاب ہوا۔ پھر دینی تعلیمی کونسل کے نام سے تنظیم قائم ہوئی تو اس کی صدارت بھی حضرتؒ کے سپرد کی گئی۔ کونسل کی سرکردگی میں صوبائی سطح پر ہزاروں مکاتب قائم ہوئے، جن میں مجموعی طلباء کی تعداد لاکھوں سے تجاوز کرگئی۔ بلاشبہ یہ اتنا بنیادی اور ٹھوس اقدام تھا جس کے بڑے دوررس نتائج سامنے آئے اور اب بھی الحمدللہ حضرتؒ کے جانشین مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب کی صدارت میں یہ سلسلہ جاری ہے۔

۵؍فروری ۱۹۶۱ء میں کالی کٹ کی ایک فعال تنظیم ندوۃ المجاہدین کا سالانہ اجلاس ہوا تنظیم کے ذمہ داروں اور بعض اہل تعلق کی سفارش پر حضرتؒ نے اس کی صدارت قبول فرمائی اور ”ملة ابراهيم و حضارة الاسلام“ کے عنوان سے مقالہ پیش فرمایا، جس کا اردو ترجمہ ”اسلام مکمل دین مستقل تہذیب“ کے نام سے شائع ہوا۔

قفل کعبہ کھولنے کا شرف:

۱۶؍۱۷؍۱۸؍دسمبر ۱۹۹۶ء کو رابطہ عالم اسلامی کی ایک ذیلی کمیٹی ”المجلس الاعلیٰ العالمی للمساجد“ میں شرکت کے لئے حضرت مولانا تشریف لے گئے تھے۔ ۱۸؍دسمبر کو جو اجلاس کا آخری دن تھا، اراکین کو بیت اللہ شریف میں داخلہ کی دعوت دی گئی اور اس کے لئے فجر بعد ساڑھے چھ بجے کا وقت طے ہوا، یہ وقت حضرت کے انتہائی ضعف و ناطاقتی کا ہوتا تھا اور عرصہ سے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ قیام گاہ پر ہی ادا فرماتے تھے اس لئے ابتداء میں حضرتؒ کو کچھ تأمل ہوا کہ اس شدید ضعف کے ساتھ آداب کا خیال کرتے ہوئے اتنے مجمع میں زینے

چڑھ کر اوپر جانا سخت دشوار تھا، اور حضرتؒ یہ شرف بار بار حاصل فرما چکے تھے، لیکن اچانک حضرتؒ نے ارادہ فرمالیا کہ یہ شرف اب اس کے بعد حاصل ہو نہ ہو ”وذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء“۔

۱۸؍دسمبر کو فجر اول وقت ادا فرمائی، مختصر ناشتہ کرکے دوائیں استعمال فرمالیں اور فارغ ہوکر وقت پر حرم شریف حاضر ہوگئے، وہاں خاصا مجمع تھا، اس لئے بجائے مطاف میں داخل ہونے کے حضرتؒ مسجد شریف کے دالان میں ٹھہر گئے، کچھ ہی دیر کے بعد کوئی صاحب آئے اور انہوں نے حضرت سے چلنے کی درخواست کی، شدید ضعف اور پیروں کی تکلیف کی وجہ سے حضرت ”وہیل چیر“ پر بیت اللہ کے بالکل قریب پہنچ گئے، حکومتی سطح پر وہاں باقاعدہ انتظام تھا، باب بیت اللہ پر زینہ لگادیا گیا تھا، شاہ سعود کے پوتے امیر مشعل بن محمد بن سعود نے حضرتؒ کو سہارا دے کر اوپر چڑھایا، دروازہ اس وقت بند تھا، حضرت بیت اللہ کے دروازے کا کڑا پکڑ کر اس کے سہارے کھڑے ہوگئے، نیچے طواف کرنے والوں کا ایک سمندر تھا، رب البیت کے در پر اس کے کڑے کا سہارا لئے ہوئے اپنے وقت کا امام کھڑا تھا، وہ عجیب رقت انگیز منظر تھا، حضرتؒ پر بھی ایک کیفیت طاری تھی، چند ہی لمحوں میں کلید بردار کعبہ جناب شیبی صاحب تشریف لائے اور انہوں نے کلید دروازے کے اندر لگادی اور حضرتؒ سے درخواست کی کہ وہ اپنے دست مبارک سے دروازہ کھولیں اور اندر داخل ہوں۔ حضرت نے چابی گھمائی، اپنے ہاتھ سے دروازہ کھولا، اندر تشریف لے جاکر سیدھے رُکن یمانی کے کونے پر کھڑے ہوکر دوگانہ ادا فرمایا، فراغت کے بعد امیر مشعل نے دُعا کی درخواست کی

حضرت نے پوری ملت اسلامیہ کے لئے اور خاص طور پر حرمین شریفین کے تحفظ کے لئے دُعا فرمائی اور وہاں موجود مختلف ملکوں کے علماء وعمائدین نے آمین کہی۔

یہ ایک ایسا نادر المثال واقعہ تھا کہ شاید ہی زمانہ قریب میں اس کی کوئی نظیر ہو اللہ تعالیٰ کا حضرت پر یہ انعام حضرت کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ کی شکل میں سامنے آیا۔ بیت اللہ سے نکل کر کچھ دیر کے لئے مطاف میں تشریف فرما ہوئے۔ مختلف علماء واہل تعلق نے مبارک باد دی، حضرت سراپا تواضع وانکسار تھے اور اس مقام پر تھے جہاں پہنچ کر مدح وذم یکساں ہوجاتے ہیں۔

یہ خبر عالم اسلام میں پھیل گئی، ہندوستانی اخبارات میں بھی نمایاں طور پر یہ خبر شائع ہوئی اور ہندوستانی مسلمانوں نے خاص طور پر ایک فخر محسوس کیا اور اس پر اللہ کا شکر ادا کیا، شعراء نے منقبتیں لکھیں، واپسی پر بعض اعزازی جلسے بھی لوگوں نے کرنے چاہے مگر حضرتؒ کو اس کی شہرت ناگوار ہوئی اور حضرتؒ نے اس کا اظہار بھی فرمایا اور یہ شعر پوری طرح حضرتؒ پر صادق آیا کہ ؎

میں تو نام و نشان مٹا بیٹھا   شہرہ مرا اُڑا دیا کس نے [1]

سرکاری اسکولوں میں ''وندے ماترم'' کا نفاذ اور حضرت کی فکر وتشویش:

اتر پردیش میں بی۔جے۔پی حکومت مسلمانوں کے لئے ایک ننگی تلوار کی

[1] یہ شعر شیخ العلماء حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کا ہے اسی معنی میں حضرت مرشدی مولانا محمد احمد صاحب پرتابگڈھی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی شعر ہے: جس نے مٹایا اپنا نام ونشاں   ہفت اقلیم کا بنا سلطاں

طرح تھی، اس کی وجہ سے اہل فکر ونظر اور صاحب بصیرت علماء ہر وقت فکر وتشویش میں تھے، ایک طرف مساجد ومدارس کے تحفظ وبقا کا مسئلہ تھا، دوسری طرف سرکاری نصاب میں ایسی خطرناک تبدیلیوں کا ایک ایسا سلسلہ تھا جن کے نتائج بڑے سخت اور ملت سوز ہو سکتے تھے۔ اسی صورت حال میں اچانک سرکاری اسکولوں میں یہ سرکیولر جاری کیا گیا کہ ''وندے ماترم'' کا گیت پڑھنا ہر ایک پر لازم اور ضروری ہے، یہ ایک خالص مشرکانہ اور عقیدہ توحید کے منافی گیت تھا، جس کو کوئی بھی صاحب ایمان اور توحید کا عقیدہ رکھنے والا برداشت نہیں کرسکتا تھا، اسلئے یہ صورتحال مسلمانوں کے لئے بڑی تشویشناک تھی، کئی مہینوں تک مثبت اور قانونی انداز میں کوششیں ہوتی رہیں۔ ''دینی تعلیمی کونسل'' کے متعدد جلسوں میں جو حضرت کی صدارت میں ہوئے اس پر تشویش ظاہر کی گئی اور قانونی احتجاج کیا گیا۔

ایک الہامی بیان اور فتنہ کا سد باب:

صورتحال اسی طرح سے چل رہی تھی کہ اچانک ۱۹/نومبر ۱۹۹۸ء کو اخبارات ریڈیو ٹیلی ویژن کے نمائندے دار العلوم میں حضرتؒ سے اس سلسلہ میں بیان لینے کے لئے اُمنڈ پڑے۔ حضرتؒ نے بیان میں صاف صاف اس کے نقصانات اور ملک پر پڑنے والے اس کے مضر اثرات کا ذکر فرمایا، پھر بڑے جوش کے ساتھ یہ بات بھی فرمائی کہ ''مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ اہمیت ان کے عقیدہ وتوحید کی ہے اور وہ اس کی حفاظت کو ایمان کی شرط سمجھتے ہیں، ہماری مخالفت صرف عقیدہ کی بنیاد پر ہے، یہ خالص دینی اور شرعی مسئلہ ہے اور حکومت اس کو جس

طرح اسکولوں میں نافذ کرنا چاہتی ہے وہ میرے نزدیک مخالفت فی الدین ہے‘‘۔
مزید حضرتؒ نے فرمایا کہ ’’اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو میرا مشورہ ہے کہ مسلمان اپنے
بچوں کو سرکاری اسکولوں سے ہٹالیں‘‘۔

یہ محض عند اللہ حضرتؒ کی مقبولیت ومحبوبیت کا اثر تھا کہ اس بیان سے
اچانک فضا بدل گئی، حکومت کا رویہ تبدیل ہوگیا اور وہ کام جو تحریکوں اور جماعتوں
کے لئے مشکل ہو رہا تھا وہ فرد واحد کی آواز پر ہوگیا وہ فرد اپنی ذات میں ایک انجمن
ایک ادارہ، ایک تحریک بلکہ ایک اُمت تھا، حکومت نے معذرت کی اور جس وزیر
نے یہ کام کیا تھا اس کو برطرف کیا اور اس کے سکریٹری کا ٹرانسفر کیا گیا۔

وفات حسرت آیات:

۲۰ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ بروز چہار شنبہ حضرت مولاناؒ تکیہ رائے
بریلی تشریف لائے تھے۔ ٹھنڈک کی شدت اور ضعف کی بنا پر نماز اور تراویح اپنی
قیام گاہ پر (بنگلہ میں) باجماعت ادا فرماتے تھے۔ گھر میں تشریف لے جانے کا
معمول تھا تاکہ خواتین زیارت اور ملاقات کرسکیں۔ اور بعد تراویح کی مجلس میں
حاضرین سے ملاقات بات چیت کا معمول بدستور رہا۔

۲۲ رمضان ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء جمعہ کا دن سخت سردی اور کہر کا تھا
حسب معمول تہجد کیلئے بیدار ہوئے، نماز تہجد، سحری سے فارغ ہوکر فجر کی سنتیں
پڑھیں اور فرض باجماعت ادا کیا اور آرام فرمانے کے لئے لیٹ گئے ساڑھے آٹھ
بجے کے قریب بیدار ہوئے۔ وضو کرکے اشراق کی نماز ادا کی اور تلاوت میں

مشغول ہوگئے، نصف گھنٹہ تلاوت کی اس کے بعد سورہ یٰسین کا ورد شروع فرمایا
حسب معمول تیرہ، چودہ مرتبہ اسکی تلاوت فرمائی اور نام لے لے کر ایصال ثواب
کیا اس کے بعد فرمایا کہ جلد ہی غسل کرادو، حجامت بنوائی اور ساڑھے گیارہ بجے
غسل خانہ تشریف لے گئے، داخل ہوتے ہوتے فرمایا آج رمضان کی کیا تاریخ
ہے عرض کیا گیا بائیسواں روزہ ہے، استنجا فرما کر پہلے مسواک کے ساتھ وضو فرمایا
اور بار بار فرماتے تھے کہ جلدی کرو، غسل سے فراغت کے بعد غسل خانہ میں دوسری
لنگی اور اندر کی صدری پہنا دی گئی کہ سردی بہت سخت تھی، سہارے سے غسل خانہ
کے باہر تشریف لائے، خدام جلدی جلدی کپڑے پہنانے لگے، جب شیروانی
پہنائی جانے لگی تو فرمایا وقت کم ہے جلدی سے قرآن مجید دے دو سورہ کہف پڑھنی
ہے، لیکن وقت کی کمی کا اندازہ کرکے خود سورہ یٰسین شروع فرما دی سورہ یٰسین کو
شروع کئے ہوئے شاید آدھا منٹ ہوا ہوگا، رومال تہہ کرکے سر پر ڈالا ہی گیا تھا کہ
اچانک حضرت کا جسم مبارک پشت کی طرف ڈھلکنے لگا، خدام نے سہارا دیکر جب
سیدھا کیا تو چہرہ مبارک سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ حضرت دوسرے عالم کا
مشاہدہ کررہے ہیں، دل دھک سے ہوگیا افراد خاندان اور خدام سب جلدی سے
پہنچ گئے ہر ایک پر اضطراری کیفیت طاری تھی، آنکھوں میں اشک تھے عمر بھر کا تھکا
مسافر منزل پر پہنچ کر میٹھی نیند سو چکا تھا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

بالآخر طے ہوا کہ جس ذات نے ساری عمر سنت وشریعت کی ترویج کی آج
آخری سفر میں اس کے خلاف کیوں ہو جلد ہی تجہیز وتکفین کی جائے اور عشاء تک
نماز جنازہ ادا کردی جائے چنانچہ اس کے انتظامات ہوئے۔

اطراف سے اور دور دراز سے انسانوں کا سیلاب امنڈ پڑا، عشاء تک آنے والوں کی تعداد محتاط اندازے کے مطابق تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہو چکی تھی، گھر کے افراد اور مخصوص خدام نے مولانا سید محمد رابع صاحب مدظلہ العالی کی نگرانی میں غسل دیا۔

تقریباً ۱۰ بجے رات نعش مبارک کو اس کی آخری آرام گاہ تک لے جانے کے لئے نکالا گیا۔

حضرت شاہ علم اللہ صاحب کے حظیرہ میں ان کے بڑے صاحبزادے شاہ ہدایت اللہ کے پہلو میں لحد تیار کی گئی جہاں اس خانوادہ کے اکابرین واعزاء مدفون ہیں۔ نماز کے بعد جنازہ کو لحد میں اتارا گیا یہ آخری خدمت مولانا سید محمد رابع صاحب ومولانا محمد عبداللہ صاحب وغیرہم نے انجام دیں۔

آپ کی تدفین سے رشد وہدایت کا وہ آفتاب غروب ہوگیا جس نے بیسویں صدی کے بڑے حصہ کو اپنی روشنی سے منور کیا تھا۔ اور دعوت وعزیمت اور اصلاح وتجدید کا وہ باب بند ہوگیا جس سے اللہ کی مخلوق نے راہ ہدایت پائی تھی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون ، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً وجعل لہ الجنۃ مثواہ ،

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے امت مرحومہ کو اکیسویں صدی کیلئے ایسا عالم ومعلم، صاحب نسبت اور داعی الی اللہ شخص مرحمت فرمائے۔

آمین یارب العالمین

وما ذالک علی اللہ بعزیز

☆☆☆

تأثر بروفات حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

از

اخی المکرّم جناب الحاج انیس احمد انیسؔ پرخاصوی الہ آبادی

حضرت ابو الحسن علی ندوی چلے گئے
میراث علم سارے زمانے کو دے گئے

آنسو اگر چہ تھم گئے یہ سچ تو ہے مگر
دل اپنا اُن کی یاد میں تڑپے گا عمر بھر

حالانکہ اُن کی ہند میں تدفین ہوگئی
حرمین میں نماز جنازہ پڑھی گئی

اپنے تو اپنے غیر بھی روتے ہوئے چلے
صرف اہل علم ہی نہیں سب کے ہیں دل دُکھے

حالاتِ حاضرہ سے وہ رہتے تھے باخبر
رکھتے تھے سارے عالم اسلام پر نظر

عزت کی زندگی کا طریقہ بتا گئے
وہ راہِ مستقیم سبھی کو دکھا گئے

چہرے پہ فکر ملتِ بیضا تھی آشکار
یہ خوف تھا کہ قوم نہ ہو جائے داغدار

راتوں کو اٹھ کے روتے تھے اللہ کے حضور
پروردگار بخش دے اُمت کے سب قصور

اعدا کے مکر و چال سے ہشیار کر دیا
سوتے ہوؤں کو آپ نے بیدار کر دیا

انسانیت کا درس زمانے کو دے گئے
یہ وصفِ خاص اپنے گھرانے کو دے گئے

خورد و کلاں سبھی پہ یہ احسان کر گئے
اپنی بڑائی چھوٹوں پہ قربان کر گئے

علم و ادب کے چرخ پہ روحانیت کے چاند
جس کی چمک سے سارے ستاروں کا نور ماند

مسلک پہ تھی نگہ تو جماعت پہ تھی نظر
اور اس سے بھی زیادہ اُخوت پہ تھی نظر

بدفہم بدمزاج سے رہتے تھے ہوشیار
ذی فہم ذی شعور کو کرتے تھے دل سے پیار

دل کہہ رہا ہے جانبِ تکیہ چلو انیسؔ
دامن کو چل کے لعل و گہر سے بھرو انیسؔ

ملفوظاتِ شنیدہ

اس حقیر نے حضرت مولاناؒ سے جو ملفوظات خود اپنے کانوں سے سنے ہیں ان میں سے چند کو نقل کرتا ہے، پس اگر کسی ملفوظ میں کوئی خطا یا نقص محسوس کریں تو اس کو اس حقیر کی یاد یا ادائیگی کا قصور سمجھیں نہ کہ حضرتؒ کا۔

ملفوظاتِ شنیدہ

☆……﴿۱﴾ فرمایا اس زمانہ میں جوانوں کا اسلام پر اعتماد قائم رہ جائے یہی بڑی بات ہے۔

ف : یہ آپ کے زمانے کے حالات سے واقفیت اور علم نفسیات میں مہارت کی علامت ہے۔

☆……﴿۲﴾ فرمایا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ اصول سے کام کرتے تھے اس لئے کام ہوا پہلے اس کی اہمیت ذہن میں نہ آتی تھی مگر اب اپنے اوپر ذمہ داری آئی تو اس کی قدر ہوتی ہے، کہ بغیر اصول کی پابندی کے آدمی کچھ کام نہیں کرسکتا۔

☆……﴿۳﴾ کسی خاص موقع پر حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوریؒ خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ذکر خیر آیا تو ارشاد فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے زمانہ میں جتنے باصلاحیت لوگ تھے ان سب کو اللہ رب العزت نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں پہنچادیا تھا۔

☆…… **ف** : میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کی صحت پر منصف مزاج شخص شہادت دے گا کہ آپ کے ہر خلیفہ سے دین وطریق کا خوب ہی خوب کام ہوا۔ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا یہ فرمانا نہایت عدل وانصاف پر دال ہے بلکہ ایک لحاظ سے اس دور عصبیت میں غایت درجہ خلوص وللّٰہیت پر مبنی ہے۔

فجزاهم الله احسن الجزاء و كثر الله امثالهم

☆……﴿۴﴾ ایک مرتبہ مجیدیہ اسلامیہ کالج الہ آباد کے کسی خاص موقع پر اثناء

وعظ میں یہ واقعہ بیان فرمایا کہ ایک شیخ اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے کہ ان کے سامنے ہی دومرید لڑ گئے تو کسی نے ان شیخ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت یہ کیا بات ہے کہ آپ کے یہ دونوں مرید آپ کے سامنے ہی لڑ پڑے جو انتہائی بے ادبی کی بات ہے، تو آپ نے اپنے گھٹنوں کی طرف اشارہ فرمایا یہ بات سائل نہ سمجھ سکا تو اس کی تصریح فرمائی بات یہ ہے کہ میرے گھٹنوں میں تکلیف ہے اسلئے اپنے وظائف کی ادائیگی میں کوتاہی ہو رہی ہے اس کی نحوست ہے کہ یہ لوگ میرے سامنے لڑ رہے ہیں، اسکو بیان کر کے مولاناؒ نے فرمایا کہ مسلمان چونکہ اپنے ضروری وظائف کی ادائیگی سے غفلت برت رہے ہیں۔ اسلئے سارے عالم میں فساد ہی فساد برپا ہے، لہٰذا آج اگر مسلمان اپنے دین پر عمل کریں تو دوسری قوموں پر بھی اچھا اثر پڑے۔

☆...... ف : ماشاءاللہ مندرجہ بالا واقعہ کو بیان فرما کر مولانا نے کتنی اہم حقیقت کی طرف رہنمائی فرمائی جو مولانا کی خصوصی وامتیازی شان تھی۔

☆......﴿۵﴾ آپ ایک جلسہ میں (جو دولت حسین کالج الٰہ آباد کے احاطہ میں ہو رہا تھا) تشریف لائے تھے اس میں حالات ملک پر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہر شخص ملک سے فائدہ تو اٹھانا چاہتا ہے مگر اس کی حفاظت کی کسی کو فکر نہیں ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی گائے ہو اس سے دودھ سب لوگ لینا چاہتے ہوں مگر اس کے گھاس چارے کا کسی کو خیال نہ ہو تو بتلایئے اس گائے کا کیا حشر ہوگا یہی حال ہمارے اس ملک کا بھی ہے کہ نفع تو اس سے سب حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اس کی حفاظت کی کسی کو فکر نہیں ہے۔ العیاذ باللہ۔

☆...... ف: سبحان اللہ مثال سے کیسی بصیرت افروز وعبرت آموز حقیقت بیان فرمایا جو آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے۔

☆......﴿۶﴾ الٰہ آباد کے محلّہ بخشی بازار منصور پارک میں واقع کسی جلسہ میں تشریف لائے تھے تو فرمایا کہ میں جب کسی شہر میں داخل ہوتا ہوں تو آنکھ بند کر کے نہیں داخل ہوتا بلکہ آنکھ کھول کر دیکھتا ہوا آتا ہوں چنانچہ میں نے دو کانوں کے سائن بورڈ اردو میں لکھے ہوئے بہت کم دیکھے جس سے مجھے افسوس ہوا کہ اہل شہر الٰہ آباد کو اردو سے اتنا بھی تعلق نہیں کہ اردو زبان میں اپنا سائن بورڈ لکھائیں۔

☆...... ف : بالکل صحیح ارشاد فرمایا یہاں الٰہ آباد میں اس کی بہت کمی ہے جو اپنی زبان اردو سے بے حد عدم مناسبت کی علامت ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دین سے بے ربطی و بے تعلقی کی شناخت ہے۔ اس لئے کہ اکثر ہماری دینی واسلامی کتابیں اردو ہی میں ہیں پس دین سے تعلق ہوتا تو لامحالہ اردو سے بھی تعلق ہوتا اسلئے آج دیکھ لیجئے کہ مسلمانوں کے بچے بچیاں دینی کتابیں جو اردو زبان میں ہیں ان کو پڑھ نہیں سکتیں جس کی وجہ سے علم دین سے ناواقف اور دین سے دور ہوتی جا رہی ہیں۔ نیز یہ بات تو عام ہے کہ ہمارے بچے بچیاں نہ اردو میں خط لکھ سکتیں اور نہ اردو میں اخبار پڑھ سکتی ہیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جو صاحب یہاں اردو کے ذمہ دار ہیں ان کے دروازے پر انگریزی میں ہی ان کا نام لکھا ہوا ہے؛ اردو میں نہیں۔ اسی طرح ان کے کسی عزیز کا شادی کارڈ انگریزی میں شائع ہوا نہ کہ اردو میں جب مجھے موصول ہوا تو میں نے اس پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ مگر ہم مولویوں کی ناراضگی کی بھی کسے پرواہ ہے۔ العیاذ باللہ۔

☆......﴿۷﴾ ایک مرتبہ تکیہ دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی حضرت مولاناؒ ندوی کی خدمت میں پہنچا تو معاً فرمایا کہ لوگ وحدت مطلب کا نام لیتے ہیں مگر اس کا مطلب نہیں سمجھتے۔

☆...... **ف** : حضرت مولانا کا مطلب یہ تھا کہ لوگ اس معاملہ میں غلو کرتے ہیں اور ملنے جلنے کے اسلامی حقوق کا بھی لحاظ نہیں کرتے کسی شیخ طریقت وعالم دین سے محض ملاقات کو بھی وحدت مطلب کے خلاف سمجھتے ہیں جو کسی طرح مناسب نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے حق تلفی بلکہ بے ادبی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ العیاذ باللہ

☆......﴿۸﴾ ایک مرتبہ پرتاپگڈھ کے ایک تبلیغی اجتماع میں لوگ شریک تھے حضرت مرشدی مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھیؒ بھی تشریف فرما تھے اس میں حضرت مولانا علی میاںؒ بھی تشریف فرما تھے حضرت مولانا ندوی نے اثناء بیان میں فرمایا کہ دعوت وتبلیغ کی نوعیت ایک مثال سے سمجھئے۔

وہ یہ کہ کسی کے کنٹرول کی سرکاری دوکان ہو اور دوکاندار اس کو وقت سے کھولتا اور بند کرتا ہے تو اس میں اس کو بھی نفع ہوگا اور دیگر خریداروں کو بھی راحت و منفعت حاصل ہوگی اور اگر وہ دوکاندار دوکان کو کھولتا ہی نہیں یا وقت سے نہیں کھولتا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ اس دوکاندار کو دوکان سے ذرا نفع ہوگا اور نہ دوسرے لوگوں کو۔ اسی طرح امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ذمہ داری جو اس امت کو اللہ رب العزت نے سپرد فرمائی ہے۔

اگر اس خدمت کو امت کے افراد آداب شریعت وسنت کی رعایت کے ساتھ انجام دیتے رہیں گے تو ان کو بھی نفع ہوگا دوسروں کو بھی، ورنہ دونوں ہی کا خسارہ ہوگا۔

☆......﴿۹﴾ جب عزیزی سعید احمد سلمہٗ سعودیہ چلے گئے تو حضرتؒ نے مدرسہ بیت المعارف الہ آباد کے حجرۂ خاص میں مجھ سے خاص طور سے فرمایا کہ آپ نہ جایئے گا اس لئے کہ گدّا تو اونچے سے اونچا مل جائے گا مگر کام کا موقع وہاں نہ ملے گا، کام کرنے کی جگہ یہاں ہی ہے۔

باسمہٖ تعالیٰ

مکتوباتِ عالیہ

الحمدللہ حضرت مولاناؒ کے ساتھ اخیر حیات تک مکاتبت کا سلسلہ قائم رہا۔ چنانچہ حضرت والا کے مرسلہ مکتوبات کثیر تعداد میں محفوظ ہیں ان میں سے چند خطوط درج کئے جاتے ہیں جن سے اس حقیر کے ساتھ حضرت مولانا ندویؒ کی غایت درجہ محبت وشفقت کا معاملہ عیاں ہے۔

فجزاهم الله احسن الجزاء

﴿ ۱ ﴾

محبّ گرامی زید لطفہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا عنایت نامہ جو ڈاک سے بھیجا تھا مجھے لکھنؤ سے چلتے ہوئے ملا، اور میں نے بمبئی میں پڑھا، دستی اس سے پہلے مل گیا تھا۔ آپ کی یاد الحمد للہ فراموش نہیں ہے، آپ سے جو مناسبت محسوس ہوتی ہے وہ کم دوستوں اور بزرگوں سے محسوس ہوتی ہے۔ انشاء اللہ دعا کی سعادت حاصل ہوگی، آپ سے بھی اس کی درخواست ہے۔

عزیز القدر مولوی سعید سلمہٗ کا خیال ہے اور انشاء اللہ رہے گا۔ جب کبھی ان کی علمی ترقی کے لئے کوئی بہتر موقع نکلے گا انشاء اللہ خدمت کرنے سے دریغ نہ کیا جائے گا۔ وہ ماشاء اللہ خود اسم با مسمیٰ ہے۔ ان کو آپ ہدایت کردیجئے کہ وہ مجھ سے تکلف نہ برتے اور جب بھی موقع ہورائے بریلی آجایا کرے۔ برائے کرم مولانا قاری مبین صاحب اور ڈاکٹر صلاح الدین صاحب سے سلام کہئے۔

فقط والسلام

آپ کا ابوالحسن علی

من بمبئی تاریخ ۱۳۹۵ھ　۷/جنوری ۱۹۷۵ء

﴿ ۲ ﴾

محبّ گرامی زید لطفہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

دستی مکتوب مورخہ ۲/رجب عزیزی مولوی سعید سلمہٗ کی معرفت ملا، آپ نے اپنی عالی طبعی سے اس حقیر خدمت کو بہت اہمیت دی، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے اور آپ کے محبت وتعلق کے حق سے بھی وہ ہمارے لئے موجب سعادت ہے، خدا را اس کے تمام مراحل کی تکمیل ہوجائے اور آپ کے لئے کسی درجہ میں طمانیت وسکون کا باعث ہو، میں آپ کی دعاؤں کا بہت محتاج ہوں، اور بہت بے بضاعت اور تہی دست ہوں، زندگی سخت تضاد اور انتشار میں گذر رہی ہے، اللہ تعالیٰ کشتی پار لگادے، اور اپنی رضا ومحبت عطا فرمائے۔

مخدومنا حضرت مولانا محمد احمد صاحب کی علالت سے فکر ہے، میری طرف سے سلام اور مزاج پرسی کرلیجئے گا۔

والسلام

مخلص

ابوالحسن علی

۱۰/۷/۱۳۹۵ھ　۲۰/۷/۱۹۷۵ء

﴿ ۳ ﴾

مکرمی ومحترمی زید لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عجیب اتفاق ہے کہ کل ہی خیال آیا کہ عرصہ سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا، آج آپ کا خط دیکھا، مجھے کئی روز سے نقرس کی تکلیف ہے، اب الحمدللہ افاقہ ہے۔

کل ۱۷رمئی کو بذریعہ کار حضرت مولانا سے ملنے کیلئے پرتاپگڈھ جانے کا ارادہ ہے، مولوی سعید سلمہ کو خط لکھیں تو میرا بھی سلام لکھ دیں، مجھے معلوم نہیں تھا کہ محبوب میاں کی طبیعت بہت خراب رہتی ہے، میں دعا کرتا ہوں، آپ سے دعا کی درخواست ہے۔

والسلام

مخلص

ابوالحسن علی

۱۶رمئی ۱۹۸۰ء

﴿ ۴ ﴾

محبّ گرامی منزلت زیدت لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عنایت نامہ ملا، آپ کی کریم النفسی ہے کہ یہاں کے قیام کی کوتاہیوں کو نظرانداز فرمایا، مجھے تو ان کا احساس رہا، اس لئے کہ مختلف النوع مہمانوں کی موجودگی کی وجہ سے کسی کا بھی کوئی حق نہیں ادا ہو پاتا، آپ تو میرے لئے بہت زیادہ اکرام واحترام کے مستحق ہیں۔

امید ہے کہ میرا عریضہ حضرت مولانا کی خدمت میں نیز ڈاکٹر صلاح الدین صاحب کے پاس پہنچ گیا ہوگا، عزیزی سعید سلمہٗ آپ کے بعد چند دن ٹھہر کر لکھنؤ چلے گئے، امید ہے کہ اب وہ الٰہ آباد پہنچ گئے ہوں گے۔

والسلام

مخلص

ابوالحسن علی

۱۶ر رمضان ۱۳۹۷ھ

﴿۵﴾

محبّ گرامی منزلت زیدت مکارمہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابھی ابھی چند منٹ پہلے عزیزی عبدالرزاق کے معرفت تذکرہ مصلح الامت حصہ دوم پہنچا، اسی وقت اس کی ورق گردانی کی، ماشاء اللہ بڑا جامع وحاوی ہے انشاء اللہ وقتاً فوقتاً اس کا مطالعہ کروں گا اور فائدہ اٹھاؤں گا، صرف رسید دینی مقصود ہے، انشاء اللہ اور احباب بھی فائدہ اٹھائیں گے۔

اللہ تعالیٰ آپ سے ایسے اور بہت سے کام لے۔ حضرت مولانا کی خدمت میں ابھی ابھی پرتاپ گڈھ کے پتے پر خط لکھا ہے اللہ تعالیٰ مولوی سعید سلمہٗ کو کامل صحت عطا فرمائے عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔

والسلام

ابوالحسن علی

جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ، ۱۹۸۷ء

﴿۶﴾

محبّ گرامی جناب مولانا قمر الزماں صاحب زیدت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عنایت نامہ جو دستی بھیجا گیا تھا پہنچ کر موجب منت ہوا والد صاحب کے آپریشن کی وجہ سے آپ کا قیام الٰہ آباد میں ہی ضروری تھا الحمد للہ کہ آپریشن کامیاب ہوا میرا سلام پہنچا دیں۔ اور آپ مبارک باد قبول کریں۔ حضرت مولانا محمد احمد دامت برکاتہم کی ناسازی کی خبر سے تردد ہے، اللہ تعالیٰ ان کا سایۂ عاطفت تا دیر قائم رکھے کہ اب انہیں کا وجود بزرگان سلف کی یادگار ہے افسوس ہے کہ اپنے پاؤں کی تکلیف اور موسم کی سختی کی وجہ سے نیز بعض مجالس کی قریبی تاریخوں کی وجہ سے اس وقت حاضر خدمت نہیں ہو سکا۔ میرا سلام اور دعا کی درخواست پہنچا دیں۔

والسلام

دعا گو وطالب دعا

ابوالحسن علی

۱۴۱۱ھ ۱۰/مئی ۱۹۹۰ء

﴿ ۷ ﴾

محبّ گرامی منزلت زیدت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عنایت نامہ ملا ۔ میں مولوی سلطان الہدیٰ صاحب ندوی سے آپ کی خیرت دریافت کر لیتا ہوں ایک مرتبہ پوچھا تو کہا کہ وطن گئے ہوئے ہیں ابھی آئے نہیں ۔ پھر انہوں نے واپسی کی اطلاع دی اب آپ کا خیریت نامہ ملا خوشی ہوئی ۔ میرے کان میں کچھ باتیں پڑی تھیں کہ آپ کو کچھ مخالفت وتنقیدوں کا نشانہ بننا پڑا ہے ، یہ بات بڑوں بڑوں کے ساتھ پیش آتی ہے ، آپ ہمت اور توکل علی اللہ سے کام لیں اور اپنا کام جاری رکھیں اللہ تعالیٰ مخلصین ومتوکلین کے ساتھ ہے ۔

راقم ۲۲؍نومبر ۱۹۹۱ء کو کرناٹک کے ایک طویل دورہ پر گیا تھا ۴؍دسمبر ۱۹۹۱ء کو واپسی ہوئی صحت متاثر ہے اور کام بہت ، اس لئے اختصار سے کام لے رہا ہوں مولوی سعید سلمہٗ کو خط لکھیں تو میرا اسلام لکھ دیں مولوی محبوب کو بھی سلام کہہ دیں ان سے بھی دعا کی درخواست ہے ۔

مخلص

ابوالحسن علی ندوی ۱۴۱۲ھ دسمبر ۱۹۹۱ء

حضرت مولانا ندویؒ ہی ایک دوسرے مکتوب میں یوں رقمطراز ہیں کچھ باتیں ہمارے کان میں پڑی ہیں اللہ آپ کو اس آزمائش میں ثابت قدم رکھیں ، توکلاً علی اللہ اپنا کام کرتے رہئے نفع وضرر اسی کے ہاتھ میں ہے ۔ ۱۲/۲۸ ۱۹۹۱ء

﴿ ۸ ﴾

محبّ فاضل مکرم جناب مولانا قمر الزماں صاحب زادہ اللہ توفیقاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عنایت نامہ اور ہدیہ سامی ’’اقوال سلف‘‘ حصہ چہارم پہنچا ۔ یادآوری اور اس قیمتی ہدیہ کے لئے ممنون ہوں انشاء اللہ کتاب پر نظر ڈالی جائے گی اللہ تعالیٰ استفادہ کی توفیق عنایت فرمائے ۔

یہ معلوم ہوگیا تھا کہ آپ بھی لندن تشریف لے گئے ہیں امید تھی کہ وہاں ملاقات ہوگی اس بحر ظلمات میں آپ سے مل کر خوشی اور روشنی حاصل ہوتی مگر مقدر میں نہیں تھا ، آپ یہ مفید سلسلہ جاری رکھیں ، اللہ تعالیٰ باعثِ نفع وہدایت بنائے ، آمین ۔

والسلام

مخلص وطالب دعاء

ابوالحسن علی ندوی

۶/۴؍ ۱۴۱۵ھ ۹؍نومبر ۱۹۹۴ء

﴿ ۹ ﴾

محبّ گرامی منزلت جناب مولانا قمر الزماں صاحب زادہ اللہ توفیقاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عنایت نامہ دستی اس وقت ملا، جب سفر حیدرآباد کے لئے راقم بالکل پابرکاب تھا وہاں کے قیام میں بھی اسکی فرصت نہیں ملی کہ آپ کے یاد فرمانے کا شکریہ ادا کیا جائے۔

جن دنوں آپ غالباً لندن میں تھے، ہمارا بھی وہاں ایک ہفتہ قیام رہا لیکن کچھ پتہ نہیں چلا کہ آپ کا قیام کہاں ہے؟ اسلئے افسوس ہے ہندوستان میں بھی بہت عرصہ سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہوا اس کا خلا محسوس ہوتا تھا، ہمارا بھی الہ آباد آنا نہیں ہوا، ورنہ ضرور ملاقات ہوتی کتاب کے سلسلہ میں عرض ہے کہ آجکل صحت بہت کمزور اور متأثر ہے اور کاموں کی کثرت ہے چند دن کے بعد بعض طویل سفر بھی پیش ہیں میرے لئے ابھی کچھ لکھنے کا موقع ملنا مشکل ہے خدا کو منظور ہوگا تو یہ سعادت حاصل ہوجائیگی، آپ اس کام کو ضرور مکمل کرلیں ہمیں دعا میں یاد کرلیا کریں۔

والسلام

دعاگو ابوالحسن علی ندوی

۱۰/۶/ ۱۴۱۶ھ　　　۷/ نومبر ۱۹۹۶ء

﴿ ۱۰ ﴾

محبّ گرامی منزلت جناب مولانا محمد قمر الزماں صاحب زیدت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عنایت نامہ مؤرخہ ۶ ذی قعدہ ۱۴۱۶ھ کل دستی ملا، عزیز القدر مولوی سعید احمد ندوی سلمہٗ ووفقہ اللہ تعالیٰ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور ایک مناسبت اور موانست محسوس ہوئی، جس میں ان کے نسبی نسبتوں کا بھی دخل ہے اور طبعی وذہنی مناسبت کا بھی، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے۔ اور آپ اور ہم سب کے لئے وہ باعث شکر وافتخار ہوں، انہوں نے چلتے وقت ایک لفافہ بہت اصرار سے دیا، ہم نے مشغولیت میں بغیر کھولے رکھ لیا، بعد میں دیکھا تو اس میں ایک ہزار کی رقم تھی، اللہ تعالیٰ ان سے اپنی رضا کا کام لے، اور وہ اپنے خاندان اور بزرگوں کے لئے باعثِ مسرت وافتخار ہوں۔ ہمارے ضعف وعلالت کا سلسلہ ویسے ہی چل رہا ہے، دعا کی ضرورت ہے اہل تعلق سے دعا وسلام کہئے۔

والسلام

ابوالحسن علی ندوی

۹/۱۱/ ۱۴۱۶ھ

﴿۱۱﴾

محبّ گرامی منزلت جناب مولانا قمر الزماں صاحب زادہ اللہ توفیقاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا ۱۰؍شوال کا لکھا ہوا مکتوب انہیں دو چار دن کے اندر ملا، اس کے ساتھ کتاب بھی موصول ہوگئی اس کا نام[1] ہی دیکھ کر مسرّت ہوئی کہ یہ موضوع بہت اہم اور قابلِ توجہ تھا، ادھر رمضان المبارک کی مصروفیت، مہمانوں کی کثرت، اور دو اہم خاندانی حادثہ وفات نے ذہن کو بہت مشغول رکھا، اگر جواب میں تاخیر ہوئی ہو تو اس کو معاف فرمائیں گے خدا کرے الٰہ آباد اور لکھنؤ میں جلد ملاقات ہو ہماری صحت بھی بہت آج کل متاثر ہے۔

دعا فرمائے کہ اللہ تعالیٰ صحت وقوت عطا فرمائیں اور توفیق خیر دے۔

والسلام

دعا گو وطالب دعا

ابوالحسن علی ندوی

۱۹؍شوال ۱۴۱۶ھ ۱۰؍مارچ ۱۹۹۶ء

[1] ''تربیت اولاد کا اسلامی نظام'' یہ کتاب علامہ عبداللہ علوان شامی کی کتاب '' تربیۃ الاولاد فی الاسلام'' کے ترجمہ کی تلخیص ہے۔ (قمر الزمان)

﴿۱۲﴾

محبّ فاضل ومکرم جناب مولانا محمد قمر الزمان صاحب زادہ اللہ عملاً وتوفیقاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عنایت نامہ مورخہ ۲؍جمادی الثانی تاخیر سے نظر سے گذرا۔ بخیر واپسی کی خبر زبانی سنی تھی۔ اب آپ کا خط دیکھ کر مزید اطمینان ہوا۔ اس سے اور خوشی واطمینان ہوا کہ آپ کو راقم کی مختصر تحریر پسند آئی۔ جس سے حقیقت میں کتاب کا حق نہیں ادا ہوا تھا۔ یہ آپ کی محبت اور خلوص ہے۔

اللہ تعالیٰ کتاب کو زیادہ سے زیادہ مفید ومقبول بنائے۔ آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوگا تو بڑی خوشی ہوگی۔ اور بزرگان سلف کی یاد تازہ ہوگی۔

والسلام

دعا گو وطالب دعا

ابوالحسن علی

۱۰/۶/۱۴۱۸ھ ۱۳؍اکتوبر ۱۹۹۷ء

﴿۱۳﴾

محبّ فاضل گرامی مولانا محمد قمر الزمان صاحب زادہ اللہ توفیقاً وفضلاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عنایت نامہ مورخہ ۱۱؍صفر پہنچ کر باعث مسرت ہوا۔ آپ کے دوروں کی خبر سے خوشی ہوتی ہے، اور آپ کی ہمت وتوفیق پر رشک بھی آتا ہے۔ آپ ضرور باہر کی دعوتیں قبول کیا کریں، اللہ تعالیٰ زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائے۔

دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھیں۔

دعا گو وطالب دعا

ابوالحسن علی ندوی

۲۹؍جون ۱۹۹۸ء

﴿۱۴﴾

محبّ گرامی قدر مولانا محمد قمر الزمان صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

دو ہی تین دن ہوئے آپ کا کارڈ ملا جس میں آپ نے اپنے والد ماجد کی وفات کی اطلاع دی ہے، جو ۱۵؍رمضان ۱۴۱۹ھ کو واقع ہوئی، اس ماہ مبارک میں وفات خود ہی ایک بشارت اور فال نیک ہے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، ہماری طرف سے دلی تعزیت قبول کیجئے اور ہمیں بھی دعا میں یاد فرما دیجئے۔

والسلام

دعا گو وطالب دعا

ابوالحسن علی ندوی

۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ

﴿۱۵﴾

محبّ محترم وصدیق معظم مولانا محمد قمر الزمان صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عنایت نامہ ۲۹؍محرم دستی ملا، مسرت ہوئی، اور عزت ملی، آپ نے جس کتاب [1] کا ذکر کیا ہے وہ ہم نے خود بھی پوری نہیں پڑھی ہے شرم معلوم ہوتی ہے ہماری لاعلمی میں اور ہمارے تعاون اور اشارہ کے بغیر کتاب شائع ہوئی، اللہ تعالیٰ پردہ پوشی فرمائے، اور عزت رکھے۔

آپ نے بارگاہ رسالت میں اس ناچیز کا سلام پہنچایا اللہ تعالیٰ اس کی آپ کو جزا عطا فرمائے، اور درجہ بلند کرے ہماری طرف سے شکریہ قبول کیجئے اور دعا میں یاد رکھئے۔

والسلام

دعا گو وطالب دعا

ابوالحسن علی ندوی

۲۹؍محرم ۱۴۲۰ھ ۱۷؍مئی ۱۹۹۹ء

[1] اس سے مراد ''حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اکابر ومشاہیر امت کی نظر میں'' مؤلفہ مولانا ممشاد علی قاسمی ہے۔

﴿۱۶﴾

محبّ مکرم وعزیز گرامی زادہ اللہ توفیقاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ مورخہ یکم رمضان المبارک آج ۶؍رمضان کو ملا۔ یادآوری سے مسرت ہوئی صحت بہت کمزور چل رہی ہے، دوقدم بھی بلا سہارے چلنا مشکل ہے البتہ روزے کی توفیق ہورہی ہے اللہ قبول فرمائے، آپ کے بھروچ میں قیام کی خبر سے خوشی ہوئی، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت نفع پہنچائے گا آپ ہمیں بھی دعاؤں میں فراموش نہ کریں گے اللہ تعالیٰ کتابوں کی تکمیل فرمائے۔

والسلام

دعا گو وطالب دعا

ابوالحسن علی ندوی

بقلم محمود حسن حسنی

۶؍رمضان ۱۴۲۰ھ ۱۹۹۹ء لکھنؤ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس سرہٗ کا یہ آخری مکتوب گرامی ہے جو اس حقیر کے نام ارقام فرمایا۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء ونور اللہ مرقدہ۔

مقالات

سب سے پہلے ہم تکبیر مسلسل مؤلفہ ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی صاحب سے چند مقالات نقل کرتے ہیں جن سے مولانا کے ایمانی جذبہ اور دعوتی وتبلیغی داعیہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

میں آپ کا گریبان پکڑوں گا

’’میں دس باتیں حکومت سے شکایت کی کر سکتا ہوں، مجھے خدا کے فضل سے دنیا کی کسی حکومت سے سچی بات کہنے میں کوئی باک نہیں، اس لئے کہ مجھے کسی حکومت سے کچھ لینا دینا نہیں، لیکن میں غلط سمجھتا ہوں کہ ساری ذمہ داری حکومت کے سر ڈال دوں، یہ میرے ضمیر، میرے علم ومطالعہ اور دیانت داری کے خلاف ہے، جب مجھے حکومت ہی سے کہنا ہوگا تو مجھے وہ زبان آتی ہے اور میں اپنے اندر وہ جرأت پاتا ہوں کہ اس سے کہوں، لیکن جب آپ سامنے ہوں گے تو میں آپ کا گریبان پکڑوں گا۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ہم ہندوستانی مسلمان اتنے لاچار اور مجبور اور بے دست وپا ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو اپنے عقیدہ وایمان اور اپنی تہذیبی خصوصیات کے مطابق مسلمان باقی رہنے کا سامان نہیں کر سکتے۔‘‘ (تکبیر مسلسل ص/١١)

ہر حال میں مسلمان بن کر رہنا ہے

’’آپ کو اس ملک میں ہر حال میں مسلمان بن کر رہنا ہے، آپ جانوروں اور پرندوں کی طرح زندگی نہیں گذاریں گے جن کو راتب کا ملنا کافی ہے۔ ہم محض ’’راتب‘‘ پر اسی ملک میں نہیں، کسی عرب یا خالص مسلمان ملک کی سرزمین پر بھی رہنے پر تیار

نہیں جہاں ”راتب“ کے سوا ہم کو باعزت آزاد اور ضمیر وعقیدہ
کے مطابق زندگی گذارنے کی دولت میسر نہیں۔ میں خدا کی قسم
کھا کر کہتا ہوں کہ جس دن آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو ایمان
سب سے بڑھ کر عزیز ہے، ایمان کے بغیر بچوں کا جینا بھی آپ کو
مطلوب نہیں اسی وقت سے حالات میں تبدیلی آجائیگی اور مشکلات
کے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے۔“ (تکبیر مسلسل ص ۱۱۱)

ہندوستانی مسلمان

”ہندوستانی مسلمان خدا کے فضل سے اسلام میں خود کفیل
ہیں انہوں نے اپنا عقیدہ اور ایمان، اپنا جان و مال اسلام کے
دائمی اور غیر فانی مذہب اور تعلیمات سے وابستہ کیا، کسی قوم و ملک
حتیٰ کہ بلادِ عربیہ سے اور کسی عرب قوم سے بھی وابستہ نہیں کیا۔
انہوں نے محض اللہ کے بھروسے پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کو
اسلام اور اسلامی تعلیمات کو اپنے سینے سے لگائے رکھنا ہے، ہم
انشاء اللہ وحدتِ اسلامی اور شریعتِ اسلامی کا دم بھرتے رہیں
گے، ہم اسلامی اصولوں اور اسلام کے مسلکِ زندگی کے معاملہ
میں کسی قسم کا سودا کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔“ (تکبیر مسلسل ص ۴۹)

مسلمان کی دولت کی قیمت وافادیت

”کسی ملت کی انتہائی بدقسمتی ہے اور اس کی قسمت پر مہر لگی

ہوئی ہے جس کی حفاظت و بقاء کی کوئی تحریک محض اس وجہ سے
ناکام رہے یا سست رفتاری کے ساتھ چلے کہ ضروری مالی وسائل
اس کو فراہم نہیں، یا اس کے کارکنوں میں جوشِ عمل اور ولولۂ کار
نہیں، وہ شخص جس کا خدا اور رسولؐ پر ایمان ہے وہ یقین کرتا ہے
کہ مسلمان کی دولت کی قیمت وافادیت یہی ہے کہ وہ اسلام کے
کام آئے، نہیں تو وہ قارون کا خزانہ اور دنیا میں رسوائی اور آخرت
میں مؤاخذہ کا سامان ہے۔“ (تکبیر مسلسل ص ۱۳۲)

نشاں یہی ہے زمانہ میں زندہ قوموں کا

حضرات!

”قوموں کے سیاسی و تعلیمی تغیرات، قوموں کے اجتماعی و
باہمی تعلقات، انسانی زندگی کی افسردگی وزندہ دلی، زمانے کے
تیور، واقعات کے اشارے، مشکلات کے پہاڑ، وقت کے
دھارے، ان میں سے کوئی چیز بھی تقدیر الٰہی اور مشیت خداوندی
کے سامنے آخری مبرم اور لاعلاج وغیر تغیر پذیر نہیں، نصرت الٰہی
اور اہل ایمان کے اخلاص اور اہل یقین کے عزم وفیصلہ نے بارہا
ان میں تغیر وانقلاب پیدا کر دیا ہے، تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا
ہے، زندہ قوموں کی کوئی چیز آخری وابدی نہیں ہوتی، ایک زندہ
اور صاحب عزم قوم کی طرح ہندوستان میں اپنا مقام بنانے، اپنی

راہ نکالئے اور ہندوستان کو ایسا آزاد جمہوریہ بنانے کی کوشش کیجئے جو اس کے اعلان اور دستور کے مطابق اور آپ کے حالات اور ضروریات کے مناسب ہو۔ اپنے اس تعلیمی مسئلے کو اپنے ایمان و یقین، اپنے عزم وفیصلہ، جوش عمل اور ولولۂ کار سے حل کرنا ہے، اگر آپ نے اس کی شرطیں پوری کردیں تو ہر مشکل آسان اور ہر عقدہ حل ہے۔

نشاں یہی ہے زمانہ میں زندہ قوموں کا — کہ صبح وشام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمالِ صدق ومروت ہے زندگی ان کی — معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
خودی سے مردِ خودآگاہ کا جمال وجلال — کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں
حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں

(تکبیر مسلسل ص/۲۰۴)

دستور کی حفاظت کا فریضہ ہم انجام دیں گے

''یہ ہندوستان ہمارا ملک اور وطن ہے، اس ملک پر ہمارا وہی حق ہے جو کسی بڑے اور قدیم شہری کا ہے، ہندوستان کا کوئی متنفس اس کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ کسی کا حق اس ملک پر ہمارے حق سے زیادہ ہے، صدر سے لے کر بڑے سے بڑے ذمہ دار ہندوستانی کا اس سرزمین پر جو حق ہوسکتا ہے، وہی ہمارا حق ہے۔

ہم کو یہ ملک عزیز ہے، ہم اس کے اور اس کے جمہوری دستور کے محافظ ہیں اور اس دستور کی آبرو کے محافظ ہیں۔ ہم اس دستور اور آئین کے خلاف کوئی بے اعتدالی، کوئی بے اصولی، کوئی سازش برداشت نہیں کرسکتے، اگر پورے ملک میں کوئی ایک انسان بھی یہاں کے دستور وآئین کی حفاظت کرنے والا، اس کی عزت قائم رکھنے والا اور اس کی طرف سے لڑنے والا نہ ہوگا تو ہم یہ فرض انجام دیں گے اور اس کے لئے سینہ سپر ہوجائیں گے۔''

(تکبیر مسلسل ص/۲۰۶)

ناواقفیت ایک بڑا نقص اور محرومی ہے

''اپنے ہاتھوں سے اپنی تاریخ کے اوراق کو چاک کیا جارہا ہے یا ان پر سیاہی پھیری جارہی ہے اور اس طرح ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا خلا پیدا کیا جارہا ہے جو صدیوں کو محیط ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم ہندوستان کے اس دور کو نمایاں اور ان کارناموں کو اجاگر کریں، ہم مطالبہ کریں کہ جدید تعلیم ونصاب تعلیم میں عہد قدیم کی تاریخی شخصیتوں کے ساتھ ازمنۂ وسطیٰ کی ان تاریخی شخصیتوں کو بھی جگہ دی جائے جو ہندوستان کے لئے قابل فخر اور نوجوانوں کیلئے قابل تقلید ہیں اور جن سے ناواقفیت ایک بڑا نقصان اور محرومی کی بات ہے۔'' (تکبیر مسلسل ص/۲۱۴)

نا انصافی اور وطن دشمنی

''اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت وتہذیب کا ایک دور گذرا ہے جو چھ سات سو برس کی طویل مدت ہے، یہ ہندوستان کی تہذیب وترقی کا ایک شاندار دور ہے جس کو ہندوستان کی تاریخ سے خارج کرنا اس ملک کے ساتھ بڑی نا انصافی اور وطن دشمنی ہے، اس دور میں ملک کی ترقی وشادابی کے بہت سے ایسے کام ہوئے جن سے ہمارا ملک ابھی تک فائدہ اٹھا رہا ہے اور صدیوں تک فائدہ اٹھائے گا، اس زمانہ کے بہت سے نقش ایسے ہیں جو ہمارے ملک کی خوبصورتی اور ناموری کا باعث ہیں، اس دور میں ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں جن پر ساری دنیا اور پوری انسانیت کے سامنے اس ملک کو فخر کرنے کا حق ہے اور جن سے ساری دنیا میں اس ملک کی عظمت قائم ہے۔''

(تکبیر مسلسل ص/۲۷۰)

قیامت میں بہت سی بچیاں اور بچے اپنے والدین کے خلاف دعویٰ دائر کریں گے

''اگر جدید تعلیم یعنی یہ جو تعلیم ہمارے ملک میں ۱۹۴۷ء کے

بعد شروع ہوئی ہے اگر اس راستہ پر کسی نے اپنے بچہ کو ڈالا اور اس کی دینی تعلیم وتربیت کا الگ سے کوئی انتظام نہ کیا اور جو زہر اس کو پہنچایا جا رہا ہے اس کے لئے اس نے تریاق مہیا نہ کیا تو وہ بالکل اس آیت کے ماتحت آئے گا ﴿قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ بلکہ ایک دوسری آیت قرآن مجید کی ہے کہ اگر کوئی کہے کہ ہم نے کب اپنے بچے سے کہا تھا کہ کافر ہوجاؤ، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿رَبَّنَا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلاَ﴾ وہاں پر جو کچھ لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! اے ہمارے مالک! ہم نے تو اپنے بڑوں اور اپنے بزرگوں کی بات مانی، انہوں نے ہم کو کہیں کا نہ رکھا، ﴿اَضَلُّوْنَا السَّبِيْلاَ﴾ انہوں نے ہم کو گم کردہ راہ کردیا، اب بتایئے! کیا انہوں نے کہا تھا کہ کافر ہوجاؤ؟ کیا انہوں نے کہا تھا کہ مشرک ہوجاؤ؟ کیا انہوں نے ان کو اٹھا کر دونوں بازو تھام کر کفر کے غار میں ڈھکیل دیا تھا؟ ایسا تو شاید کبھی نہ ہوا ہو، اور ایسا تو کسی زمانہ میں بھی نہ ہوا ہوگا، اور ایسا مشکل سے ہی ہوتا ہے۔

انہوں نے ان کی طرف سے غفلت برتی، انہوں نے ان کی دینی تعلیم وتربیت کا کوئی انتظام نہ کیا، کہنے والوں میں لاکھوں بچے ہوں گے، لاکھوں اولاد ہوں گی، ان بڑوں کی جو اپنے والدین کے خلاف خدا کی عدالت میں دعوے دائر کریں گے اور

وہاں پر یہ مرافعہ کریں گے کہ اے اللہ! قصور ہمارا نہیں، ہمارا قصور تو بہت کم تھا، ہم تو پیچھے چلنے والے تھے، ہم تو اپنے بزرگوں اور اپنے والدین کی انگلی پکڑ کر چلنے والے تھے، انہوں نے جو ہم کو سکھایا وہ ہم نے سیکھا، انہوں نے جو ہم کو پڑھادیا وہ ہم نے پڑھا، انہوں نے جو ہم کو بننے دیا وہ ہم بنے، ہم تو کچی مٹی تھے، ہم تو ایک نرم شاخ تھے، ہم تو ایک ایسی چیز تھے جس کو جس سانچہ میں ڈھالا جائے وہ اس کے نقش قبول کرلے، جیسے آپ اینٹ دیکھتے ہیں کہ اس کو جب سانچہ میں ڈھالا جاتا ہے تو اس پر نقش پڑجاتے ہیں، اس کے اوپر نمبر پڑجاتے ہیں، اب جب وہ پک کر نکلتی ہے تو آپ کہیں کہ اس پر یہ نقش کس نے کردیئے، تو آپ دیکھئے کہ وہ تو ایک کچی مٹی تھی، ایک نرم مٹی تھی، اس کو سانچہ میں ڈھالا گیا تو اس نے اس نقش کو قبول کرلیا تو اس میں اینٹ کا کیا قصور؟!

اسی طرح سے آج جو تعلیم ہمارے اسکولوں میں ابتدائی درجوں سے دی جارہی ہے، اس ساری تعلیم میں کثرت سے وہ اجزاء شامل ہوتے ہیں، وہ عناصر ہوتے ہیں کہ اگر بچہ ان کو قبول کرلے تو وہ مسلمان نہیں رہ سکتا ہے، مگر وہ کیسے نہ قبول کرے! کیا علم اس لئے سکھایا جاتا ہے کہ بچہ اس کو قبول نہ کرے! کیا علم اس لئے ہے کہ بچہ اس کو پڑھ کر بھلادے! اس کو تو کوئی بھی شخص اچھا

اور جائز نہیں سمجھتا ہے، اور اس کا تو کوئی بھی روادار نہیں ہوسکتا۔"

(تکبیر مسلسل ص۲۸۲/ ۲۸۲ تا ۲۸۴)

نظامِ تعلیم کی بنیاد

"آج حال یہ ہے کہ جتنا پڑھا لکھا انسان ہے اتنا ہی وہ ڈرنے کے قابل ہے، آج پوری دنیا میں پڑھے لکھے بھیڑیوں کا راج ہے، ایسے بھیڑیوں کا جو دوسرے کے جسموں سے کپڑے اتار لیتے ہیں تاکہ اپنی دیوار کو پہنائیں، جو دوسروں کے بچوں اور یتیموں کے آگے سے کھانا اس لئے چھین لیتے ہیں تاکہ ان کے کتوں کا پیٹ بھر سکے، بددیانتی، خودغرضی، مطلب پرستی، نفس پرستی پر آج کے پورے نظامِ تعلیم کی بنیاد ہے۔"

(تکبیر مسلسل ص/۳۰۶)

ایک نہایت بلیغ جملہ

"میں آپ کے سامنے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ایک جملہ پیش کرتا ہوں جس کا حق یہ ہے کہ وہ چھوٹا سا جملہ بہت سی تقریروں اور خطبوں پر بھاری ہے اور وہ اس قابل ہے کہ اگر میرا بس چلے تو میں نہایت خوش نما جلی حرفوں میں لکھ کر ہر گھر میں تقسیم کراؤں اور اس کو آویزاں کرادوں کہ ہر ایک کی نظر ہر وقت اس پر پڑتی رہے۔"

وہ جملہ یہ ہے:

" اینقص الدین و انا حی"

یعنی میں زندہ رہوں اور دین میں کمی واقع ہو جائے ،ایسا نہیں ہوسکتا۔ (تکبیر مسلسل ص ۳۳۶)

ہم ایسی زندگی گذارنے پر ہرگز تیار نہیں

''ہم نے اس ملک میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور چند روز نہیں بلکہ خوب سوچ سمجھ کر مستقل رہنے کا فیصلہ کیا ہے، یہ بھی نہیں کہ ہم یہاں نئے ہیں، ہم نے اس ملک میں صدیوں تک رہنمائی کا فریضہ حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا ہے، یہاں کے ایک ایک ذرّے سے ہمارا تعلق اور اس پر ہمارا حق ہے، ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے لئے ایسا پنجرہ تیار کیا جائے جس کی تیلیاں سونے کی ہوں، سونے چاندی کے برتنوں میں لذیذ کھانا ملتا رہے لیکن آزادیٔ فکر وعمل نہ ہو، اپنے بچوں کو اپنے مذہب اور عقائد کی تعلیم دینے کی آزادی نہ ہو، ہم ایسی زندگی گذارنے پر ہرگز تیار نہیں۔'' (تکبیر مسلسل ص ۳۸۶)

ہر مسلمان کے لئے سب سے بڑی فکر

''حضرت یعقوب علیہ السلام بستر مرگ پر تھے، خدا سے

ملنے میں شاید چند لمحوں کا فاصلہ رہا ہو، اس وقت ان کو سکون نہیں تھا، انہوں نے اپنی اولاد کو بلا کر یہ تصدیق کر لینی چاہی کہ ان کے بعد اولاد کی زندگی اور ان کا طرز عمل کیا ہوگا، اس کے بغیر شاید ان کی روح کو قرار نصیب نہ ہوتا۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴾ (البقرۃ /۱۳۳)

کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آیا تب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تم کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کے معبود اور آپ کے آباء واجداد ابراہیم واسماعیل اور اسحٰق کے معبود کی عبادت کریں گے جو اکیلا معبود ہے اور ہم اس کے سامنے سر جھکاتے رہیں گے۔

اور جب بیٹوں نے اس کا یقین دلا دیا کہ ان کے بعد وہ انہیں کے طریقے اور دین حق کی پیروی کرتے رہیں گے تو ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا، ان کی روح کو سکون حاصل ہو گیا اور آخرت کا سفر آسان ہو گیا۔

ایک مسلمان کو مرتے وقت جس بات کی سب سے زیادہ فکر ہوتی ہے اور جس کی ضمانت اور اطمینان چاہتا ہے وہ یہی کہ اس

کے مرنے کے بعد اس کی اولاد اس کی صحیح جانشین ہو، اس کے مذہب اور اس کی تہذیب کی امین ہو، اور اس کے افکار وعقائد کا تسلسل باقی رہے، دنیا کے تمام مفکروں نے اسے ایک اہم حق کے طور پر تسلیم کیا ہے، یہ ایک فطری جذبہ ہے کہ بیٹا باپ کا صحیح جانشین اور اس کا نمائندہ ہو، عہد افلاطون سے لے کر آج کے مہذب دور تک سب نے باپ کا یہ حق تسلیم کیا ہے، کسی نے یہ حق چھینا نہیں اور دنیا کا جو نظام قائم ہے اور اس کی ہم رنگی چلی آرہی ہے، اولاد آدم، آدم سے باغی نہیں ہورہی ہے، اس کی وجہ یہی ہے ،اس نظام کو ڈھانا بہت بڑا ظلم ہے۔

(تکبیر مسلسل ص ۳۹۹)

بچہ باپ کے عقائد وافکار کا بھی وارث ہے:

''کسی کو یہ حق نہیں کہ باپ اور بیٹے کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو جائے، اور دانستہ یا نادانستہ ایسے اقدامات کرے کہ بچہ باپ کا وارث نہ ہونے پائے، یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ بچہ باپ کی جائیداد کا وارث تو ہو، لیکن اس کے عقائد جو اسے مال و دولت سے کہیں زیادہ عزیز ہیں، ان کا وارث نہ ہو، یہ ہر باپ کا فطری حق اور اس کا مذہبی فریضہ ہے کہ وہ اطمینان کرلے کہ اس کے افکار وعقائد کا تسلسل باقی رہے گا یا نہیں؟

(تکبیر مسلسل ص ۳۹۹)

ہمارا طریقۂ کار اور جدوجہد

''جب ہم نے ہندوستان کے حالات کا جائزہ لیا تو ہمارے ذہن پر بہت بڑا بوجھ پڑا، جب سے حکومت نے تعلیم کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور یہ تصور کام کرنے لگا ہے کہ باپ اپنے بیٹے کو تعلیم نہ دے بلکہ حکومت اس کو تعلیم دے، اس وقت سے اس فکری تسلسل کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے جو قدیم زمانہ سے چلا آرہا تھا اور اسی نے ہمیں اور ہمارے رفقاء اور احباب کو مجبور کیا کہ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کے لئے جدوجہد کریں، یہ مسئلہ ہماری مذہبی زندگی میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے، ہم نے کسی وہم یا جذباتیت کی بناء پر یہ کام نہیں شروع کیا، نہ اس سے کوئی سیاسی مفاد وابستہ ہے، بلکہ یہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے اور اگر ہم اپنی ذمہ داری پوری نہ کرسکے تو خدا کے سامنے مجرم ہوں گے۔''

(تکبیر مسلسل ص ۴۰۰)

تعلیم کا چراغ بے تیل بتی کے جل سکتا ہے

''تعلیم کا چراغ بے تیل بتی کے جل سکتا ہے، بادِ صرصر کے جھونکوں میں اور طوفان کے تھپیڑوں میں فروزاں رہ سکتا ہے اور تعلیم کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہمت والوں اور انسانیت کا درد رکھنے والوں نے برسوں بے تیل بتی کے اپنا چراغ روشن رکھا، انہوں

نے پیٹ پر پتھر باندھ کر مسلسل فاقے کر کے بغیر کسی عمارت کے، درختوں کے نیچے بیٹھ کر جنگلوں اور بیابانوں میں، کڑاکے کے جاڑوں کی راتوں میں، تپتی ہوئی دوپہروں میں تعلیم دی ہے اور بڑے بڑے عالم، مصلح اور معلم پیدا کئے، ان کی حیرت انگیز قوتِ عمل کی بنیاد یہ تھی کہ وہ انسان کو دستِ قدرت کا شاہکار سمجھتے تھے۔" (تکبیر مسلسل ص/۵۱۶)

حکومت کی بنیاد تین چیزوں پر

"حکومت کی بنیاد تین چیزوں پر ڈالی گئی تھی، جمہوری، نامذہبی اور غیر متشدد، جن کو یہ خیال آیا وہ بڑے دانشور اور اس ملک کے بڑے خیر خواہ تھے، واقعہ یہ ہے کہ اس ملک کی بقاء انہیں تینوں اصولوں کی پابندی پر منحصر ہے، یہ ملک فوجی حیثیت سے، مالی حیثیت سے اور کسی پروپیگنڈہ کی حیثیت سے کتنا ہی ممتاز اور سربلند ہو جائے، یہ ملک باقی نہیں رہ سکتا اس کے لئے تقدیر الٰہی کا فیصلہ یہ ہے کہ یہاں پر مذاہب رہیں گے، قومیں رہیں گی، تہذیبیں رہیں گی، کلچر اور ثقافتیں رہیں گی۔ ہندوستان کی پرانی تاریخ یہی بتاتی ہے، یہ ملک عزت کے ساتھ، سلامتی کے ساتھ، ہم آہنگی کے ساتھ اور سہولت کے ساتھ اس وقت تک رہے گا جب تک ان تین چیزوں کی پابندی کی جائے گی، یہ ملک ان تین چیزوں کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا، اس لئے یہاں ملت اسلامیہ

کے خلاف جو جارحانہ قدم اٹھایا گیا ہے وہ مسلمانوں سے زیادہ اس ملک کو نقصان پہنچانے والا ہے۔" (تکبیر مسلسل ص/۵۸۴)

ملت کو زمانہ کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا

"ایک ایسی ملت کو جس کی زندگی کا اتنا بلند معیار ہو ایک ایسے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کے حوالہ نہیں کیا جا سکتا اور زمانہ کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا جس میں اس کی تکمیل کا نہ صرف یہ سامان نہیں بلکہ بعض اوقات ان مقاصد سے متصادم ہے، اس کے لئے مسلمانوں کو ایسا ہی انتظام کرنا ہوگا جیسے ان کو اپنی نمازوں اور دینی فرائض کی ادائیگی کے لئے معابد ومساجد اور روح وجسم کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لئے ضروریات زندگی کا انتظام کرنا پڑتا ہے اور اس سلسلہ میں وہ کسی حکومت کی امداد کا انتظار نہیں کرتے ....اس کے لئے ان کو صباحی وشبینہ مکاتب کا ایک ایسا جال بچھا دینا ہوگا جس سے کوئی قریہ اور کوئی محلّہ محروم نہ رہے۔" (تکبیر مسلسل ص/۶۲۶)

☆......ف : ان مقالات کا بغور مطالعہ کرنا چاہئے بلکہ اپنی اولاد واحباب کو سنانے کا اہتمام کرنا چاہئے تاکہ تعلیم دین کی اہمیت پیدا ہو اور جذبۂ عمل میں ابھار ہو۔

واللہ الموفق (مرتب)

انتخابات از

دو مہینے امریکہ میں

اس سفر امریکہ میں حضرت مفکر اسلامؒ کی معیت حضرت مولانا محمد رابع صاحب ندوی مدظلہ کو نصیب ہوئی جنھوں نے دورۂ امریکہ کی مفصل داستان آسان اور دلنشیں پیرایہ میں ضبط فرما دیا ہے، فجزاھم اللہ تعالیٰ

کانفرنس کا اختتامی اجلاس اور کشمکش کا باعث موضوع

ساڑھے آٹھ بجے کے بعد کانفرنس کے کئی اجتماعات تھے، ان میں مہمانوں کی طرف سے تأثرات پیش کرنے کے لئے ایک اجتماع دس بجے تھا اور آخر میں دعا پر بارہ بجے کانفرنس کا اختتام تھا، ہم لوگ ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ ہال میں پہنچے، وہیں یہ جلسہ ہو رہا تھا، اس جلسہ میں اردن کے یوسف العظم، الجزائر کے رشید عیسیٰ، قطر کے یوسف القرضاوی مصری، کویت کے عبدالحلیم محمد احمد، حجاز سے استاذ محمد المبارک اور بعض دوسرے حضرات نے اظہار خیال کیا، یوسف القرضاوی نے بہت اچھی تقریر کی، یوسف العظم کی تقریر بھی متوازن تھی، البتہ رشید عیسیٰ نے اپنی تقریر میں سید قطب کی اہمیت بہت گھٹائی اور ان کو بالکل غیر اہم افراد کی فہرست میں شامل کیا اور مولانا مودودی کو مبالغہ کے ساتھ غیر معمولی درجہ دیا، ان کے اس گھٹانے بڑھانے نے جلسہ میں ایک اضطراب پیدا کر دیا، ریاض کے ایک صاحب نے صدر سے اجازت لے کر اس تقریر کا جواب دیا۔ (دو مہینے امریکہ میں، ص/۸۵)

مولاناؒ کی سخت تقریر

تنقید وافراط وتفریط اور جرح وتعدیل کی یہ غیر ضروری فضا جو طلباء کی ایک

انٹرویو کمیٹی یا ایکزامنیشن بورڈ سے زیادہ مشابہ تھی، مولانا مدظلہ کو بہت گراں گذری اور جب تک یہ سلسلہ جاری رہا ان کو سخت تنغص اور انقباض رہا، جب ان کو تقریر کا موقع ملا تو انہوں نے عربی میں اس پوری صورت حال پر تنقید وتبصرہ کیا، انہوں نے اپنی تقریر میں اسلام کی خدمت کرنے والوں کے درمیان تقابل کرنے کے اس رویہ کو بہت غلط قرار دیا اور اس بات پر زور دیا کہ ''وہ شخصیتیں جو ہمارے سامنے ہیں اور ہماری معاصر ہیں ان کے بارے میں مبالغہ آمیز عقیدت یا نامناسب تحقیر کا ایسا رویہ اختیار کرنا یہ دعوت کا کام کرنے والوں کے لئے بالکل نامناسب ہے، اس وقت جبکہ مسئلہ اسلام کے بچانے اور اس کو پھیلانے کا درپیش ہے، ہم شخصیتوں کی تقدیس یا تقابل میں مشغول ہیں'' اور کہا کہ ''ان شخصیتوں سے آپ جن خیالات و افکار کی بنا پر ایسا تعلق قائم کرلیتے ہیں انہوں نے بارہا اپنے افکار سے رجوع کرلیا ہے،'' مولانا مدظلہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی سنایا کہ ''**من کان منکم مستنا فلیتسن بمن قد مات فان الحی لاتؤمن علیہ الفتنة**'' (تم میں سے جس کو اقتداء کرنی ہو وہ ان کی اقتدا کرے جو ایمان کے ساتھ اس دنیا سے چلے گئے، اس لئے کہ جو شخص زندہ ہے اس کے متعلق اطمینان نہیں کہ وہ کس وقت فتنہ میں مبتلا ہوجائے گا یا اس سے محفوظ رہے گا) مولانا مدظلہ نے کہا کہ قرآن مجید اور سیرت رسول علیہ السلام کا مطالعہ سب سے زیادہ بے خطر اور قابل اعتماد ذریعہ ہے، ہم دعوت کے کام کرنے والوں کو امت کے متأخرین کی کتابوں سے اشتغال سے زیادہ قرآن مجید اور سیرت رسول علیہ السلام کے مطالعہ سے شغف ہونا چاہئے، اس میں کسی خلفشار اور فتنہ کا اندیشہ نہیں، مجھے افسوس

ہوتا ہے کہ آپ نے اتنا وسیع اجتماع کیا، اتنے دور دور سے لوگوں کو بلایا، اتنا صرف کیا، اور پھر اس کا یہ حاصل ہے کہ کون مفکر بڑا اور کون چھوٹا اور کون اچھا ہے اور کون برا، ہم یہاں اس لئے جمع نہیں ہوئے ہیں کہ معاصر شخصیتوں کا جائزہ لیں اور ان کے درجات کا تعین کریں، یہ کوئی ایکزامنیشن بورڈ نہیں جو فیل پاس کرے یا امتحان میں شرکت کرنے والوں کو ڈویژن دے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ قرآن وحدیث اور سیرت رسول کو اصل معیار اور سرمایہ بنائیے اور اس سے تعلق بڑھائیے، آپ کی عظیم ذمہ داریوں میں یہ کام دے گا، یہ امریکہ کا ملک جو اسلامی دعوت کا پیاسا ہے اس کو اس کی ضرورت نہیں کہ موجودہ زعماء میں کون کس مقام کا ہے؛ اس کو اس وقت ضرورت ہے کہ وہ یہاں سے نئی طاقت، ایمان کی حلاوت اور عمل کا جذبہ لے کر جائے اور اس کو اسلام کے اصل سرچشموں قرآن وحدیث، سیرت نبوی اور سیر صحابہؓ کے مطالعہ کا شوق ہو۔

حضرت مولانا رابع صاحب مدظلہ اس کے بعد یوں رقمطراز ہیں:

مولانا مدظلہ کی تقریر جوش وتأثر سے بھری ہوئی تھی، لوگ بھی دم بخود تھے اس لئے کہ کانفرنس کے پروگراموں میں عام طور پر علمی جائزے اور تاریخی مطالعے پیش کئے جارہے تھے، مؤثر اور پرجوش تقریروں کی کمی تھی، تنہا اس تقریر نے اس کمی کو دور کیا اور دلوں میں ایک نئی حرکت وحرارت پیدا ہوئی، مجھے اندیشہ تھا کہ مبادا اس تقریر کا سخت ردعمل نہ ہو؛ اور لوگ اتنی صاف گوئی سے کبیدہ خاطر نہ ہوں لیکن چونکہ یہ تقریر خلوص اور اندرونی جذبہ سے کی گئی تھی اور اس میں ساری دعوت قرآن وسیرت کے مطالعہ کی دی گئی تھی جس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اس لئے تقریر کا کوئی

برا اثر نہیں پڑا اور اس کی تردید یا پہلے موقف کے دفاع میں کچھ کہا نہیں گیا۔

ہارورڈ یونیورسٹی میں مولانا کی تقریر

ہارورڈ یونیورسٹی ایک مشہور اور مؤقر یونیورسٹی ہے۔ اس کے کتب خانہ میں ایک کروڑ کتابیں ہیں اور اسلامیات پر بہت اچھا اور قیمتی ذخیرہ ہے، بعد عصر ہم لوگ اس کے دیونٹی ہال میں پہنچے، مدثر حسین نے جلسہ کو کنڈکٹ کرتے ہوئے مولانا مدظلہ کا تعارف کرایا، اسکے بعد مولانا مدظلہ نے تقریر کی۔

جلسہ کا افتتاح ایک امریکی نژاد بلالی مسلمان نے سورہ ''والتین'' کی قرأت سے کیا۔

امریکہ کا حال زار

مولانا مدظلہ نے ان ہی آیات کو امریکہ پر منطبق کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ بھی احسن تقویم اور اسفل سافلین کا جامع ہے، وہ طبعی وقدرتی، علمی وصنعتی حیثیت سے احسن تقویم کا مظہر ہے اور اس لحاظ سے وہ ساری دنیاوی ترقی میں بام عروج پر ہے، لیکن اخلاقی وروحانی حیثیت سے وہ اسفل سافلین میں ہے۔ انہوں نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ کی یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ مذہب اس کے حصہ میں عیسائیت آیا جو اس کی بے چین اور متجسس طبیعت کی رہنمائی اور اس میں ضبط و اعتدال پیدا کرنے سے قاصر بلکہ علم وترقی کے لئے سدراہ تھی، وہ انسان کو پیدائشی گنہگار ثابت کرتی ہے، جس کی نجات کفارہ اور فدیہ کے بغیر نہیں ہوسکتی، اس طرح

وہ انسان میں بے اعتمادی و مایوسی پیدا کرتی ہے، اس کی وجہ سے بقیہ عیسائی دنیا کی طرح امریکہ نے بھی اپنے کو مذہب سے آزاد کرلیا اور اپنی جدوجہد کا میدان خالص مادی ترقی کو قرار دیا۔ ایک ایسے ملک کے لئے اسلام موزون ترین مذہب تھا، وہ دین ودنیا کا جامع ہے۔ لیکن اس ملک کی بدقسمتی اور مسلمانوں کی تبلیغ ودعوت میں کوتاہی کہ وہ اس دولت سے محروم رہا اور ہے۔ مولانا نے اس مضمون کو بہت تفصیل سے بیان کیا اور مسلمان نوجوانوں اور مشرقی فضلاء کو جو اس یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں اور جن کی ایک بڑی تعداد اس موقع پر موجود تھی، ان کی ذمہ داری یاد دلائی اور بتایا کہ وہ کس طرح یہاں اس سبق کو یاد دلا سکتے ہیں اور واپس جاکر اپنے ممالک کی صحیح رہنمائی کرسکتے ہیں، تقریر کا ترجمہ مزمل حسین صدیقی نے انگریزی میں کیا۔

مولاناؒ کی ایک اور تقریر دل پذیر

سات بجے شام کو مولانا مدظلہ کی تقریر تھی جو گویا اس کانفرنس میں ان کی بنیادی تقریر تھی اس کا موضوع تھا '' اسلامی دعوت کے کام کرنے والوں کے مابین تعلقات''

مولانا مدظلہ نے اس موضوع میں جو عمومیت اختیار کی جس کی اجازت پہلے سے حاصل کرلی تھی کہ عنوان کی لفظی پابندی نہ کریں گے، تقریر اردو میں ہوئی اس کے بعد اس کا ترجمہ انگریزی میں پیش ہوا۔

مولانا مدظلہ کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور اس کے غلبہ اور

فروغ کے لئے جدو جہد کرنے والوں کے درمیان خواہ وہ کسی ایک تنظیم سے تعلق رکھتے ہوں یا مختلف تنظیموں اور جماعتوں سے؛ محبت و یگانگت اور خلوص وگرم جوشی کسی خارجی یا مصنوعی طریقہ یا ضابطۂ اخلاق سے پیدا نہیں کی جاسکتی اس کے لئے عقیدہ کی وحدت اور مقصد کا عشق ہونا ضروری ہے جو ہر طرح کی انانیت اور نفسانیت کو مغلوب کردے۔ مولانا نے اس کے لئے عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ کی تاریخ سے مثالیں پیش کیں۔ پھر بتایا کہ عقیدہ کی وحدت اور مقصد کا عشق کس طرح بیدار ہوتا ہے اور اس کے لئے کیا تدابیر مؤثر ہیں۔ تقریر میں عقلی وعلمی استدلال کے ساتھ قلب کو متأثر کرنے والا عنصر بھی شامل تھا، اس لئے تقریر بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنی گئی، اور لوگوں نے نعرۂ تحسین کے ساتھ بار بار اس پر اپنے تأثر کا اظہار کیا۔

اس سے قبل عربوں کیلئے ضمنی تقریر

اس عام تقریر سے قبل، بعد عصر مولانا مدظلہ کی ایک قیمتی تقریر عربوں کیلئے بھی ہوئی کیونکہ کل سے آج تک ان کا پروگرام صرف اردو ہی کا تھا، اس تقریر میں مولانا نے فرمایا کہ مناسب تو یہ تھا کہ یورپ و امریکہ کے نوجوان اپنی علمی ترقی اور نہ صرف علوم اسلامی بلکہ علوم انسانی کے مطالعہ کیلئے عرب ومسلم ممالک کا رخ کرتے اور علمی پیاس بجھانے والوں کا دھارا مغرب سے مشرق کی طرف بہتا جیسا کسی زمانہ میں اسپین میں نظر آتا تھا جب اندلسی عرب علمی وفکری قیادت کے منصب پر فائز تھے، لیکن ہمارے علمی و سیاسی زوال نے اور مغرب کی بیداری نے معاملہ

برعکس کردیا ہے، اور اب بہترین مسلم اور عرب نوجوان بڑی تعداد میں یورپ و امریکہ کی جامعات اور دانش گاہوں میں مطالعہ وتکمیل کیلئے آتے ہیں اور یہ مجمع اس کی شہادت دے رہا ہے، لیکن کم سے کم اتنا ضرور ہونا چاہئے کہ آپ ان علوم اور مغربی تہذیب وتمدن کا ناقدانہ مطالعہ کریں اس کی خامیوں سے واقف ہوں، اس میں اپنی شخصیت کو تحلیل نہ ہونے دیں اور جب اپنے ملک واپس جائیں تو وہاں کے نوجوانوں پر ان علوم وتہذیب کا جو رعب قائم ہو چکا ہے اور وہ جس احساس کمتری کے شکار ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کریں اور بتائیں کہ تم اس کے دور کے تماشائی ہو اور ہم اس کے سمندر میں غوطہ لگا کر آئے ہیں، نیز وہ اپنی ان صلاحیتوں سے اپنے ملکوں کی خدمت وصحیح رہنمائی کریں۔

(دو مہینے امریکہ میں، ص:۷۹تا۸۱)

☆......ف : ماشاء اللہ عربوں کو کیسی اہم ومفید ہدایت فرمائی جو آب زر سے نقش قلوب کئے جانے کے لائق ہے، کہ ''ان علوم اور مغربی تہذیب وتمدن کا ناقدانہ مطالعہ کریں اس کی خامیوں سے واقف ہوں، اس میں اپنی شخصیت کو تحلیل نہ ہونے دیں۔ بلکہ اپنی ان صلاحیتوں سے اپنے ملکوں کی خدمت اور صحیح رہنمائی کریں۔'' مگر افسوس کہ اب تک اس کا کوئی اثر نمایاں نہ ہوا بلکہ ان بدمعاشوں کی تہذیب وتمدن سے عربوں کی مرعوبیت ہی نہیں بلکہ اس کی محبوبیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ العیاذ باللہ

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

☆☆☆

انتخابات

از

المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ

یعنی امیر المؤمنین سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی مفصل سوانح حیات، مستند کتب تاریخ، ناقابل انکار واقعات وحقائق اور تجزیاتی وتقابلی مطالعہ کی روشنی میں۔

مربی ومصلح حضرت علی کرم اللہ وجہہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کوئی انتظامی امور کے حاکم اعلیٰ یا اس طرح کے عرفی خلیفہ نہیں تھے، جیسے اموی وعباسی خلیفہ تھے، بلکہ وہ شیخین (حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) کے انداز ونہج کے خلیفۃ المسلمین تھے، مسلمانوں کے حقیقی معنوں میں ولی الامر، معلم، مربی اور عملی مثال قائم کرنے والے، اخلاقی ودینی امور کی نگرانی اور احتساب کرنے والے تھے، لوگوں کے رجحانات وخیالات اور تصرفات پر نظر رکھتے کہ وہ کس حد تک اسلامی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے مطابق ہیں، اور کہاں تک اسوہ سے دور اور منحرف، اور کس حد تک انہوں نے مغلوب اقوام اور مفتوحہ علاقوں کی تہذیب وتمدن کا اثر قبول کیا ہے، آپ؛ لوگوں کو نماز پڑھاتے، ان کو نصیحتیں فرماتے، دین کے مسائل بتاتے اور دین کا فہم ان کے اندر پیدا کرتے، ان کو بتاتے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے کیا چاہتا ہے، اور کن باتوں کو ناپسند فرماتا ہے، آپ مسجد میں بیٹھتے، لوگ آپ کے پاس آیا کرتے، اپنے

معاملات میں مشورے لیتے، کوئی دینی مسئلہ پوچھتا تو اس کو بتاتے، دنیاوی امور میں صلاح ومشورہ دیتے، بازاروں میں چلتے پھرتے کاروباری لوگوں کی نگرانی کرتے کہ کس طرح خرید وفروخت کرتے ہیں، ان کو نصیحت فرماتے اور کہتے:

''اللہ سے ڈرو اور ناپ تول کا پورا پورا لحاظ رکھو، لوگوں کا حق نہ مارو۔''

اپنی ذات کے معاملہ میں انتہائی محتاط تھے، اپنے منصب اور خاندانی برتری کا مطلقاً استحصال نہیں کرتے تھے، اگر بازار سے کوئی چیز خریدنا ہوتا تو دوکانداروں اور بیچنے والوں میں سے ایسے دوکاندار یا بائع کو تلاش کرتے جو آپ کو پہچانتا نہ ہو اور اسی سے سودا خریدتے، اس کو سخت ناپسند کرتے کہ کوئی تاجر آپ کے ساتھ اس لئے رعایت کرے کہ آپ امیر المؤمنین ہیں، اس بات کی پوری کوشش کرتے کہ لوگوں کے درمیان اپنے قول، عمل اور برتاؤ میں اور اپنی مجلسوں میں مساوات قائم رکھیں، اور اپنے کارندوں اور عاملوں سے اس طرح کا مطالبہ کرتے اور علاقوں کے حاکموں سے بھی اسی کی توقع رکھتے، ان حکام کی سخت نگرانی کرتے اور کبھی کبھی اچانک معائنہ کرنے والوں کو بھیجتے کہ وہ جاکر دیکھیں کہ حکام کا عوام کے ساتھ کیا سلوک ہے، اور عوام کی ان حکام کے بارے میں کیا رائے ہے؟ آپ کے مقرر کردہ کارندوں اور حکام پر آپ کی ہیبت تھی، اور اگر ضرورت پڑتی تو مجبوراً فہمائش اور عتاب سے بھی کام لیتے، آپ کے وہ مکاتیب جو ان حکام اور کارندوں کے نام ہیں، اس طرز عمل کے شاہد ہیں۔

امیر المؤمنین اپنے کارندوں اور حکام سے صرف قانونی حدود ہی میں محاسبہ نہیں کرتے یا صرف شرعی وفقہی احکام پر اکتفاء نہیں کرتے تھے، ان کے اخلاق وسیرت پر بھی نظر رکھتے، اگر دیکھتے کہ ان کی سیرت واخلاق خدا ترس والیوں کی

سیرت واخلاق سے مختلف ہے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدین کے طرزِ عمل کے خلاف ہے تو اس پر بھی محاسبہ کرتے۔

اسی سلسلہ کا واقعہ ہے کہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو اطلاع ملی کہ بصرہ پر ان کے مقرر کردہ عامل عثمان بن حُنیف ایک دعوت میں مدعو کئے گئے، جب وہاں گئے تو ان کا خیر مقدم اور خاطر داری زیادہ کی گئی، اور اسلامی مساوات کو اس دعوت میں ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا، جب امیر المؤمنین کو اس کی خبر ملی تو ایک مکتوب بھیجا جس میں تحریر فرمایا:

> ''اما بعد، اے ابن حُنیف! مجھے معلوم ہوا ہے کہ بصرہ کے لوگوں میں سے کسی نے تمہاری دعوت کی اور تم بعجلت وہاں پہنچے، تمہارے لئے رنگ برنگے اور بڑے بڑے طشت بھرے کھانے پیش کئے گئے، تم نے یہ نہیں سوچا کہ تم نے ایسے لوگوں کی دعوت قبول کی ہے جن کے یہاں غریب، عیال دار افراد نظر انداز کئے جاتے ہیں، اور مالدار لوگ بلائے جاتے ہیں، سوچ لو اس طرح کی دعوتوں میں جو تم چباتے ہو، وہ کیا ہے؟ اس میں اگر کوئی مشتبہ مال ہے تو اس کو حلق سے اترنے نہ دو، اور جس کے پاک ہونے کا یقین ہو اس کو شوق سے تناول کرو۔''

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خوبیاں

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں بہت سی ایسی خوبیاں تھیں جن سے ان کی اسلام اور مسلمانوں سے محبت کا پتہ چلتا ہے، اور یہ کہ وہ دینی ڈھانچہ کو باقی رکھنا چاہتے تھے، اور اس کا دفاع کرتے تھے، ان کی دور بینی اور انتظامی امور میں حکمت کے علاوہ ان کے اندر دین کی حمیت اور اسلام اور مسلمانوں کی مصلحتوں کو اگر ضرورت پڑے تو ترجیح دینے کا بھی جذبہ تھا، ان کا ایک کارنامہ اس موقع پر قابل ذکر ہے، جس سے

ان کی بلندی کردار اور دین کی حمیت کا پتہ چلتا ہے، جس کو بہت سے مؤرخین نے ذکر کیا ہے جس میں ابن کثیر بھی ہیں، ابن کثیر نے لکھا ہے:

> ''شہنشاہ روم نے حضرت معاویہؓ کو ملانے کی خواہش ظاہر کی چونکہ ان کا اقتدار رومی سلطنت کیلئے خطرہ بن چکا تھا، اور شامی فوجیں اس کی افواج کو مغلوب کر کے ذلیل کر چکی تھیں، اس لئے اس نے جب یہ دیکھا کہ معاویہؓ، علیؓ سے جنگ میں مشغول ہیں وہ بڑی فوج کے ساتھ کسی قریب کے ملک میں آیا اور معاویہؓ کو لالچ دی، تو حضرت معاویہؓ نے اس کو لکھا:
>
> بخدا اگر تم نہ رکے، اور اے لعین اگر تو اپنے ملک واپس نہ گیا تو ہم اور ہمارے چچازاد بھائی (علیؓ) دونوں آپس میں مل جائیں گے اور تجھ کو تیرے تمام قلمرو سے خارج کر دیں گے، اور روئے زمین کو (اس کی وسعت کے باوجود) تجھ پر تنگ کر دیں گے، یہ سن کر بادشاہ روم ڈر گیا اور جنگ بندی کی اپیل کی۔''

یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ حضرت معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ عنہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے ایک ممتاز فرد ہیں، ان کے مناقب میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں، جو لوگ ان پر زبان طعن دراز کرتے ہیں اور ان کے سلسلہ میں بے باکی و زبان درازی سے کام لیتے ہیں، ان کو اس امر کا پاس و لحاظ ہونا چاہئے کہ وہ ایک ایسے صحابی ہیں جن کو قرابت کا شرف بھی حاصل ہے۔

اُس وقت کے اسلامی معاشرہ پر ایک نظر

یہ اختلافات جن کا ذکر ناظرین کی نظر سے گذرا اور جن کے نتیجہ میں خوں ریز

معرکہ آرائیاں ہوئیں، افسوس اور دلی رنج کیساتھ ان کی کہانی سنانے کے بعد ایک حقیقت کا اعتراف کرنا اور ایک پہلو پر روشنی ڈالنا بھی ضروری ہے، وہ یہ کہ سب جنگیں اور اختلافات جو رونما ہوئے، وہ ارباب حکومت وقیادت اور امراء وحکام اور ان کی افواج تک محدود تھے، لیکن جہاں تک اسلامی معاشرہ کا تعلق ہے، جو سرزمین وحی ورسالت سے لے کران آخری حدود تک قائم تھا جو اسلام کے زیرنگیں آگئی تھیں، وہ معاشرہ یا وہ جماعتیں جو اس کی تشکیل کرتی تھیں، سب دین پر عامل تھیں، فرائض و واجبات کی پابند تھیں، سنت پر عمل پیرا ہونے کا اس عہد کے بھی مسلمانوں کے اندر جذبہ تھا اور جو باتیں قرآن وسنت سے ثابت ہیں، ان پر کاربند رہنے کا شوق تھا، دینداروں، محدثین، فقہاء، فتاویٰ واَحکام بتانے والے علماء کا ان کے دلوں میں احترام تھا، اسلامی شعائر کو بالادستی حاصل تھی، جمعہ اور جماعت کا اہتمام تھا، حج کی ادائیگی کے اوقات اور اس کے شعائر میں سرمو اختلاف کی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، اور وہ ایک امیر کی سرکردگی میں انجام دیا جاتا، جسکو خلیفہ (صاحب حکومت) مقرر کرتا، جہاد پورے زور شور سے جاری تھا، قرآن کریم کی تلاوت سے فضا گونجتی تھی، دل اس کی آیات سے نرم ہوتے تھے، آنکھیں ان سے تر رہا کرتی تھیں، دین اور احکام شریعت میں کوئی تحریف نہیں ہوئی تھی۔

اسلامی معاشرہ اپنی کمزوریوں اور خرابیوں کے باوجود اس وقت کے تمام دوسرے مسیحی، یہودی، مجوسی اور برہمنی معاشروں سے اللہ کی طرف مائل ہونے، خشوع وخضوع، آخرت کے محاسبہ کے خوف اور مرنے کے بعد آنے والی زندگی کے یقین کے معاملہ میں فائق وممتاز معاشرہ تھا، کھلے بندوں فواحش، فسق وفجور کے مظاہروں، مادّہ پرستی اور مال ومتاع کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کا

رجحان اس معاشرہ میں پیدا نہیں ہوا تھا، ایسا نہیں تھا کہ سب کے سب صرف نفع اور لذت اندوزی کی ترازو پر ہر شئی کو تولتے، یہ سب نتیجہ تھا، اس کتاب اللہ کا جو کسی تحریف کو قبول نہیں کرسکتی تھی، اور نہ اس کو ضائع کیا جاسکتا تھا، اور یہ سب نتیجہ تھا، احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوۂ نبوی کے مذاکروں کا، خلفاء راشدین کی سیرتیں، صحابۂ کرام کے احوال، شہداء ومجاہدین کی سوانح حیات کے پڑھنے پڑھانے اور سننے سنانے کا، مزید یہ کہ ایسے اللہ کے داعی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے ہر دور میں موجود رہے جو معاشرہ کو اسلامی نہج پر سنبھالے رہے، خشیت الٰہی رکھنے والے اور دنیا کو حقیر سمجھنے والے (زاہد اور متورّع) برابر موجود رہے، قلوب پر اسلام کی روحانی سطوت ہمیشہ قائم رہی، یہ سب اسلئے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو باقی رکھنے کا فیصلہ فرما چکا ہے، اور یہ امت جو اللہ کی طرف بلانے والی ہے قیامت تک رہے گی:

اِنا نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون (سورۂ الحجر/۹)	بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔
وکذلک جعلنکم امة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شهیدا، (سورۂ بقرہ/۱۴۳)	اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (آخرالزماں) تم پر گواہ بنیں۔

قرآن کریم اس امت کے بارے میں بقاء کا ضامن ہے اسلئے کہ اس دین کا

کوئی بدل نہیں ہے، اور اس لئے کہ مسلمان ہر زمانہ میں دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے خلاء کو پر کرتے ہیں، اور اسلئے کہ وہ عقیدہ وعمل کے لحاظ سے دوسروں سے بہتر ہیں، اللہ نے ان کے ان دشمنوں کو جو ہمیشہ ان کی تاک میں رہے غالب نہیں ہونے دیا، عیسائی اقتدار وسلطنت (جس کا مرکز قسطنطنیہ تھا) اور یورپ کا عیسائیت کا حلقہ بگوش براعظم اس کوشش میں رہا کہ مسلمانوں کو آپس کی جنگوں میں مشغول رکھ کر اور ان کی سیاسی آویزشوں سے فائدہ اٹھا کر ان ملکوں کو جو مسلمان فتح کر چکے تھے، اور جن پر پہلے، صدیوں سے عیسائی قابض تھے، جیسے شام، مصر، اور شمالی افریقہ کے بعض ممالک، ان سب کو دوبارہ عیسائی اپنے اثر ونفوذ میں لینے کیلئے کوشاں رہے مگر کامیاب نہ ہو سکے، اور اپنا سیاسی وفوجی دباؤ نہیں ڈال سکے۔

مؤرخ ابن جریر الطبری ۳۵ھ کے حوادث کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اس سال ہرقل کے فرزند قسطنطین نے ایک ہزار کشتیوں کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کا ارادہ کیا، اللہ نے اس کی فوج پر ایک طوفانی عذاب نازل کر دیا جس سے وہ اپنی تمام تر قوتوں اور اسلحہ کے ساتھ غرق کر دیا گیا، سوائے بادشاہ اور ایک معمولی سی ٹولی کے، جو اس کے ساتھ تھی، اس کی جماعت میں کا کوئی بچ نہ سکا، اور جب وہ صقلیہ (سسلی) میں داخل ہوا تو اس کیلئے ایک حمام تیار کیا گیا، جس کے اندر جب وہ داخل ہوا تو لوگوں نے قتل کر دیا اور کہا: تو نے ہمارے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ ہم تجھے انتقاماً اسی انجام کو پہنچاتے ہیں۔'' (المرتضیٰ ص: ۳۲۸ طبع سوم)

☆...... ف : ماشاء اللہ حضرت مولاناؒ نے کیا ہی خوب مضمون تحریر فرمایا اور دونوں اکابر صحابہ کے بارے میں کتنا معتدل کلام فرمایا ہے۔ (مرتب)

ایمان افروز تحریر

از مقدمہ

طوفان سے ساحل تک

اسکی روئیداد یہ ہے کہ ایک مغربی سیاح لیوپولڈ ویس جن کا اسلامی نام بعد میں محمد اسد ہوا جنہوں نے بلاد عربیہ کی سیاحی کی اور ممالک مشرق کا سفر طے کیا۔ گہرائی اور حقیقت پسندی سے ہر چیز کا مطالعہ کیا۔ توفیق الٰہی نے ان کی دستگیری کی اور وہ مشرف باسلام ہوئے۔

چنانچہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمۃ نے ان کی کتاب ''طوفان سے ساحل تک'' کے پیش لفظ اور تعارف میں چند اوراق تحریر کرنے کے بعد ان کے حالات وخصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اسلام لانے کا واقعہ اس طرح ذکر کیا ہے اور بجا طور پر اس شعر کا مصداق ہے۔

حفاظت جس سفینہ کی انہیں منظور ہوتی ہے
کنارے تک اسے خود لا کے طوفاں چھوڑ جاتے ہیں

(مرتب)

دماغ کی اس گرہ کو جو فلسفیانہ وکلامی طریقہ پر سلجھانے کی کوششوں سے شاید اور الجھ جاتی ایک تجربہ اور واقعہ نے (جو محض ہدایت الٰہی اور تربیت ربانی کی کرشمہ سازی تھی) کھولدیا اور قرآن مجید کا کلام الٰہی اور معجزۂ آسمانی ہونا

لیو پولڈویس کے لئے ایک بدیہی حقیقت بن گیا جس کے لئے مزید دلیل اور بحث کی ضرورت نہ تھی، یہ ایک نفسیاتی انقلاب تھا جو اچانک پیش آیا۔

لیو پولڈویس نے ٹرین کے ایک سفر میں جرمنی کے مرفہُ الحال طبقہ اور کامیاب تاجروں اور خوش باش اور تندرست آدمیوں کی ایک جماعت دیکھی جن کا لباس اور سامان ان کی خوشحالی، معاشی بلندی اور خوش قسمتی کی شہادت دیتا تھا، لیکن ان کے اترے ہوئے مغموم چہرے، ان کی اُداس صورتیں، ان کی پھیکی اور بناوٹی مسکراہٹ اس کا پتہ دیتی تھی کہ ان کو اندر سے کوئی غم کھائے جارہا ہے، اور وہ کسی ایسے روحانی کرب میں مبتلا ہیں جس کا ان کی مرفہُ الحالی تجارت کی ترقی اور سامان عشرت کی فراوانی کے پاس بھی کوئی علاج نہیں، آخر ان کے پاس کس کی کمی ہے؟ اس روحانی کرب اور دل کے ناسور کا سرچشمہ کیا ہے؟ ان کی زندگی میں یہ تضاد کیوں ہے؟ وہ جنت (ارضی) میں رہنے کے باوجود جہنم کی اذیتوں سے کیوں دو چار ہیں؟ ان کا اصل مرض کیا ہے جو گھن کی طرح ان کو کھا رہا ہے؟ لیو پولڈویس کے دل میں اس معمہ کو حل کرنے اور ''پہیلی'' بوجھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی!

گھر واپس آکر اچانک ان کی نظر قرآن مجید پر پڑتی ہے، وہ اس کو بلا ارادہ کہیں سے کھول کر پڑھنے لگتے ہیں، قرآن تشخیص کرتا ہے کہ اس ''خوشحال بے چینی'' کا سبب اس طبقہ اور اس دور کا مرض ''تکاثر'' زیادہ دولتمند اور کامیاب بننے کی ہوس اور ھل من مزید کی ذہنیت اور نعرہ ہے، اس انقلاب انگیز انکشاف پر انہوں نے جو حیرت و مسرت محسوس کی اس کو خود ان کی زبان سے سنئے:

''میں ایک لمحہ کے لئے گم سم سا ہو گیا، مجھے یاد آتا ہے کہ یہ کتاب میرے

ہاتھ میں جنبش میں تھی، پھر میں نے اپنی بیوی سے کہا، دیکھو سنو! کیا یہ اس کا جواب نہیں ہے، جو رات کو ہم نے ریل پر دیکھا تھا۔

ہاں! وہ ایسا قطعی جواب تھا کہ سارے شکوک وشبہات ایک دم سے ختم ہو گئے۔ اب میں نے یقینی طور پر سمجھ لیا کہ یہ کتاب جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے، خدا ہی کی نازل کی ہوئی ہے، وہ اگرچہ آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک انسان کو عطا کی گئی تھی، لیکن اس میں بہت وضاحت کے ساتھ ایک ایسی چیز کی پیش گوئی تھی، جو ہمارے اس پیچیدہ اور مشینی دور سے زیادہ واضح طور پر کسی اور دور میں سامنے نہ آئی تھی، ''تکاثر'' یعنی مال و دولت کی حرص و ہوس اور مسابقت تاریخ کے ہر دور میں پائی جاتی رہی ہے۔ لیکن اتنی کبھی نہیں کہ وہ محض اشیاء کو جمع کرنے کا شوق بن جائے یا ایک ایسا کھلونا اور بہلاوا بن جائے جو کسی اور حقیقت کی طرف دیکھنے ہی نہ دیتا ہو، دولت اور اقتدار کا حصول، ایجادات کا ایسا روز افزوں عشق جس کا کوئی علاج نہیں، کل سے زیادہ آج اور آج سے زیادہ کل، ایک بھوت ہے، جو لوگوں کے سروں پر سوار، ان کو ایسے چمکیلے مقاصد کی طرف کوڑے مار مار کر بھگا رہا ہے، جو دور سے بہت شاندار معلوم ہوتے ہیں لیکن ہاتھ میں آنے کے بعد حباب کی مانند غائب ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ وقت آجاتا ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے: ﴿**کلا لو تعلمون علم الیقین لترون الجحیم**﴾

اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ قرآن کسی انسان کی حکمت و دانائی کا نتیجہ نہیں، جو ایک دور دراز جزیرۃ العرب میں تاریخ کے کسی دور میں تھا، اس لئے کہ یہ انسان لاکھ سمجھدار، حکیم اور دانا سہی، مگر پھر بھی وہ اس عذاب کی پیشین گوئی نہیں کر سکتا تھا، جو

بیسویں صدی کی خصوصیت ہے، مجھے قرآن کے اندر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ اونچی اور گہری آواز سنائی دے رہی تھی۔"

گرہ کھل گئی تھی، اور اب کسی اور چیز کا انتظار باقی نہ تھا، لیوپولڈ ویس نے برلن میں اپنے ایک ہندوستانی مسلمان دوست کے پاس جا کر کلمۂ شہادت پڑھا اور اب وہ "محمد اسد" کے نام سے اس امت اور اس عالم کا جز بن گئے جس کی اس معجز نظام کلام اور محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری نبوت اور تعلیم نے بنیاد ڈالی تھی اور جوان کو پہلے سے عزیز اور مانوس تھا۔

محمد اسد نے اپنے وجود اور دلچسپیوں کو اس امت کے وجود اور دلچسپیوں اور اس عالم کے مسائل وافکار میں اسی طرح ضم کر دیا جیسے ایک خاندان کا فرد اپنے وجود اور شخصیت اور صلاحیتوں کو اس خاندان کے وجود، دلچسپیوں اور مسائل میں ضم کر دیتا ہے، انہوں نے ذوق وشوق کے ساتھ حج وزیارت کا سفر کر کے اس دین کے ساتھ اپنا روحانی ارتباط اور وابستگی مستحکم کی، جزیرۃ العرب میں ایک مسلمان کی حیثیت سے قیام کر کے عربی زبان اور دینیات اور اسلامی معاشرہ سے اپنی واقفیت اور تعلق کو بڑھایا۔ اور اس معاشرہ اور اس کے ذمہ دار افراد سے اتنا گہرا تعلق اور ان کا ایسا اعتماد حاصل کیا کہ سلطان ابن سعود کے معتمد اور امام سنوسی کے قاصد کی حیثیت سے نازک مہمیں انجام دیں، ہندوستان کے قیام میں انہوں نے (ISLAM AT THE CROSSROADS) کے نام سے ایک ایسی پر مغز اور فاضلانہ کتاب لکھی جس سے ہندوستان (اس وقت تک پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا) اور عالم اسلامی کے علمی ودینی حلقوں میں ایک ذہنی جنبش پیدا ہوگئی، انہوں نے پہلی

مرتبہ معذرت آمیز اور نیازمندانہ طرز تحریر چھوڑ کر مغربی تہذیب پر پُر اعتماد طریقہ پر بھر پور تنقید کی، اور ثابت کیا کہ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کی بنیادوں اور نقطۂ آغاز میں اختلاف ہے، اور ان دونوں کا اتحاد ممکن نہیں، اسی کے ساتھ انہوں نے "سنت وحدیث" کی طرف سے طاقتور وکالت کی اور اسلامی نظام زندگی میں ان کی اہمیت اور ضرورت ثابت کی، راقم السطور کی ملاقات ان سے پہلی مرتبہ مکہ معظّمہ میں اور دوسری بار دمشق اور لبنان میں ہوئی جہاں وہ اپنی اس شہرۂ آفاق کتاب کا عربی ترجمہ "الطریق الی مکہ" اپنی نگرانی میں کرا رہے تھے، جب ترجمہ طبع ہوا تو انہوں نے از راہ کرم ایک نسخہ مجھے بھی بھیجا۔

بعض وجوہ سے ایک عرصہ تک میرے اندر اس کتاب کے مطالعہ کا تقاضہ اور شوق پیدا نہیں ہوا۔

لیکن جب مجھے ایک سفر کی فرصت میں کتاب کے عربی ترجمہ الطریق الیٰ مکہ کو بالاستیعاب پڑھنے کا موقع ملا، تو میں مصنف کی نفسیات شناسی، بالغ نظری اور حکمت دعوت کا قائل ہوگیا کہ انہوں نے اسلام کی دعوت ایسے حکیمانہ انداز میں دی ہے کہ یہ کتاب مغرب کے باشندوں اور ہندوستان کے غیر مسلموں کے لئے اسلام اور اسلامی تہذیب کے سمجھنے کے لئے اچھی تقریب بن گئی ہے۔

"مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" کے کارکنوں کو مسرت ہے کہ اس پر مغز اور بیش قیمت کتاب کا پہلی بار اردو ترجمہ وانتخاب پیش کر رہے ہیں، حالات کی تبدیلی کے باوجود اس کتاب کی علمی ودینی قدر وقیمت اور طاقت باقی ہے، مشرق ومغرب کی دیرینہ کشمکش میں اگرچہ فاتح واقبال مند مغرب نے مشرق کی ان

خصوصیات کو بہت حد تک مغلوب کر لیا ہے، جن کی بنا پر وہ مغرب کی بے چین و ''مادیت بیزار'' روحوں کا مامن اور صدیوں تک امن واطمینان کا نشیمن رہا ہے، عرب کی ایمانی حرارت اور زندگی کی سادگی اور لطافت اور بقول مصنف کتاب ''اس کی خلوت پسندی اور پاکیزگی کو تیل کے سنہرے دھارے بہالے گئے'' مصنف کتاب نے جس ''حسین ومعصوم'' دنیا کی دلکش تصویر پیش کی ہے، اور جس نے ان کو ''دین فطرت'' کی طرف متوجہ اور پھر اس کا حلقہ بگوش بنایا اب محدود سے محدود تر ہوگئی ہے، لیکن اطمینان ومسرت کی بات یہ ہے کہ اس ''حرارت ولطافت'' کا سرچشمہ محفوظ ہے، اسلام خود اپنی ایک دنیا ہے جس میں مشرق ومغرب، عرب و عجم، قریب وبعید اور قدیم وجدید کی کوئی تقسیم نہیں، مشرق ومغرب کی سرحدیں اور عرب وعجم کے امتیازات کبھی صفاتِ الٰہی کی طرح ازلی وابدی نہ تھے جو کوئی تغیر قبول نہ کرسکیں، خدا کا بے لاگ قانونِ فطرت ایک کو ایک دوسرے پر اثر انداز اور غالب کرتا رہا ہے، اور کرتا رہے گا، خدا کے آسمانی پیغام اور دینِ انسانیت کا انحصار کسی ملک اور تہذیب پر نہیں ہے، اسلام مشرق کے واسطہ اور عرب کی احتیاج کے بغیر بھی اپنی رحمت کا سایہ مغرب پر ڈال سکتا ہے، دین حق کی منزل کے لئے ایک راستہ نہیں، صرف طلبِ صادق اور عزم راسخ کی ضرورت ہے، اگر آج مشرق کی وہ آسودگی اور عرب کی وہ سادگی خواب وخیال ہوگئی ہے، جو محمد اسد کے لئے اسلام کی طرف کشش کا باعث بنی تھی تو کوئی غم کی بات نہیں کہ اس آسودگی، اس سکینت و اطمینان اور اس یقین وایمان کا منبع اور مرکز موجود اور محفوظ ہے، مشرق بھی فانی ہے اور مغرب بھی فانی، مشرق کا سکون واطمینان بھی فانی ہے اور مغرب کا اضطراب

و بے اطمینانی بھی فانی، یہاں جو کچھ ہے زمانی اور مکانی عارضی اور فانی، ابدی و ازلی صرف ایک ذات ہے، اس کے فیض کا چشمہ ہر زمانہ میں جاری اور اس کی ہدایت کا سلسلہ ہمیشہ باقی ہے، اس نے انسانوں کی ہدایت کے لئے جو کتاب بھیجی تھی، اور انسانیت کے لئے نمونہ بننے کے لئے جس ذات (روحی فداہ) اور جس زندگی کو انتخاب کیا تھا ان کی رہنمائی اب بھی موجود ہے سچی پیاس رکھنے والوں کے لئے خواہ وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے، عرب کے ہوں یا عجم کے، چین کے ہوں یا ہندوستان کے اب بھی یہی صدائے غیب آرہی ہے کہ ۔

ہنوز آں ابرِ رحمت دُر فشان است
خم وخم خانہ با مہر و نشان است

ابوالحسن علی ندوی

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام
ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۹؍ربیع الاول ۱۹۸۰ء

☆......ف : سبحان اللہ مذہب اسلام پر کس قدر بصیرت افروز مضمون ہے جو ہر شخص کے پڑھنے کے لائق ہے تا کہ ایمان میں جلاء پیداء ہو، اپنے دین پر اعتماد اور ثبات میں اضافہ ہو، چنانچہ اس حقیر کو اس مضون کے پڑھنے سے بہت اثر ہوا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان کا کمال اور اطمینان نصیب فرمائے۔ واللہ الموفق

(مرتب)

امت کی مایۂ ناز شخصیت

یہ اس حقیر کا تعزیتی بیان ہے جو خانقاہ کنتھاریہ بھروچ گجرات میں ۲۳؍رمضان ۱۴۲۰ھ کی شب میں بعد نماز تراویح کیا گیا ہے، جب کہ ابھی حضرت مولاناؒ کی تدفین بھی نہ ہوئی تھی، اس کے بعد ۲۴؍رمضان کی شب میں ہوا، جو ٹیپ کرلیا گیا تھا، پھر اس کو مولانا محمد یونس صاحب ابن مکرم قاری بندہ الٰہی صاحب (حال مقیم برطانیہ) نے کسی عالم کے ذریعہ کاغذ پر منتقل کرایا، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر مرحمت فرمائے۔ آمین

اس کے بعد حذف واضافہ کے ساتھ مؤقر رسالہ ''الشارق'' میں شائع ہوا، اب اس کو ''نقوش وآثار مفکر اسلامؒ'' میں شامل کیا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ مثل حضرت مولانا ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین و مقالات کے اس کو بھی امت کیلئے مفید بنائے۔ آمین

☆☆☆

امت کی مایۂ ناز شخصیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِيَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لاَشَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلاَنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ،وَ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً ،

أَمَّا بَعْدُ ! قَالَ النَّبِيُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ : اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ ، (مشکوٰۃ)

دوستو اور بزرگو! میرا خیال ہے کہ آپ سبھی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ امت کی ایک مایۂ ناز شخصیت، عالم ربانی، شیخ حقانی وروحانی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی کی وفات ہوگئی، اس دنیا سے رحلت فرماگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون،

ان کی موت اور ان کی ذات واقعی بالکل اس مثل کی مصداق ہے کہ ''**موت العالِم موت العالَم**'' عالم کی موت عالم کی موت ہے، مجھے یاد آتا ہے کہ کسی

خاص موقع پر حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ اس لائق ہیں کہ ان کو ''امیر المؤمنین'' کہا جائے، یقیناً اللہ تعالیٰ نے مختلف نوع کی صلاحیتیں ان کے اندر جمع فرمادی تھیں، علمی بھی، عملی بھی، حالی بھی، نسبی بھی، صورت وشکل کے اعتبار سے بھی اور حسن سیرت کے لحاظ سے بھی، غرض ہر جہت سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر بہت سی قابل تعریف باتیں جمع فرمادی تھیں، بیک وقت سبھی بزرگوں سے ان کا تعلق رہا ہے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی تشریف لے گئے، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی رہے، بلکہ ان سے استفادہ بھی کیا، ادھر حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی رہے بلکہ ان کے خلیفہ بھی ہوئے، ادھر بھوپال کے نقشبندی بزرگ شاہ یعقوب صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ عرف ننھے میاںؒ کی خدمت میں بھی جاتے رہے، ان کے ملفوظات بھی لکھے، ادھر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی خاص تعلق رکھا، مزید حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خاص تعلق اور آمد ورفت کا سلسلہ قائم فرمایا، غرض وقت کے سبھی بزرگوں سے خصوصی تعلق ونسبت رکھتے تھے۔

چونکہ آپ اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالب تھے، ان کی خوشنودی کے خواہاں تھے اس بناء پر جس گلی میں ان کو اللہ کی محبت کی بو آتی تھی وہاں جاتے تھے، جس در کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ وہاں ہم کو اللہ کی رضا ملے گی وہاں تشریف لے جاتے تھے۔

اللہ کی رضا کا مقام

چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اللہ کی رضا کے لئے اگر مجھ کو ہزار در پر جانا پڑے گا تو میں جاؤں گا، کیا اللہ کی رضاء معمولی چیز ہے!؟ اللہ کی خوشنودی معمولی چیز ہے!؟

غور فرمایئے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رضاء ہی تو سب کچھ ہے، مقامات سلوک میں سب سے عالی مقام رضاء ہی کا ہے، اکابر علماء نے فرمایا ہے کہ صوفیہ کے مقامات میں سب سے عالی اور بڑا مقام رضاء ہی کا مقام ہے، صحابۂ کرامؓ کو رضاء کا مقام حاصل تھا، جو حال بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا وہ راضی اور اللہ تعالیٰ بھی ان کے اعمال صالحہ اور ان کی عبادات خالصہ سے راضی ہوئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے: ﴿رَضِيَ اللّٰـهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ﴾ اللہ ان سے راضی ہوا وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

مشہور مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی بغرض استفادہ تشریف لے گئے تھے، بلکہ ان کی طرف سے خلعتِ خلافت سے بھی مشرف ہوئے، آپ کے ابتدائی اساتذہ میں سے ایک استاذ حضرت مولانا خلیل بن محمد یمنی بھی تھے جو بہت زبردست عالم اور صاحب حال بزرگ تھے، خود مولانا لکھتے ہیں کہ نماز فجر جب پڑھاتے تھے تو ان پر اس قدر گریہ و بکاء طاری ہوتا تھا کہ کوئی سورت وہ پوری نہیں پڑھ پاتے تھے، ان کی خدمت میں مولانا سالہا سال رہے، ان سے قرآن کریم پڑھا اور ان کو سنایا بلکہ ان کے باطنی

حال وکیف سے متأثر ہوئے بلکہ بہرہ ور ہوئے۔

مولانا کو بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ نے خاص صلاحیت عطا فرمائی تھی، چنانچہ کم عمری ہی میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تشریف لے گئے، حضرت مولانا تھانویؒ کو پہلے سے معلوم تھا کہ فلاں دن مولانا علی میاں صاحب آنے والے ہیں اس لئے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ان کی آمد کے منتظر تھے، ادھر مولانا علی میاں خانقاہ تھانہ بھون پہنچ کر حضرتؒ کی مجلس میں بیٹھ گئے مگر آپ کو حضرت مولانا تھانویؒ پہچان نہ سکے، دورانِ مجلس حضرت مولانا تھانویؒ نے پوچھا بھائی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے بھائی (یعنی مولانا علی میاں) لکھنؤ سے آنے والے تھے وہ نہیں آئے؟ تو مولانا نے فرمایا میں حاضر ہوں اور آگے بڑھ کر حضرت مولانا تھانویؒ سے مصافحہ کیا۔

یقیناً آپ سادات میں سے تھے، حسنی اور حسینی تھے، اللہ تعالیٰ نے شرافت بھی دی تھی سیادت بھی تھی، علم بھی دیا تھا عمل سے بھی نوازا تھا، غرض اللہ تعالیٰ نے بہت سی نعمتوں سے نوازا تھا۔ **ذلک فضل اللّٰہ یؤتیه من یشآء**

الحمدللہ آپ کی تصنیفات بہت ہیں اور بہت ہی نافع ہیں، آپ کی مشہور کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کئی جلدوں میں ہے جو اپنے مقصد میں نہایت ہی مفید اور بصیرت افروز ہے، اسلئے ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہئے، اس کتاب میں اکابر امت کی سوانح وحالات کیساتھ ساتھ ان کے نہایت مفید ارشادات ومقالات درج فرمائے ہیں جو یقیناً آپ کے کمالِ علم اور ذوقِ سلیم پر بیّن ثبوت ہے۔

بہرحال میں کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کے دل میں اپنی رضاء کی طلب

عطا فرمائی تھی، اس بناء پر اس دور کے علماء ومشائخ ربانیین کی خدمت میں تشریف لے گئے، سب کا ادب کیا، سب کا احترام کیا، اس لئے سب کے فیض سے مستفیض ہوئے، اس لئے کہ مشہور ہے .....ع

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود

ایک بزرگ تھے ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے کتنے شیخ ہیں؟ کہا بھائی دیکھو! جس شیخ سے خاص اصلاح وارادت کا تعلق پیدا کیا تھا وہ تو ایک ہی ہیں، مگر اس دور کے جس شیخ کی خدمت میں گئے نشیب بن کر گئے اس لئے سب سے فیض حاصل ہوا، لہٰذا درحقیقت وہ سبھی میرے شیخ ہیں، پس جو شخص کسی شیخ کی خدمت میں اللہ کی طلب لے کر اور نشیب زمین بن کر جائے گا تو اس شیخ کا فیض اس طالب کو ضرور پہنچے گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے طالب کی قدر فرماتے ہیں اور اس کو رائیگاں نہیں فرماتے، لہٰذا اگر کوئی شیخ کسی طالب صادق کو فیض نہ بھی پہنچانا چاہے مگر چونکہ اللہ تو جانتا ہے کہ یہ ہمارا طالب صادق ہے اس لئے اس کو اس شیخ سے بھی ضرور فیض پہنچائے گا، خواہ کسی سلسلہ کا ہو۔

چنانچہ حضرت مولانا کے اندر چونکہ وسعت تھی اس بناء پر ہر شیخ روحانی خواہ چشتی ہو یا نقشبندی سب کی خدمت میں گئے، اس لئے اللہ نے ہر در اور ہر جگہ سے ان کو فیض پہنچایا اور سب نے آپ سے محبت فرمائی، چنانچہ حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے کہ ''جو حضرات اہل علم میرے پاس آمد ورفت فرماتے ہیں ان میں غالباً سب سے زیادہ قلب کا رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے۔''

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں صاحبؒ خانقاہ فتح پور تال نرجا ضلع مئو گئے تھے، اس وقت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ وہاں ہی قیام فرماتے تھے، اس زمانہ میں فتح پور تال نرجا پہنچنا بڑی مشقت کی بات تھی، طالب ہی پہنچ سکتا تھا، اس لئے حضرت مصلح الامتؒ بے حد خوش ہوئے، گدّے پر بیٹھے تھے، مولانا علی میاں کو اپنے گدّے پر بٹھایا مگر تھوڑی دیر کے بعد مولانا غایت ادب کی وجہ سے گدے سے چٹائی پر پہنچ گئے، چنانچہ حضرت مصلح الامت علیہ الرحمۃ نے کئی مرتبہ گدے پر بٹھلایا لیکن مولانا گدے سے الگ ہوکر پھر چٹائی پر پہنچ جاتے تھے، چنانچہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کی واپسی کے بعد حضرت مصلح الامتؒ نے ہم لوگوں سے فرمایا کہ دیکھو! مولانا علی میاں کتنے باادب ہیں کہ میرے گدے پر آخر بیٹھے نہ رہے۔

میرے دوستو! اسی ادب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو عزت عطا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے سب کے دلوں میں وقعت عطا فرمائی، اپنوں کے علاوہ غیروں کے دلوں میں بھی آپ کی عظمت تھی اور ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر آسمان سے قبولیت نازل فرمائی تھی، شہرت عطا فرمائی تھی، اس ملک کے لوگوں کے دلوں میں تو عزت تھی ہی عربوں کے قلوب میں بھی آپ کی عزت جاگزیں تھی، **فللّٰہ الحمد والمنة** .

یہ حقیقت ہے کہ آدمی جب تواضع اختیار کرتا ہے، انکسار اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں عزت عطا فرماتے ہیں، جیسا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

میں تو نام و نشاں مٹا بیٹھا   شہرہ مرا اڑا دیا کس نے

اسی حقیقت کو حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ یوں واشگاف فرماتے ہیں ؎

جس نے مٹایا اپنا نام و نشاں   ہفت اقلیم کا بنا سلطاں

اور مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ یوں فرماتے ہیں ؎

آئینہ ہستی چہ باشد نیستی   نیستی بگزیں گر ابلہ نیستی

یعنی اگر تم اپنی ہستی چاہتے ہو تو نیستی اختیار کرو، اس وجہ سے کہ ہستی کا آئینہ یہی نیستی ہے، نیستی یہ ہے کہ اپنے کمالات پر نظر نہ رکھے، نیستی کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے کمالات کو فنا کردے بلکہ تمام کمالات کو اپنے جد و جہد کا ثمرہ نہ سمجھے بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھے۔

غالباً حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے پوچھا کہ حضرت نیستی کے کیا معنی ہیں؟ کوئی عالم ہے تو کیا وہ اپنے کو عالم نہ سمجھے؟ جس کو علم ہے وہ تو سمجھے ہی گا کہ وہ صاحب علم ہے، جس کے پاس مال ہے وہ سمجھے ہی گا کہ صاحب مال ہے، پس نیستی کا کیا مطلب ہے؟ حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے فرمایا کہ اپنے علم پر نگاہ نہ ہونی چاہئے بلکہ اس کو اللہ کا عطیہ سمجھنا چاہئے، یعنی یہ سمجھے کہ اللہ نے ہم کو بغیر استحقاق کے یہ دولت عطا فرمائی ہے، جب بندہ یہ سمجھے گا کہ اللہ نے بغیر استحقاق کے یہ علم ہم کو دیا ہے تو کیا اس کے بعد وہ تکبر کرے گا؟ ہرگز نہیں، بلکہ وہ سمجھے گا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے دیا ہے ویسے ہی جب چاہیں گے چھین بھی سکتے ہیں، تو وہ ڈرے گا۔

پس اے لوگو! اللہ کیلئے خود بھی ہوجاؤ، اپنے علم کو بھی اللہ کے لئے کردو، اپنے مال کو بھی اللہ کیلئے کردو، غرض جو کچھ بھی ہے سب اللہ کے لئے کردو تو اللہ تعالیٰ تمہارا ہوجائے گا ''**من کان للہ کان اللہ لہ**'' یعنی جو اللہ کا ہوگیا اللہ اس کا ہوگیا۔

غور کیجئے کہ مسلمان جب کھانا کھاتا ہے تو کہتا ہے: ''**الحمد للہ الذی اطعمنی وسقانی و جعلنی من المسلمین**'' ''اے اللہ! آپ نے ہم کو کھانا کھلایا، آپ نے ہم کو پانی پلایا، ہم اس لائق نہیں تھے کہ ہم کو کھانا یا پانی ملتا، خواہ ہم نے محنت کی، ہم نے تجارت کی، زراعت کی، لیکن اگر آپ نہ دیتے تو کیسے ہم کو یہ ملتا، اس کے ساتھ ہی ساتھ اس پر شکر ادا کرتا ہے کہ ہم کو اسلام کی دولت سے نوازا، یہ بھی آپ کا عطیہ ہے ورنہ ہم تو اس کے ہرگز لائق نہ تھے کہ اس باطنی نعمت سے نوازے جاتے، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے طلبہ کے لئے عربی ادب کی ایک کتاب ''القرأۃ الراشدۃ'' لکھی ہے، جس میں ''الخبز'' (یعنی روٹی) عنوان کے تحت نہایت بلیغ مضمون لکھا ہے کہ روٹی جب کھاؤ تو سوچو کہ یہ روٹی کہاں سے آئی؟ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ نے سورج بنایا اس کی گرمی اور تمازت سے غلہ پکایا اس کا آٹا بنا، آٹے سے روٹی بنی، پس جب روٹی تم نے کھائی تو تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ الحمد للہ کہو! یہ بچوں کی تربیت کے لئے مولانا علی میاںؒ نے زبردست کتاب لکھی ہے، اور اس پر عرب علماء نے زبردست تقریظات لکھی ہیں اور تحسینی کلمات تحریر فرمائے ہیں۔

حضرت مولاناؒ سے ہم لوگوں کے تعلق کی خاص وجہ یہی ہوئی کہ حضرت مصلح الامت

مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ اپنی صاحبزادیوں اور خویش مولوی نور الہدیٰ وغیرہ کو عربی ادب پڑھانا چاہتے تھے، تو فرمایا کہ ادب کی کتابیں منگانی چاہئے، تو یہ طے ہوا کہ مولانا علی میاں ندوی کی لکھی ہوئی کتابیں منگوانی چاہئیں، چنانچہ ''القرأۃ الراشدۃ'' آئی اور حضرت مصلح الامتؒ نے طلبہ کو ''القرأۃ الراشدۃ'' پڑھانے کیلئے بندہ کو مقرر فرمایا اور حضرتؒ اپنی صاحبزادیوں کو خود ''القرأۃ الراشدۃ'' پڑھانے لگے، آخر کچھ دنوں بعد صاحبزادیوں کے پڑھانے کی ذمہ داری بھی اس حقیر کے سپرد فرمادی، غرض ''القرأۃ الراشدۃ'' کے منگانے اور خود پڑھانے اور اپنے مدرسہ میں داخل نصاب فرمانے کو معلوم کر کے مولاناؒ بہت متأثر ہوئے اور فرمایا کہ حضرت مولانا کے اندر بالکل عصبیت نہیں ہے، اس کی وجہ سے حضرت مولانا علی میاں کو خاص تعلق حضرت مصلح الامتؒ سے قائم ہوگیا اور بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ہم لوگوں سے بھی بے انتہا خصوصی تعلقات قائم ہوگئے، اور اس حقیر کا بکثرت آنا جانا ہوگیا، شادی میں، غمی میں شرکت ہونے لگی اور رمضان شریف میں ایک شب کیلئے تکیہ رائے بریلی حضرت مولاناؒ کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا اور مستفیض ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے مولاناؒ کو جو عظمت عطا فرمائی اور شہرت سے نوازا، علماء کے بھی سمجھنے کی بات ہے اور عوام کو بھی سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے تواضع میں کتنا اثر رکھا ہے، انکسار اور شکستگی میں کس قدر اثر رکھا ہے کہ مولانا اپنی اسی صفت تواضع کی بناء پر عوام وخواص سب کے نزدیک محبوب بن گئے۔

سنئے! تکبر کے اندر بڑائی نہیں ہے، جو اپنے کو بڑا سمجھتا ہے دوسروں کے دلوں میں اس کی وقعت نہیں ہوتی، کمال تو یہ ہے کہ آدمی اپنی نظر میں چھوٹا ہو مگر دوسروں

کی نگاہ میں بڑا اور باکمال ہو، اسی بناء پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''**اللھم اجعلنی فی عینی صغیرا وفی اعین الناس کبیرا**''یعنی اے اللہ اپنی آنکھ میں مجھے چھوٹا اور لوگوں کی آنکھوں میں بڑا بنا دیجئے، پس جو آدمی خود اپنی آنکھ میں بڑا ہوگا تو یقیناً دوسروں کی نگاہ سے گر جائے گا۔

دیکھو! بزرگان دین نے شکستگی اختیار کی، انانیت کو ترک کیا تو کتنا کام کیا، علمی کام بھی کیا اور عملی کام بھی کیا، اصلاح وتربیت کا کام بھی ایسے ہی بزرگوں سے زیادہ ہوا جنہوں نے اپنے کو مٹایا ہے اور تواضع اختیار فرمائی ہے، ایک بڑے بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص گھر سے باہر نکلا اور اپنے کو کتے سے بھی بہتر سمجھا تو اس طریق سے اس کو کچھ بھی حصہ نہیں ملے گا، اس لئے اپنے کو کتے سے بھی بہتر نہ سمجھنا چاہئے، اس لئے کہ کتے بلکہ سبھی جانوروں کا حشر یہ ہوگا کہ سب مٹی کردیئے جائیں گے مگر ہمارا حشر یہ نہ ہوگا، بلکہ ہم حسب ارشاد باری تعالیٰ دو فریقوں میں سے ایک فریق میں داخل ہوں گے ﴿**فریق فی الجنۃ و فریق فی السعیر**﴾ یعنی انسانوں اور جنوں میں کا ایک فریق جنت میں داخل ہوگا اور ایک جہنم میں۔ پس کون بتلاسکتا ہے کہ ہم دوزخ میں جائیں گے یا جنت میں جائیں گے، اس لئے خوف لازم ہے۔

آخرت کے معاملہ سے بزرگان دین تو ڈرتے ہی رہتے ہیں، چنانچہ حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ خلیفۂ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ بانی ندوۃ العلماء جو سلسلہ نقشبندیہ کے بہت بڑے بزرگ ہیں اور بہت کچھ دینی اور ملی کام کیا ہے ان سے اگر کوئی پوچھتا کہ آپ کا مزاج کیسا ہے؟ تو فرماتے مزاج کیا پوچھتے

ہو بین الخوف والرجاء ہے، رجاء بھی ہے خوف بھی ہے، جنت میں جانے کا جب تک پروانہ نہ مل جائے اس وقت تک مؤمن تو ڈرتا ہی رہتا ہے کہ نہ معلوم کیا حشر ہوگا، مؤمن کے اندر تواضع، انکساری، شکستگی کے علاوہ کبر کی گنجائش ہی نہیں ہوتی، آخر آدمی کس چیز پر ناز کرے؟ اپنے مال پر ناز کرے!؟ یا اپنے علم پر ناز کرے!؟ یا اپنی عبادت پر ناز کرے !؟ کتنی مثالیں موجود ہیں کہ کبر کی وجہ سے کتنے علم و عبادت والے تباہ وبرباد ہوگئے، بلعم بن باعوراء جیسا شخص جس کو اسم اعظم حاصل تھا کبر ہی کی وجہ سے گمراہ ہوگیا، کتوں کی طرح زبان لٹک آئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں تکبر کیا، اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس کا نتیجہ دکھلا دیا۔

ابلیس کو کس نے گمراہ کیا؟ بظاہر علم والا تھا، لیکن اللہ نے جاہلوں سے بھی بدتر اس کو بنا دیا، اس نے علم پر ناز کیا، اور ناز کی چادر اوڑھ کر عالم ملکوت میں اکڑتا ہوا چلتا تھا، مگر اللہ کو یہ چال پسند نہیں تھی، اس لئے اس کو ذلیل وخوار فرمایا۔

ع......... تکبر عزازیل را خوار کرد

نہ صرف علم میں کچھ بڑائی ہے اور نہ عبادت میں کچھ ہے، ہاں اگر شکستگی ہے تو سب کچھ ہے، شکستگی میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت وعزت رکھی ہے، بڑی رفعت و عظمت رکھی ہے، اس سے آدمی ترقی کرتا ہے اور عند اللہ قبولیت حاصل کرتا ہے۔

ہاں! تو میں کہہ رہا تھا کہ حضرت مولاناؒ کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صفت رکھی تھی جس کی وجہ سے اپنے بڑوں کے ساتھ تواضع اور ادب کا معاملہ فرمایا، اپنے چھوٹوں کے ساتھ شفقت وعنایت کا سلوک فرمایا اس لئے اللہ تعالیٰ نے سب کے دلوں میں آپ کی عظمت ڈالی، محبت ڈالی، لہٰذا ہم لوگوں کو اس سے عبرت ونصیحت حاصل

کرنی چاہیے۔

دوستو اور بزرگو! میں اس وقت حضرت مولانا ندویؒ کے محاسن وکمالات اس لئے بیان کررہا ہوں کہ مولانا سے میرا خاص تعلق تھا اس لئے مجھ پر حق ہے کہ ان کے محاسن وکمالات کو بیان کروں، خود حضرت مولاناؒ نے سیکڑوں علماء ومشائخ کی وفات کے بعد تعزیتی جلسوں میں ان کے محاسن بیان فرمائے، کتابوں میں تحریر فرمائے، اس لئے آج ہم سب پر مولانا کا حق ہے کہ ان کے محاسن کو حق واجب سمجھ کر بیان کریں، لہٰذا یہ حقیر اسی کے تحت کسی قدر ان کے محاسن کو بیان کررہا ہے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کررہا ہے کہ شاید مولانا کے کمالات ومحاسن سے متعلق ہمارا یہ پہلا ہی بیان ہوگا کیونکہ اس وقت مولانا کے محبین ومخلصین ومتوسلین سب کے سب ابھی تکفین وتدفین میں مشغول ہوں گے، ابھی کسی کو بیان کا کیا ہوش اور کہاں فرصت ہوگی۔

یقیناً حضرت مولانا کی وفات امت مسلمہ کے لئے بہت بڑا سانحہ ہے، حادثہ فاجعہ ہے، فیض وبرکات کا بڑا باب بند ہوگیا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو آفات وبلیات سے محفوظ رکھے، آمین۔ اور ہمارے مدارس اور اداروں کی حفاظت فرمائے۔ آمین

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جب ۱۹۶۷ء میں انتقال ہوا اور الہ آباد میں ۱۹۶۸ء میں فساد ہوا تو لکھنؤ کے مشہور ڈاکٹر فریدی نے کہا حضرت مولاناؒ جب تک باحیات تھے الہ آباد میں فساد نہیں ہوا تھا جو حضرت کی خاص برکت تھی، چنانچہ ان کی وفات کے بعد ہی فساد ہوگیا۔

میرے دوستو اور بزرگو! اہل اللہ کی ذات بلایا ومصائب کیلئے وقایہ (آڑ) ہوتی ہے اس بناء پر اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتے رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے فیوض وبرکات سے ان کے وفات کے بعد بھی ہم لوگوں کو فیضیاب فرماتا رہے، ہر قسم کے فتنوں سے حفاظت فرمائے۔ آمین **وما ذلک علی اللہ بعزیز**

دیکھئے! نماز عصر کے بعد مکرم قاری محمد کاوی نے حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتابگڈھیؒ کا مضمون ''روح البیان'' سے سنایا، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا ذکر تھا، چنانچہ اس موقع پر جو آیتیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پڑھیں ان سے مجھے بہت تسلی ہوئی جیسے منجانب اللہ میری تسلی کے لئے وہ مضمون سنایا گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اِرتداد کا دور شروع ہوگیا تھا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ تنہا جہاد کے لئے کھڑے ہوئے اور بڑے زوردار الفاظ میں فرمایا ''**اینقص الدین وانا حي**'' کیا دین میں کمی آجائے گی اور میں زندہ رہوں گا!؟ یعنی میری زندگی میں ایسا نہیں ہوسکتا۔

کچھ ہی دنوں پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک ادب اسلامی کا اجتماع تھا، بندہ بھی شریک ہوا تھا، اس میں مولانا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس قول کو نقل فرما کر اس کی توضیح نہایت مؤثر انداز میں فرمائی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر مسلمان کے دل میں یہ داعیہ اور یہ جذبہ ہونا چاہئے کہ جب تک زندہ رہیں گے دین اسلام میں کمی آنے نہ دیں گے، چنانچہ ابوبکر صدیقؓ نے ببانگ دہل فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو لوگ زکوٰۃ دیتے تھے ایک رسی بھی روکیں گے تو جہاد کروں گا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر نرمی کا مشورہ دیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ڈانٹ دیا اور فرمایا: ’’**أ جبار فی الجاهلية و خوار فی الاسلام**‘‘ تم جاہلیت میں بڑے بہادر تھے اور اسلام میں آ کر بودے نکلے، یعنی اسلام کے معاملہ میں تمہارے اندر جرأت ہونی چاہئے اور دین کو قائم رکھنے کا جذبہ ہونا چاہئے، بلکہ ہم سب کو دین پر قائم رہنا چاہئے اور پوری امت کو اس کی طرف دعوت دینی چاہئے۔

حضرت مولانا نے ایک مرتبہ میرے سامنے فرمایا کہ اِس زمانہ میں جوانوں کا اسلام پر اعتقاد باقی رہے یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی شخصیت بڑی تھی اس لئے صحیح معنوں میں آپ پر یہ مثال صادق آتی ہے ’’**موت العالِم موت العالَم**‘‘ عالم ربانی کی موت درحقیقت پورے جہاں کی موت ہے۔

آج دنیا کو ان کی ضرورت تھی، اللہ تعالیٰ نے اٹھالیا، **ان للہ ما اخذ وله ما اعطی، انا للّٰہ وانا الیه راجعون، فیاحسرتاه!** مگر اس ضرورت کو اللہ تعالیٰ پوری کرسکتا ہے، یاس ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی دوسرے سے وہ ضرورت پوری نہیں کرسکتا، لہٰذا کسی شیخ کی وفات کے بعد جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اب اس شیخ جیسا دوسرا کوئی شیخ و بزرگ نہیں ہوسکتا تو یہ عقیدہ کی خرابی ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ پیدا کرسکتا ہے، خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس امت کی مثال بارش جیسی ہے معلوم نہیں آخر بارش زیادہ مفید ہے یا اول بارش زیادہ مفید ہے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ’’**لن یصلح آخر هذه**

الامة الا بما صلح به اولها‘‘ یعنی وہ چیز جس سے پہلوں کی اصلاح ہوئی اور عافیت ملی ہے وہی چیز اب بھی اختیار کرنی ہوگی یعنی وہی دین وہی کتاب وہی سنت جو پہلوں نے اختیار کرکے فلاح حاصل کی تھی اگر ہم بھی اختیار کریں گے تو ہم کو بھی عافیت وفلاح ملے گی، ہم محروم نہ رہیں گے۔

حضرت مولاناؒ کی تقریروں میں میں نے شرکت کی، جس میں اس آیت کی تلاوت فرمائی: ﴿ **اَمۡ کُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ یَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ اِذۡ قَالَ لِبَنِیۡهِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰهَکَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِکَ اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ** ﴾

(البقرة -۱۳۳)

یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹوں کو بلایا اور فرمایا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟ وہ بولے ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے باپ دادوں ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق (علیہم السلام) کے خدا کی، اسی طرح خدائے واحد کی اور ہم اس کے فرماں بردار ہیں۔

اس طرح انہوں نے اپنے لڑکوں کو اس چیز پر آمادہ کیا کہ جو دین میں چھوڑ کر جارہا ہوں اس پر رہنا اس کے خلاف دین اختیار نہ کرنا یعنی جو دین تمہارے آباء واجداد نے چھوڑا اسی دین پر قائم رہنا، یہ سنا کر حضرت مولاناؒ فرماتے ہیں کہ بھائی! آپ لوگوں سے یہی کہتا ہوں کہ اس دین اسلام پر قائم رہو، میری وصیت یہی ہے، میری نصیحت یہی ہے دین اسلام پر قائم رہو، اس دین پر باقی رہو یہ بڑی نعمت ہے۔

دیکھئے! دین پر جو لوگ قائم ہیں، اللہ کا شکر ہے، وہ باعزت ہیں، غیروں کی نظروں میں بھی وہ باعزت ہیں، بااحترام وبااکرام ہیں۔

لہٰذا آج ہم دین کو اختیار کریں گے تو انشاء اللہ العزیز اللہ کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں ہماری عزت ڈالی جائے گی، ہمارے مرشد حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحبؒ کسی بڑے ڈاکٹر کے یہاں جاتے تھے جہاں نمبر کی ترتیب سے ڈاکٹر تک پہنچنا ہوتا تھا چونکہ اکثر وبیشتر یہ حقیر حضرت والا کے ساتھ رہتا تھا، اس لئے معلوم ہے کہ جب اس ڈاکٹر کو معلوم ہوجاتا کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب تشریف لائے ہیں تو فوراً اپنے مطب سے باہر آجاتا تھا اور اندر مطب میں حضرت کو لے جاتا اور اطمینان سے دیکھتا تھا، دیکھ کر باہر کار تک پہنچانے کے لئے آتا تھا، اس کے بعد حضرت والا اس حقیر سے ضرور فرماتے کہ دیکھئے! ہم نے محض رسمی اور ظاہری دین اختیار کیا ہے اس پر اتنی عزت غیر مسلم کرتے ہیں تو اگر ہم لوگ حقیقی دین اختیار کرلیں تو ان کے دلوں میں ہماری کتنی عظمت ووقار ہوجائے۔

ایک دوسری بات بھی حضرت والاؒ اُس وقت ضرور فرماتے جب بجلی چلی جاتی تھی پھر اچانک روشنی آجاتی تھی تو یہ ضرور فرماتے کہ ایسے ہی اچانک دل میں نور آجاتا ہے یعنی جب آدمی نور ایمان نور قرآن نور معرفت کا انتظار کرتا اور اس کے حصول کے لئے دعا کرتا ہے تو وہ آج نہیں تو کل ضرور مل کر رہتا ہے، اس لئے اس نور کے انتظار میں لگے رہو جیسے کسی کا کوئی مہمان آنے کو ہوتا ہے تو جب تک آ نہیں جاتا آدمی اس کا انتظار کرتا ہے، باہر جا جا کر دیکھتا ہے کہ ہمارا مہمان کہاں ہے؟ کیوں نہیں آیا؟ اس طرح نور ایمان اور نور ایقان ہمارا مہمان ہے یہ ایک حال اور

ایک کیفیت ہے، اس کی آدمی کو تمنا تو کرنا ہی چاہئے، اللہ تعالیٰ کی طرف دل اور لو لگانا چاہئے کہ اے اللہ جیسے آپ نے ظاہری ایمان دیا ہے زبان پر شہادتین کو جاری کردیا ہے (یعنی توحید ورسالت کی شہادت) تو ان شہادتوں کا نور بھی ہمارے قلب میں ڈال دیجئے اس لئے کہ حصول نور کا انتظار یہ مستقل ایمان کا ایک مقام و درجہ ہے، نور ایمان کامل ہونا یہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے اور درمیان میں نور کا انتظار کرنا یہ درمیانی درجہ ہے اس کو حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مرقاۃ میں بیان فرمایا ہے۔

بہرحال میں کہہ رہا تھا کہ اندھیرے کے بعد جب روشنی آتی ہے تو حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھیؒ ضرور یہ فرماتے کہ دیکھئے! ایسے ہی دل میں نور اچانک آجاتا ہے اس سے یہ اشارہ کرتے تھے اللہ کے نور کا منتظر رہنا چاہئے اس لئے کہ انتظار کیجئے گا تو ایک نہ ایک دن نور آہی جائے گا، دستک دیا کرو، چنانچہ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ دروازے کی زنجیر کوئی کھٹکھٹائے گا تو ضرور ایک مرتبہ نہیں دومرتبہ نہیں تیسری مرتبہ کوئی ضرور جھانکے گا کہ کون کھٹکھٹا رہا ہے۔

اسی طرح اللہ کے در کو کھٹکھٹائے جاؤ اللہ تعالیٰ تعالیٰ تمہاری طرف ضرور توجہ وعنایت فرمائیں گے۔

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد

وہ عاشق کیسا ہے کہ معشوق ان کے حال پر نظر نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ جب غیروں کو نوازتا ہے تو کیا اپنے محبین کو نہیں نوازیگا! وہ اپنے عاشقین کو نہیں نوازیگا! ان کو محروم رکھے گا!؟ ہرگز نہیں۔

میرے بزرگو اور دوستو ! دین کو اختیار کرنے میں ہماری عزت ہے ہماری سالمیت ہے، ہماری عزت وآبرو اسی میں ہے کہ ہم دین پر قائم رہیں اسی بناء پر ہمارے بزرگان دین بھی اسکی نصیحت کرتے آئے ہیں کہ دین پر قائم رہو اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت فرمائے گا، تم کو ہر طریقہ سے نوازے گا۔

علماء دین کا دین پر اعتماد قائم کرنا نوجوانوں کے لئے بہت بڑی دولت ہے تا کہ ارتداد نہ آنے پائے، دین سے ان کو بدظنی اور اسلام سے ان کو دوری نہ ہونے پائے بلکہ ایسی صورت پیدا کریں کہ ہمارے نوجوان بچے اور بچیاں دین پر قائم رہیں، دین کو اچھا سمجھیں یہ بھی بہت بڑی دولت، بہت بڑی نعمت ہے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صاحب آئے اور کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ مکتب میں شروع ہی سے معنی ومطلب کے ساتھ قاعدہ وغیرہ پڑھایا جائے تو بہتر ہے، مولانا نے برجستہ فرمایا کہ ہاں ٹھیک ہے مگر ایسا نہ ہو کہ جو ہے وہ بھی ختم ہو جائے، یہ جدید تعلیم یافتہ لوگ اکثر یہی باتیں کرتے ہیں کہ اب تک مولویوں نے کچھ نہیں کیا، مکتب بالکل بیکار ہے، مدرسے بے سود ہیں، مگر یہ کام ان لوگوں کو سپرد کر دیا جائے تو کچھ نہیں کر سکتے جتنا دین کا کام ہو رہا ہے وہ بھی ختم ہو جائے، دیکھ لیجئے مسلمانوں کے جتنے اسکول وکالج ہیں سب میں اختلاف ہے بلکہ انحطاط ہے، اس سے بڑھ کر کیا کہوں، مگر الحمد للہ ہمارے جتنے مدرسے ہیں سب میں ترقی ہے ایک کے بجائے دو، دو کے بجائے تین، تین کے بجائے چار ہوتے چلے جا رہے ہیں، اور الحمد للہ ثم الحمد للہ سب ترقی پذیر ہیں، تعمیری بھی ترقی ہے اور کتاب وسنت کی تعلیم بھی ہو رہی ہے، دین وعلم کی بقاء ان ہی اداروں سے

لاحق ہے کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، بیچارے مولویوں پر اعتراض کر دیتے ہیں کہ یہ لوگ سائنس وغیرہ مدارس میں داخل نہیں کرتے جس کا ان کو بہت قلق ہے مگر ان لوگوں سے کوئی کہے کہ اپنے اسکولوں میں دین کو کیوں نہیں داخل کرتے ؟ مسائل دینیہ کیوں نہیں داخل کرتے ؟ آپ مسلمان ہیں تو خود سوچیں کہ سائنس ضروری ہے یا دین ضروری ہے، بغیر علم سائنس کے دنیا کا کام چل سکتا ہے مگر بغیر علم دین کے دین پر نہیں چلا جا سکتا، خوب سمجھ لیں۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اپنی خداداد صلاحیت کی وجہ سے ماشاء اللہ عربی ایسی لکھتے تھے کہ عرب ان کا لوہا مانتے تھے، عربی تقریر بھی ایسی ہی کرتے تھے جس کو عرب بھی پسند کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کا خاص مذاق و طبیعت بنائی تھی جو واقعات سے نصیحت اور عبرت وموعظت حاصل کرنے والی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ جب مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کی شکل میں تبدیل ہوا اس وقت کس قدر قتل وقتال ہوا، وہ سبھی کو معلوم ہے، اس کے بعد مولانا نے کلکتہ میں زبردست تقریر فرمائی کہ مسلمانوں کا عجب حال ہے کہ واقعات سے عبرت نہیں حاصل کرتے، آدمی کو جب ایک مرتبہ ٹھوکر لگتی ہے تو فوراً نیچے دیکھتا ہے کہ کس چیز سے ٹھوکر لگی ہے، پھر دوسری مرتبہ ٹھوکر لگنے نہیں دیتا، مگر مسلمانوں کو ٹھوکر پر ٹھوکر لگ رہی ہے لیکن غور نہیں کرتے کہ کس بناء پر ٹھوکر لگ رہی ہے، افسوس کہ ٹھوکر پر ٹھوکر کھا رہے ہیں لیکن ہم اس سے عبرت ونصیحت حاصل نہیں کرتے۔

حضرت مولانا کی زندگی بہت ہی کار آمد تھی، ہمارے لئے بہت ہی مفید و

مؤثر تھی ، ماشاء اللہ طویل عمر کے ساتھ حسن عمل کی بھی توفیق حاصل رہی اور علمی و دینی بہت کام کیا ، بعض لوگوں کی عمر میں اللہ تعالیٰ اتنی برکت عطا فرماتے ہیں کہ تھوڑے وقت میں ان سے زیادہ اور بڑے بڑے کام لے لیتے ہیں ، ایک مرتبہ خدمت اقدس میں حاضر تھا فرمایا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ وقت کے بہت پابند تھے اس لئے بہت کام کیا ، ہم لوگوں کو جب کہ چھوٹے تھے یہ خیال ہوتا تھا کہ حضرت مولانا تھانویؒ کے یہاں بہت پابندی ہے مگر جب اپنے کام کا وقت آیا تو خوب سمجھ میں آتا ہے کہ بغیر وقت کی پابندی کے کوئی کچھ کام نہیں کرسکتا ، نظام الاوقات ضروری ہے ، نیز میرے سامنے ارشاد فرمایا کہ حضرت مولانا تھانویؒ کے دور میں جتنے باصلاحیت لوگ تھے سب کو اللہ نے حضرت مولانا تھانویؒ کے پاس پہنچا دیا تھا ۔

اپنے دور کے بزرگوں کے کمالات کا اعتراف واقرار یہ بھی معمولی چیز نہیں ہے ، بلکہ انتہائی حقانیت وللٰہیت اور انتہائی عدل وانصاف کی بات ہے ، اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان کو بلندی عطا فرمائی تھی ، قلب میں وسعت تھی تنگی نہیں تھی ، حقانیت تھی عصبیت نہیں تھی ، بلکہ ہر بزرگ کو بزرگ سمجھتے تھے ، خواہ کسی سلسلہ کا ہو اور جس کو وہ بزرگ سمجھ لیتے تھے اور جس کو وہ صاحب نسبت اور صاحب محبت ومعرفت سمجھ لیتے تھے اور جس کے متعلق سمجھتے تھے کہ اس کی گلی سے ہمارے مشام جان میں اللہ کی محبت کی خوشبو نصیب ہوگی بلا تکلف وہاں جاتے تھے اور مستفیض ہوتے تھے ۔

دوستو اور بزرگو ! بہت سے لوگ عصبیت اور جماعت بندی کی وجہ سے

دوسرے سلسلہ کے صاحب نسبت بزرگوں کے فیوض وبرکات سے محروم رہ جاتے ہیں ، کتنی بڑی حرماں نصیبی ہے اس لئے سنئے ! جس سلسلہ سے آپ کا تعلق ہے ہوسکتا ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی صاحب نسبت بزرگ نہ رہ گیا ہو تو کہاں سے نسبت حاصل کریں گے ، لہٰذا جس سلسلہ میں وہ باطنی دولت ونسبت کا حامل بزرگ موجود ہو تو اس کی تحصیل کے لئے وہاں تو جانا ہی پڑے گا اور جھکنا ہی پڑیگا ۔

ایک صاحب نے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت ! دو سلسلہ سے فیض حاصل کیا جاسکتا ہے ؟ فرمایا ہاں ! حاصل کیا جاسکتا ہے ، مگر اس کے سمجھنے کے لئے الٰہ آباد چلے جاؤ ، گنگا وجمنا کے سنگم پر بیٹھ جاؤ ، ایک ہاتھ سے گنگا کا پانی پیو اور دوسرے ہاتھ سے جمنا کا پانی پیو ، ہاں ! مگر اس کے لئے صلاحیت کی ضرورت ہے اور اگر صلاحیت نہیں ہے تو ایک سے بھی فیض حاصل کرنا مشکل ہے ، اگر صلاحیت ہے تو دو سے کیا ایک ہزار سے وہ فیض حاصل کرسکتا ہے ، اللہ کے فیض سے طالب کو کوئی روک نہیں سکتا ، ''**طرق الله بعدد انفاس الخلائق** '' اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے خلائق کے سانسوں کے بقدر ہیں ۔

میرے دوستو ! خلوص چاہئے ، طلب چاہئے ، جب آدمی کے اندر پیاس ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے کنواں سامنے کردیتا ہے ، چشمے اس کے لئے جاری کردیتا ہے اور جب طلب ہی نہیں ، پیاس ہی نہیں تو چشمے ہوں بھی تو تم کو کیا فائدہ ؟

میرے دوستو اور بزرگو ! اللہ تعالیٰ نے مولانا کی انہیں صلاحیتوں کی بناء پر عرب میں بھی عظمت عطا فرمائی تھی کہ وہاں کے علماء نے بھی ان کی شخصیت کو مان لیا تھا ، ان کی کتابوں کو مان لیا تھا اور ان کی تعریف وتحسین کرتے تھے ۔

ایسا کیوں تھا!؟ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو علمی وعملی صلاحیتوں کے ساتھ تواضع وانکساری وشکستگی کے صفات سے آراستہ فرمایا تھا، اس کے صلہ میں رفعت وعظمت سے نوازا تھا، ایک دفعہ میں جمعہ کے دن حضرت کی خدمت میں گیا تھا تو حضرت غالباً سورۂ کہف کی تلاوت فرما رہے تھے، ذکر واذکار اور نماز تہجد کے پابند تھے، زاہد وقانع تھے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ کسی ملک سے کثیر رقم ملی تھی اس کو دینی اداروں میں تقسیم فرمایا، اللہ کا شکر ہے کہ پانچ پانچ ہزار روپے ہمارے مدرسہ عربیہ بیت المعارف و دارالمعارف الاسلامیہ الہ آباد کو بھی عطا فرمایا، جبکہ خود ان کا اتنا بڑا مدرسہ دارالعلوم ندوہ موجود ہے اس کے بھی کثیر اخراجات ہیں مگر اس کی پرواہ نہ فرمائی، دوسرے مدارس میں تقسیم فرمادیا، یہ بھی حضرت مولانا کی خصوصیت تھی ورنہ تو اہل مدارس کا عام حال تو یہ ہے کہ کتنا ہی روپیہ ہوجائے دوسرے ضرورت مند مدرسہ کی ذرا مدد نہیں کرتے إلّا ماشاءاللہ۔

ہاں! تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ قلب میں وسعت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ وقت کے علماء ومشائخ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور ان کی خصوصیات کو ''پرانے چراغ'' میں لکھا، چنانچہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے تذکرہ میں صراحتاً یہ لکھا کہ ''حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے دینی واصلاحی جذبات میں بہت زیادہ توافق پایا، ہاں! نوعیت الگ الگ تھی، کام کے دھن اور جذبے میں باہم یکسانیت پائی'' دونوں کو نظر غائر سے دیکھا، اللہ تعالیٰ نے حق بات ان سے کہلائی اس بناء پر وہ سب کے محبوب

رہے، سب کے منظور نظر رہے، یہ تو بڑوں کے ساتھ معاملہ تھا، چھوٹوں کے ساتھ بھی بہت ہی شفقت وعنایت کا معاملہ فرماتے تھے، ندوہ لکھنؤ میں تو اس کا زیادہ اندازہ نہیں ہوتا تھا لیکن اگر کوئی تکیہ رائے بریلی دائرہ شاہ علم اللہ حاضر ہوتا تو بچھ جاتے تھے، چنانچہ یہ حقیر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور حضرت مولانا کو معلوم ہوجاتا تھا تو فوراً بلا لیتے تھے، سبحان اللہ! کیسی عنایت، کتنی محبت اپنے چھوٹوں کے ساتھ تھی، اس کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' **لیس منا من لم یرحم صغیرنا و یؤقر کبیرنا** ''یعنی جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں، پس چھوٹوں پر رحم اور بڑوں کی تعظیم وتوقیر میں خود اپنی مثال آپ تھے، ان حدیثوں کو ہمیں اپنا پیشوا بنانا ضروری ہے، جب ہی ہم آگے کام کرسکتے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور ان کا طریق ہی ہمارے لئے موصل الی اللہ ہے۔

میں یہ کہہ رہا ہوں کہ حضرت مولانا کے اندر وسعت تھی، تواضع ومسکنت تھی جس کی وجہ سے اللہ نے ان کو بہت بڑا مرتبہ عطا فرمایا تھا، مگر وہ آج ہم سے جدا ہوگئے، اللہ کی رحمت میں پہنچ گئے، لیکن ان کی تعلیمات مدون ہیں، ان کی کتابیں موجود ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب لوگوں کو ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ابھی تو بڑی سے بڑی سوانح ان کی لکھی جائیں گی، لیکن مجھے جو سمجھ میں آیا بیان کردیا، یوں تو دل میں بہت سی باتیں ہیں، لیکن دیر ہو رہی ہے اس لئے میں اتنے پر اکتفاء کرتا ہوں، آخر میں عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے واقعی آپ کو صاحب

نسبت بنایا تھا، بلکہ بزرگوں کی بہت سی نسبتوں کا جامع بنایا تھا۔

ذلک فضل الله يؤتيه من يشاء

دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائیں اور جنت الفردوس میں جگہ دے اور مقامات عالیہ سے نوازے، اور ان کے بعد کا جو کام ہے اللہ تعالیٰ ان کے بعد والوں کو جاری رکھنے کی توفیق مرحمت فرمائے، دعا کیجئے کہ اتفاق واتحاد سے سب کام چلتا رہے، خصوصاً دارالعلوم ندوۃ العلماء کو اللہ تعالیٰ اپنوں اور غیروں سبھی کی نظر بد سے اس کی حفاظت فرمائے۔ آمین یارب العالمین

دوسرے روز کا بیان (۱)

کل حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے متعلق باتیں کی گئی تھیں، سب کو افسوس بھی ہے صدمہ بھی ہے، ان کی وفات سے ان کی جدائی سے سبھی غمگین ہیں، میں نے ابھی ٹیلیفون کیا، معلوم ہوا کہ میرے دولڑکے مولوی محبوب احمد ندوی اور قاری محمد عبیداللہ ندوی الٰہ آباد سے جاکر مولانا کے جنازہ میں شریک ہوئے تھے، معلوم ہوا کہ حضرت مولانا نے خط بنوایا غسل فرمایا، شیروانی بھی پہنا اور خادم سے فرمایا تلاوت کیلئے قرآن شریف لاؤ، وہ گئے معاً سورۂ یٰسین شروع کردیا، اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ اَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴾ پر پہنچے تھے کہ آواز بند ہوگئی

(۱) ماشاء اللہ یہ بیان بھی خاصا طویل تھا اور اہم مضامین پر مشتمل تھا مگر بغرض اختصار سب کو نقل نہیں کیا گیا۔

اور ہوا جو ہونے والا تھا، جس کو کوئی ٹال نہیں سکتا تھا، انا للہ وانا الیہ راجعون

سبحان اللہ! کیسی مبارک موت ہوئی، ''**طبت حيا و ميتا**'' کی مصداق تھی، **ان لله ما أخذ و له ما اعطى، ذلك فضل اللّٰه يؤتيه من يشآء**

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ڈاکٹروں کی رائے اور منشأ کے مطابق حضرت مولاناؒ نے ندوہ ہی میں ماہ رمضان کو گذارنے کے لئے قیام فرمایا، جبکہ ہمیشہ رمضان میں قیام اپنے آبائی وطن دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ رائے بریلی میں فرماتے تھے، وہیں عشرۂ اخیرہ کا اعتکاف بھی فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں بھی یہاں آنے سے پہلے ہر سال ایک رات کے لئے وہاں حاضر ہوتا تھا، حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحبؒ سے اجازت لے کر وہاں جاتا تھا، عجیب پر بہار جگہ ہے، وہیں حضرت سید احمد بریلویؒ نے جہاد کی تیاری فرمائی تھی، بہت سے علماء ومشائخ وہاں ساتھ تھے، وہاں کی مسجد نہایت سادی ہے، بالکل سئی ندی کے کنارے واقع ہے جس کو حضرت مولانا سید علم اللہ صاحبؒ نے تعمیر کرائی تھی، مسجد میں غایت درجہ سکون نصیب ہوتا ہے، عبادت میں خاص طور سے تلاوت میں خوب جی لگتا ہے، رمضان کے اخیر عشرہ میں وہاں بہت سے معتکفین قیام کرتے تھے، اور حضرت مولانا کے بہت سے معتقدین وہاں حاضر ہوتے تھے، معلوم ہوا کہ حضرت کی ہی خواہش تھی کہ امسال بھی تکیہ پر ہی رمضان گذاریں لیکن ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ وہاں تکیہ میں علاج کی سہولتیں نہیں ہوں گی اسی بناء پر آپ دارالعلوم ندوہ ہی میں تشریف رکھیں، چنانچہ یہیں تشریف فرما ہوئے، لیکن ۲۰؍رمضان المبارک کو تکیہ رائے بریلی تشریف لے گئے تاکہ کسی کو اعتکاف کرنا ہو تو آخری عشرہ کا اعتکاف

وہاں کرسکے۔

اب دیکھئے کہ حضرت مولانا کے ذہن میں اپنے آبائی جگہ کی کتنی وقعت تھی اور اس جگہ کو آباد کرنے کی کتنی اہمیت تھی، یہ حضرت کا خاص مزاج تھا کہ بزرگوں کی جگہ آباد رہنی چاہئے۔

چنانچہ مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی وفات پر خانقاہ الٰہ آباد تشریف لے گئے تو مجلس میں پوری تقریر اسی پر کی کہ اس جگہ کو آباد رہنا چاہئے، بزرگان دین چلے جاتے ہیں تو ان کی جگہیں عموماً ویران ہوجاتی ہیں ایسا نہ ہونا چاہئے، بلکہ جو کام یہاں ہورہا تھا وہ ہونا چاہئے، جس بزرگ نے جو کام کیا دین کا یا طریق کا، کتاب و سنت کا علم وعمل کا، اس کا سلسلہ ضرور جاری رکھنا چاہئے، اسی طرح مجلس کا سلسلہ بھی قائم رکھنا چاہئے، لیکن صرف مجلس کا ہونا کافی نہیں بلکہ اس کے اندر روحانیت ہونی چاہئے، اس کے اندر نسبت مع اللہ کی حقیقت ہونی چاہئے۔

بہرحال حضرت کا ایک مزاج تھا اور جو بھی حامل دین وتقویٰ ہوتا ہے اور جس کے دل میں دین کا درد ہوتا ہے وہ چاہتا ہے کہ ہر جگہ دین کی اشاعت ہو، دین کی ترویج ہو، مدرسے آباد ہوں، خانقاہیں آباد ہوں، تبلیغ کے لئے ایسی جماعتیں ہوں جن سے دین کا کام ہو، علم دین کی نشر واشاعت ہو، سنت کا شیوع ہو۔

ابھی معلوم ہوا کہ جمعہ کی صبح کو حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ بھائی! آج الوداعی جمعہ ہے آج مجھ کو غسل دیدو، لوگوں نے کہا حضرت آج الوداعی جمعہ کہاں ہے، ابھی تو ایک جمعہ اور آنے والا ہے، کہا نہیں نہیں، ہم کو غسل دیدو، ہمارے ناخن تراش دو چنانچہ خط وغیرہ بنوایا گیا، غسل دیا گیا۔

دیکھئے! جو اللہ والا ہوتا ہے، جو زندگی بھر دین پر عمل کرتا ہے، تو کیا وہ آخری وقت میں دین کو بھول جائیگا؟ ہرگز نہیں، تدین وتقویٰ اس کی سرشت میں داخل ہوجاتا ہے، وہ کیسے بھول سکتا ہے، یہی چیز بزرگوں کے یہاں جاکر پیدا کی جاتی ہے، اتنی محنت ومشقت ومجاہدات اور ریاضات اسی لئے ہے کہ جو دین ظاہر میں ہے وہ باطن میں اتر جائے اور جب باطن میں اتر جائیگا، دل میں اتر جائیگا تو وہ معمولی معمولی چیزوں کی وجہ سے ختم نہیں ہوجائیگا وہ اخیر تک باقی رہے گا۔

درحقیقت بات یہ تھی کہ حضرت مولانا علی میاںؒ کے عالی قدر والدین نے جن معمولات دینیہ اور خصائل حسنہ پر لگایا تھا اسی پر موت ہوئی، خاتمہ بالخیر سے بڑھ کر اور کیا ہوگا، ابتداء جس سے کیا تھا انتہا اسی پر ہوئی، بیشک مولاناؒ ''طبت حیا و میتا'' کی بشارت ومبارکبادی کے لائق تھے۔

ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشآء

آپ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے گویا خاص مؤسسین میں سے ہیں، آپ کو وہاں کے عالی منصب کے لئے دعوت دی گئی تو اپنی والدہ محترمہ سے جاکر پوچھا کہ مدینہ منورہ کی جامعہ اسلامیہ کی طرف سے خاص منصب کے لئے دعوت آئی ہے تو کیا ہم وہاں جائیں؟ تو فرمایا بیٹا! ہم نے تم کو اس لئے نہیں پڑھایا ہے، والدہ محترمہ کی رضا وخوشی نہ پاکر وہاں نہیں گئے، یہیں ندوہ ہی میں رہ گئے، حالانکہ ابتداءً مالی اعتبار سے تنگی تھی، وسعت نہیں تھی، مگر والدہ ماجدہ کی اطاعت کی، جس کے ثمرات سے دنیا میں بہرہ ور ہوئے اور آخرت میں بھی انشاء اللہ سرفراز ہوں گے۔

یہ اللہ کا دین ہے جو جتنا اس کو اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ سے اتنا ہی قرب

نصیب ہوگا، اتنی ہی ولایت حاصل ہوگی، اتنی ہی بزرگی نصیب ہوگی، حضرت مولانا کا تو یہ پورا خاندان ہی اولیاء کا ہے ۔''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کا مصداق ہے۔

حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ بہت بڑے متبع سنت بزرگ تھے، جب حضرت مولانا علی میاںؒ کے والد محترم مولانا عبدالحی صاحبؒ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ کے یہاں تشریف لے گئے تو پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ کہا ہم دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی سے آئے ہیں، بس آپ کو وجد آگیا، اور فرمایا بیشک وہ علم اللہ تھے، بیشک علم اللہ تھے، (علَم کے معنی جھنڈے کے آتے ہیں) پھر بڑی خاطر تواضع فرمائی اور کچھ نصیحتیں بھی فرمائی۔

حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ مجدد صاحبؒ کے خلیفہ حضرت آدم بنوریؒ کے خلیفہ تھے، جب شاہ علم اللہ صاحبؒ کی وفات ہوئی ہے تو اورنگ زیب عالمگیرؒ نے خواب دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ اسی رات میں حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کی وفات ہوئی تھی، سبحان اللہ! ایسے متبع سنت تھے کہ ان کی وفات گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے مثل تھی، آدمی جب ہمت کرکے سنت کی اتباع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کی توفیق دیتے ہیں، دیکھئے! آپ حضرات کی خواہش تھی کہ ہم یہاں خانقاہ کنتھاریہ میں رمضان المبارک گذاریں اور دارالعلوم کی مسجد میں اعتکاف کریں تو اللہ تعالیٰ نے یہاں پہنچادیا، شائقین و طالبین کو پہنچادیا، معتکفین کو پہنچادیا، ماشاء اللہ ذکر وتلاوت میں لگے ہوئے ہیں، یہ اللہ کا محض فضل وکرم ہے، ورنہ اس زمانہ میں کہاں

کس کو فرصت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اپنی اصلاح کے لئے وقت فارغ کرے، اور کلفت برداشت کرے۔

حضرت مولاناؒ نے ندوہ میں بہت بڑا کام کیا، ندوہ کا مزاج کچھ اور تھا، لیکن مولانا کا کمال ہے کہ ندوہ کو اعتدال پر لے آئے، حضرت مولانا ہی کی برکت اور تعلیم وتربیت کا اثر ہے کہ ندوہ میں نماز باجماعت کا بہت اہتمام ہے، اکثر طلبہ نماز باجماعت ادا کرتے ہیں، تہجد کے بھی پابند ہیں، مولانا کے اعزاء بھانجے بھتیجے سبھی ماشاء اللہ اہل علم ومتقی وپرہیزگار ہیں، انشاء اللہ کام کو سنبھال لیں گے۔

ہمارے مرشد حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ نے ہم میں سے چند کو بلایا اور فرمایا کہ ہمارے لئے خاص طور سے یہ دعا کیا کرو''**اللھم انی اسئلک عیشة نقیة و میتة سویة و مرداً غیر مخزی و لا فاضح**''اے اللہ! میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ ہمیں خوشگوار زندگی اور برابر کی موت اور لوٹنا ایسا نصیب فرما جو ذلت وفضیحت والا نہ ہو، اس لئے ہمیں بھی یہ دعا کرنی چاہئے کہ فضیحت والی موت سے اللہ تعالیٰ ہم سب کو محفوظ رکھے، چنانچہ حضرت مصلح الامتؒ کی حیات وممات اس دعا کے قبولیت کا مصداق تھی، اور اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کی حیات وممات بھی اس دعا کی قبولیت کا مصداق ہے اور مولاناؒ''**طبت حیا و میتا**'' کی بشارت کے مستحق ہیں۔

فالحمد لله رب العالمین ، والصلاة والسلام علی سید الاولین والآخرین وعلی آله واصحابه اجمعین ،

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہم کا فکر انگیز خطاب

ڈیوزبری برطانیہ میں مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کی یاد میں ایک عالمی سمپوزیم منعقد کیا گیا جس میں برطانیہ کے سربرآوردہ اہل علم کے علاوہ بہت سے اصحاب فضل وکمال مندوبین بھی شریک ہوئے، اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہم نے افتتاحی خطاب فرمایا۔ جس کے اکثر حصہ کو شامل کتاب کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔ محمد قمر الزمان عفی عنہ

الحمدللہ رب العالمین ،والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا وامامنا وقدوتنا واسوتنا وحبیبنا محمدصلی اللہ علیہ وسلم وعلی اٰلہ واصحابہ وعلی کل من تبعھم باحسان الی یوم الدین ، امابعد !

حضرات علماء کرام، معزز مندوبین اور قابل احترام حاضرین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ میرے لئے ایک سعادت کا مقام ہے کہ آج کے اس اجتماع میں شرکت کی توفیق ہورہی ہے، جو ہم سب کے بزرگ، عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیت اور ہر دل عزیز ومحبوب رہنما حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے تذکرے کیلئے منعقد ہورہا ہے۔ میں اس سمپوزیم کے منتظمین کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس میں شمولیت کی دعوت دیکر مجھے اس سعادت سے نوازا، اللہ تعالیٰ ان کو اس کا بہترین صلہ عطاء فرمائے۔

مولانا ندویؒ کی محبوبیت:

دنیا میں بڑی قدآور شخصیات آتی رہتی ہیں ،اور رخصت بھی ہوتی رہتی ہیں، لیکن ایسی ہستیاں خال خال وجود میں آتی ہیں، جو اللہ جل جلالہ کی طرف سے ''**والقیت علیک محبة منی**'' کی مظہر ہوں، جن کی محبت عالم اسلام کے ہر گوشے میں، ہر طبقہ خیال میں اور ہر مسلمان کے شیشۂ دل میں اس طرح رچی اور بسی ہوئی ہو کہ جیسے کسی عزیز ترین اور مشفق باپ کی محبت انسان کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے، ایسی شخصیتیں دنیا میں بہت کم ظہور پذیر ہوتی ہیں، اور ایسی ہر دل عزیز شخصیات کا دنیا سے اٹھ جانا بھی عام آدمیوں کے اٹھ جانے کی طرح نہیں ہوتا، بلکہ ایسے لوگوں کی جدائی کا غم ہر شخص اس طرح محسوس کرتا ہے جیسے اسکے گھر کا کوئی فرد رخصت ہوا ہو۔ بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ۔

حضرت مولاناؒ کی ہر دلعزیزی کا مظہر:

یہ بھی حضرت مولاناؒ کی عظمت شان، بے پناہ محبوبیت اور ہر دلعزیزی کا ایک چھوٹا سا مظہر ہے کہ صبح سے آپ حضرت مولاناؒ ہی کے حوالے سے مختلف حضرات کے افکار وخیالات سن رہے ہیں۔ سب کی گفتگو کا موضوع ایک ہی شخصیت ہے اور بسا اوقات مکرر باتیں بھی کہی جارہی ہیں، لیکن کوئی ایک شخص بھی اپنی جگہ سے ہلتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ یہ درحقیقت اس خاص انعام کا ایک چھوٹا سا مظاہرہ ہے جو اللہ جل جلالہ نے حضرت مولاناؒ کو ہر دلعزیزی کی صورت میں عطاء فرمایا ہے۔

میں اس وقت ان باتوں کو دہرانے کے بجائے جو مجھ سے پیشتر مقرر حضرات

ارشاد فرما چکے ہیں، مختصر طور پر چند گذارشات پیش کرنا چاہتا ہوں، جنکا مقصد یہ ہے کہ یہ اجتماع اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے بامقصد اور نتیجہ خیز ثابت ہو۔

رسمی تعزیتی اجلاس مقصود نہیں ہونا چاہئے:

جب بھی کسی بڑی شخصیت کا انتقال ہوتا ہے، تو آج کل اس کی یاد میں اور اس کے تذکرے کیلئے تعزیتی اجلاس منعقد کیا جاتا ہے اور یہ طریقہ اس وقت دنیا بھر میں رائج ہے۔ مجھ سے پہلے برادر گرامی قدر مولانا سلمان صاحب نے ارشاد فرمایا کہ حدیث ''**اذکروا محاسن موتاکم**'' کی تعمیل میں ہر جانے والے مسلمان کا حق ہے کہ اس کے محاسن اور مناقب بیان کئے جائیں۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو جس دین کا پابند بنایا ہے اور جس دین کے ذریعے ہمیں عزت بخشی ہے، اس کی امتیازی تعلیم یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں محض رسمی انداز اختیار کرنے سے گریز کیا جائے اور اس کے بجائے کسی بھی واقعہ یا سانحہ کی اصل روح اور بنیادی مقصد پر توجہ دی جائے۔

صحابہ کرام کا صدمہ اور رسمی تعزیتی اجلاسات سے گریز:

اس روئے زمین پر کوئی بھی صدمہ یا جدائی کا غم اتنا اندوہناک اور جگر گداز نہیں ہے جتنا سرور دوعالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیلئے دلخراش تھا، یہ وہ صحابہ کرام تھے کہ اگر کسی کی موت کو مؤخر کرنا کسی بڑی سے بڑی قربانی کے ذریعے ممکن ہوتا تو ان صحابہ کرام کا ہر ایک فرد سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سانس کے بدلے ہزاروں

زندگیاں نچھاور کرنے کیلئے تیار ہو جاتا، صحابہ کرام کی بے مثال محبت اور عشق کا عالم یہ تھا کہ جب آپ اس دار فانی سے تشریف لے گئے تو بعض حضرات صحابہ کرام (حضرت عمرؓ) نے یہاں تک کہہ دیا کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف نہیں لے جاسکتے اور جو شخص یہ کہے گا کہ آپ کی وفات ہوگئی ہے، اس کی گردن اڑادی جائے گی۔ لیکن سیدنا ابوبکر صدیقؓ جن کا حال اور مقام یہ تھا کہ جب سورۂ نصر کی آیات ''**اذاجآء نصر الله والفتح ورائیت الناس یدخلون فی دین الله افواجا**'' نازل ہوئیں تو اس وقت تو سارے لوگ فتح مکہ اور اس کے عظیم ثمرات کا تصور کر کے خوش ہو رہے ہیں، لیکن پورے مجمع میں ایک ہی بوڑھے ہیں (یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ) جو رو رہے ہیں، اس واسطے کہ اس وقت پورے مجمع میں اس آیت کی تفسیر کا صحیح اور مکمل ادراک صرف انہی کو تھا کہ جب ''**یدخلون فی دین الله افواجا**'' کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے کا ذکر فرمادیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مشن پورا ہوگیا اور آپ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کا وقت آپہنچا۔ لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا جگر گداز واقعہ پیش آگیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ وہ واحد آدمی تھے جنھوں نے منبر پر کھڑے ہو کر ان لفظوں میں خطاب کیا کہ ''**من کان منکم یعبد محمدا فان محمدا قدمات ومن کان منکم یعبدالله فان الله حی لایموت**'' (صحیح البخاری، کتاب المغازی)

یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ اعلان فرمایا کہ جو شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ

وسلم کی عبادت کرتا تھا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو موت آ گئی، اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ ''حی'' ہے ہمیشہ زندہ ہے، اللہ تعالیٰ کو کبھی موت نہیں آتی۔

بہر حال حضرات صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے جو صدمہ پہنچا وہ محتاج بیان نہیں، لیکن آپ کے وصال کے بعد صحابہ کرام میں سے ہر ہر فرد نے رسمی اظہار تعزیت اور رسمی اجتماعات منعقد کرنے کے بجائے اپنی ذمہ داری یہ سمجھی کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جو پیغام لے کر تشریف لائے تھے اور جس دعوت کی خاطر آپ کو بھیجا گیا تھا، اس دعوت اور پیغام کو لیکر آگے بڑھنا ہم میں سے ہر شخص کا فریضہ ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر کوئی رسمی تعزیتی جلسہ تو منعقد نہیں کیا، لیکن آپ کے مشن اور دعوت کو دنیا کی آخری حدود تک پھیلانے اور پہنچانے کا فریضہ اس طرح انجام دیا کہ جس کی نظیر زمین و آسمان کی نگاہوں نے اس کے بعد کبھی نہیں دیکھی۔

حضرت مولاناؒ کی زندگی اور تعلیمات سے جو چند نکات میں اپنی فہم ناقص سے سمجھ سکا، وہ آپ حضرات کی خدمت میں اس وقت عرض کرنا چاہتا ہوں اللہ تعالیٰ صحیح طور پر انہیں بیان کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی جامعیت کے اسباب کیا تھے:

ابھی مولانا سلمان صاحب نے بھی یہ بات بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو جامعیت کا بڑا مقام عطا فرمایا تھا، دنیا کی مشہور شخصیتوں کا اپنا مخصوص میدان عمل ہوتا ہے، کسی خاص دائرے میں رہ کر وہ اپنا کام کرتی ہیں اور

اپنے اس خاص دائرے کے علاوہ دوسرے دائروں سے اس کی نگاہ ہٹی ہوئی ہوتی ہے، لیکن حضرت مولاناؒ کو اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلے میں جامعیت عطاء فرمائی تھی، اس جامعیت کا بنیادی سبب میری ناقص رائے میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کی پرورش اور تربیت ایسے ماحول میں فرمائی تھی جس میں ''علم برائے علم'' کوئی چیز نہ تھی۔

مولاناؒ کے علم کی برکت اور اس کی وجہ:

حضرت مولاناؒ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا علم عطا فرمایا تھا جس میں علم کی روح، خشیت، انابت، تواضع، سادگی، عمل، تقویٰ اور امت کیلئے تڑپنے کی امنگ پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر تھی، آج چار دانگ عالم میں حضرت مولانا کا جو فیض پھیلا ہوا نظر آتا ہے، اس کا ذریعہ تنہا حروف و نقوش کا علم نہیں ہے، بلکہ یہ اثر پذیری اور قبولیت درحقیقت اس سوز دروں اور گداز قلب کا نتیجہ ہے، جو رات کی تنہائیوں میں اپنے مالک کے سامنے گڑگڑانے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو عطا فرمایا تھا۔ اور یہ دولت اللہ والوں کی نیازمندانہ صحبت و معیت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے علوم حاصل کرنے کے بعد اصلاح نفس و تزکیہ باطن کیلئے وہ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ اور حضرت مولانا الیاس صاحبؒ[1]

[1] اسی طرح حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب الٰہ آبادیؒ و حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب پیر نتھے میاں بھوپالیؒ اور حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھیؒ کی خدمت میں نہایت خلوص و عقیدت سے آمد و رفت رکھتے تھے۔ (محمد قمر الزمان عفی عنہ)

جیسے بزرگان دین اور اکابر اولیاء اللہ کی خدمات میں طالب علم کی حیثیت سے حاضر ہوئے اور ان سے مسلسل اکتساب فیض کرتے رہے، جس کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انکے علم کو ایسا صیقل کیا اور ایسی جلا بخشی کہ اسکی روشنی سے سارا عالم جگمگا اٹھا۔ اس لئے حضرت مولاناؒ کی حیات طیبہ سے ہمیں پہلا سبق یہ ملتا ہے کہ حروف ونقوش پر اترانے اور علم پر گھمنڈ کرنے کے بجائے مجاہدۂ نفس اور اصلاح باطن کے لئے کسی اللہ والے کے پاس جانا چاہئے، جب وہ اللہ والا علم کو صیقل کرتا ہے، اور اسے جلاء بخشتا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ ایسے علم کی خوشبو سے ساری دنیا کو معطر کر دیتا ہے۔ یہ پہلا سبق ہے جو ہمیں حضرت مولاناؒ کی زندگی سے حاصل ہوا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑے کام کی بات ہے کہ حصول علم کے ساتھ اگر کسی اللہ والے سے تعلق قائم کر کے نفس اور باطن کا تزکیہ نہ کیا جائے تو علم میں برکت نہیں ہوتی۔

تصوف کے ساتھ امت کے سلگتے ہوئے مسائل پر نظر:

لیکن بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ آدمی جب تزکیہ نفس کے ضروری امر پر توجہ دیتا ہے جسے عرف عام میں تصوف وسلوک کہا جاتا ہے تو وہ کسی گوشے میں جا بیٹھتا ہے اور اس کا دعوت وارشاد کا کام ایک خاص حلقے تک محدود رہتا ہے، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو اللہ تعالیٰ نے تصوف وطریقت کا بھی امام بنایا تھا، اور عالم اسلام کے سلگتے ہوئے مسائل سے چشم پوشی فرما لیتے، لیکن مولاناؒ نے یہ انداز اختیار نہیں فرمایا، ان کے دل میں امت مسلمہ کا درد موجزن تھا، ان کے دل میں ایک ایسی آگ سلگی ہوئی تھی جو انہیں یہ سوچنے اور اس بات پر غور کرنے

پر مجبور کرتی کہ امت محمدیہ **علی صاحبها الصلوٰة والسلام** کی صلاح وفلاح کا کیا راستہ ہو سکتا ہے؟ اس فکر اور جامعیت کا نتیجہ ہے کہ حضرت مولانا امت کے اجتماعی مسائل کی طرف ہمہ تن متوجہ رہتے تھے، اور پیری مریدی کا جو عام تصور ہے، ان کا عملی میدان اس سے کہیں زیادہ وسیع اور ہمہ گیر تھا۔

مسلمانوں کی تفریق وانتشار:

حضرت مولانا کی زندگی کا دوسرا اہم نکتہ اور عبرت آموز بات جس سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہئے یہ ہے کہ آج کی دنیا میں بھی علماء اور محققین کی کوئی کمی نہیں، داعی بھی بہت ہیں دعوت کا کام کرنے والی جماعتیں بھی بے شمار ہیں سب اپنی اپنی جگہ کام کر رہے ہیں، لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ یہ سارے کام اپنے خاص حلقوں میں تو بار آور ہو رہے ہیں ان کاموں سے نئے نئے حلقے وجود میں آرہے ہیں، ہر کام اپنا ایک نیا حلقہ پیدا کر رہا ہے، لیکن مجموعی طور سے امت پر ان کاموں کا اثر ظاہر نہیں ہو رہا جسکا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف طریقوں اور انداز میں جاری یہ کام بعض اوقات امت مسلمہ کے مختلف ٹکڑوں میں بٹ جانے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

چنانچہ ایک طرف جہاں مختلف زاویوں سے دعوت وتبلیغ کے کام ہو رہے ہیں وہاں اشتراک واتحاد کے بجائے باہمی تفریق وتقسیم کا یہ حال ہے کہ یہ جملے بھی زبان زد عام ہیں کہ یہ فلاں جماعت کا آدمی ہے، یہ فلاں گروہ کا آدمی ہے، یہ فلاں مسلک سے تعلق رکھتا ہے، اس طرح مختلف گروہوں میں بٹ کر اور منتشر ہو کر یہ کام ہو رہے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان گروہ بندیوں نے امت محمدیہ علی

صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو باوجود اس کے کہ سب کی منزل ایک ہے مختلف ٹکڑیوں میں منقسم کردیا ہے۔

راستوں کو منزل قرار دینے کا نتیجہ:

اس تفریق کی وجہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنے ملفوظ میں بیان فرمائی ہے۔ (میرے والد ماجدؒ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ملاقاتیں بہت کم ہوئیں لیکن جب کبھی حضرت مولانا کا ذکر آتا تو والد ماجدؒ ضرور یہ لفظ ارشاد فرماتے کہ وہ ''موفق من اللہ'' ہیں) تو والد صاحب بڑے کام کی بات یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب بہت سے لوگ کسی مشترکہ منزل کی جانب رواں دواں ہوتے ہیں، سب کی منزل ایک ہوتی ہے، لیکن اس منزل تک پہنچنے کے راستے مختلف ہوتے ہیں، کوئی ایک راستے سے رواں دواں ہے، کوئی دوسرا راستہ اختیار کئے ہوئے ہے، کسی نے گھوم کر جانے والا تیسرا راستہ اپنایا ہے، تو ایسے میں ہر شخص کو چاہئے کہ وہ بیشک اپنا راستہ نہ چھوڑے لیکن دوسرے شخص کو صرف اس کا راستہ مختلف ہونے کی بناء پر مطعون بھی نہ کرے کہ تم نے فلاں راستہ کیوں اختیار کیا؟ کیونکہ سبھی کی منزل چونکہ ایک ہے، اس لئے محض راستے کے مختلف ہونے سے کسی کو برا بھلا کہنا درست طرز عمل نہیں ہے، آج ہم لوگوں نے راستے مختلف اختیار کئے، لیکن ہر شخص نے اپنے راستے کو راستہ سمجھنے کے بجائے اسے منزل قرار دے دیا، چنانچہ اس کا نتیجہ ہے کہ کوئی شخص اگر دوسرا راستہ اختیار کرکے منزل کی سمت آگے بڑھ رہا ہے تو اسے اپنا نہیں غیر اور پرایا سمجھا جارہا ہے،

اسے مطعون کیا جاتا ہے، ملامت کی جاتی ہے، اس پر بعض اوقات برملا اعتراضات بھی کئے جاتے ہیں، لیکن کم ازکم اتنا تو ہوتا ہی ہے کہ اس کے لئے اپنائیت اور ہمدردی کے جذبات دل میں نہیں رہتے، یہ وہ طرز عمل ہے جس نے ہمیں مختلف گروہوں، پارٹیوں اور جماعتوں میں بانٹ دیا ہے۔

حکمت کے ساتھ حق گوئی کا سلیقہ:

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کی ذات میں حق گوئی و بیباکی کے ساتھ حکمت و خیر خواہی کو جمع فرمایا تھا، اور ان دونوں باتوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے انہیں امتزاج پیدا کرنے اور توازن و اعتدال برقرار رکھنے کا عجیب وغریب سلیقہ بخشا تھا، ایک طرف یہ بات کہ جہاں کلمۂ حق کہنا ضروری ہو وہاں کلمۂ حق کہنا ہے، دوسری طرف اس کلمہ حق کے ذریعے کوئی فتنہ بھی پیدا نہیں کرنا ہے، کیونکہ کلمہ حق ایک وعظ، ایک نصیحت اور ہمدردی و خیر خواہی کا ایک پیغام ہے، یہ کوئی پتھر نہیں ہے جسے کسی کی طرف اٹھا کر پھینک دیا جائے یا کوئی لاٹھی نہیں ہے، جو کسی پر مار کر آدمی اپنی رنجشوں کا بخار نکالے، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد شدہ ایک عظیم فریضہ ہے، اسی بناء پر جہاں یہ بات ہے کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی بھی شرعی وملی مسئلہ میں حضرت مولاناؒ نے مداہنت سے کام لیا ہو، لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ جب کسی کو دین کی کوئی بات کہی تو دل میں اتر کر کہی۔ اس کی محبت، شفقت اور خیر خواہی کا جذبہ دل میں لے کر خلوص کے ساتھ کہی۔ پیش نظر یہ تھا کہ سننے والا اس بات کو قبول کرلے، اور اگر قبول نہ کرے تو

کم از کم اس کو فتنہ کا ذریعہ نہ بنائے۔

دعوت کے اثر پذیر ہونے کی تین ضروری شرائط:

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، ان کا ایک ایسا فقرہ یاد آگیا جو نہایت مفید اور کام کا فقرہ ہے، مجھے تو اس سے بڑا فائدہ پہنچا ہے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ حق بات حق طریقے سے حق نیت سے کہی جائے تو کبھی فتنہ پیدا نہ ہوگا، لیکن تین شرطیں ہیں۔ پہلے یہ کہ بات حق ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ نیت حق ہو، اور تیسری شرط یہ ہے کہ طریقہ بھی حق ہو، کہیں اگر حق کہنے کے نتیجے میں فتنہ کھڑا ہو جائے، جھگڑا پیدا ہو جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ان تین باتوں میں سے کوئی بات مفقود تھی، یا تو بات حق نہیں تھی، یا بات تو حق تھی لیکن نیت حق نہیں تھی، مثلاً کسی بری نیت سے بات کہی گئی تھی، اپنے کو بڑھانا دوسرے کو گرانا مقصود تھا، نیت خراب تھی یا اگر نیت بھی صحیح تھی تو طریقہ صحیح نہیں تھا، اگر طریقہ بھی صحیح ہوتا اور نیت بھی درست ہوتی اور بات بھی حق ہوتی تو فتنہ پیدا نہ کرتی۔ جلد یا بدیر کبھی نہ کبھی اثر دے جاتی۔ دعوت وتبلیغ کے ان آداب وشرائط کی روشنی میں آپ حضرت مولاناؒ کی تقریر یا تحریر کا مطالعہ کر لیجئے، یہ تینوں باتیں ایسی نمایاں نظر آئیں گی کہ شاید ہی کہیں اور نظر آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حق بات، حق نیت کے ساتھ حق طریقے کے مطابق کہنے اور لکھنے کی توفیق خاص عطاء فرمائی تھی، ہم لوگ اگر اپنی دعوت وتبلیغ اور کام میں یہ راستہ اختیار کر لیں تو آپس میں جھگڑے ختم ہو جائیں، اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی ہمیں توفیق مرحمت فرمائے۔

نئے فتنے کیسے وجود میں آتے ہیں؟

چوتھا نکتہ جو اس مختصر وقت میں آپ حضرات سے بیان کرنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو جس سلامت فکری اور ڈھلے ہوئے پاکیزہ خیالات سے نوازا تھا اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ ساری دنیا جانتی ہے کہ حضرت مولاناؒ عصر حاضر میں ایک عظیم داعئ دین اور مصلح بن کر ابھرے۔ ماضی قریب میں آپ داعیوں اور مصلحین کی فہرست پر اگر نظر ڈال کر دیکھیں تو بہت سے لوگوں میں یہ بات نظر آئیگی کہ وہ ایک طوفانی جھونکے کی طرح اچانک ابھرے، بہت سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا اور اپنا دیوانہ اور مسخر کر لیا، لیکن اس اچانک تسخیر کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ عام جمہور امت سے ہٹ کر ایک نیا فرقہ اور طبقہ وجود میں آگیا، ماضی قریب میں آپ کو اس کی ایک سے زیادہ مثالیں ملیں گی کہ ابتداء میں دعوت کا کام شروع ہوا، اسلام ہی کا کام شروع ہوا۔ صحیح نیت سے شروع ہوا، لیکن اس کے باوجود ان داعی و مصلح نے اپنا ایک گروہ ایسا بنا لیا جو ان کا مداح، ان کا کلمہ گو، ان کے قصیدے پڑھنے والا اور ان کی فکر کو آگے بڑھانے والا ہے۔ لیکن اس گروہ نے ایسا طرز عمل اور طریقہ کار اختیار کیا کہ خود کو عام جمہور امت اور جمہور علماء امت سے الگ کر لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس داعی و مصلح کی دعوت وفکر ایک مخصوص طبقے تک محدود رہی، اور وہ مخصوص طبقہ امت کے جمہور سے کٹ کر رہ گیا، اور اس خاص طبقے اور جمہور امت میں منافرتیں پیدا ہوگئیں، دونوں میں طعن وتشنیع کا سلسلہ شروع ہو گیا اور امت کو بحیثیت مجموعی فائدہ پہنچنے کے بجائے افتراق وانتشار کا سامنا

کرنا پڑا ۔ اسکی بنیادی وجہ (میں آپ حضرات سے نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ اس بنیادی وجہ کی تفصیل ذرا توجہ کے ساتھ سماعت فرمائیں) یہ تھی کہ انھوں نے اپنی دعوت کے ساتھ اپنے ذاتی نظریات کا ایسا پیوند لگا لیا کہ وہ ان کی دعوت کا جزو لاینفک (لازمی جز) بن گیا، جب کسی کو اسلام کی دعوت دیجاتی ہے تو وہ اسلام کی دعوت ہوتی ہے، امت کے سواد اعظم نے جس چیز کو اسلام سمجھا، دعوت اسلام سے اسی کی دعوت مراد ہوتی ہے، بعض اوقات کسی کے دل میں خیال آتا ہے کہ فلاں مسئلہ میں سواد اعظم غلطی پر ہے، اور اس بناء پر وہ سواد اعظم سے مختلف کوئی رائے رکھتا ہے، اگرچہ یہ بھی بری بات ہے، جیسا کہ مولانا سلمان صاحب نے ابھی حدیث سنائی ''من شذ شذ فی النار''۔ لیکن سواد اعظم سے مختلف رائے رکھنے والا اگر اپنی رائے کو اپنی ذات تک محدود رکھے تو شاید وہ بات اتنی فتنہ انگیز نہ ہوتی ۔لیکن جب وہ ایسی رائے کو اپنی جماعت اور اپنے حلقے کی دعوت کا جزو لاینفک (لازمی جز) بنا دیتا ہے، اس پر بحث ومباحثے کا دروازہ کھول کر اس پر اصرار کرتا ہے، اور اس کی طرف اسلام کے اجماعی امور کی طرح دعوت دیتا اور اس کے مخالفین پر اتنے ہی شدومد سے تنقید کرتا اور انہیں ملامت کا ہدف بناتا ہے، جیسے وہ اسلام کے اجماعی امور اور اس کے لوازم میں جمہور امت سے کٹ کر ایک الگ فرقہ وجود میں آجاتا ہے، اور الگ فرقہ بننے کے نتیجے میں دعوت کے ہمہ گیر پیغام سے امت پر جو اثرات مرتب ہونے چاہئے تھے اس سے وہ خود بھی محروم رہتا ہے اور اپنے متبعین کو بھی محروم کرتا ہے۔

☆☆☆

مولانا جمہور علماء امت کے راستے پر گامزن تھے:

اللہ تعالیٰ حضرت مولاناؒ کے درجات بلند فرمائیں۔ان کے بارے میں کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ ماضی قریب میں ان کا نام داعیان حق میں سرفہرست تھا، اور انھوں نے جو دعوت دی وہ ہمہ گیر اور انقلابی دعوت تھی، الحمدللہ اس دعوت نے عرب وعجم پر اپنے گہرے اثرات مرتب کئے، لیکن حضرت مولاناؒ نے اپنی دعوت کو کسی بھی مرحلے پر کسی ایسے نظریئے سے وابستہ نہیں کیا جو جمہور علماء امت سے ہٹا ہوا ہو، وہ ہمیشہ جمہور امت کے راستے پر گامزن رہے، جسے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جامع ارشادات ''**ماانا علیہ واصحابی**'' اور ''**اتبع سواد الاعظم**'' کے ذریعہ واضح فرمایا، حضرت مولاناؒ اسی راستے کو مضبوطی سے تھامے رہے۔

حالات زمانہ سے واقفیت:

بعض لوگ زمانے کی ضروریات اور جدید تقاضوں کے نام پر جمہور علماء امت سے جداگانہ راستہ اختیار کرلیتے ہیں، اور کبھی یہ طعنہ دیتے نہیں تھکتے کہ یہ شخص مولوی ہے زمانے کی ضروریات سے اسے واقفیت نہیں، لیکن حضرت مولاناؒ کو کوئی شخص یہ طعنہ نہیں دے سکتا کہ وہ حالات زمانہ سے بے خبر تھے یا اس کی ضروریات سے ناواقف تھے، مگر اس کے باوجود انھوں نے اپنے کسی بھی کام کے دوران کوئی ایسا راستہ اختیار نہیں فرمایا جو جمہور امت کے مجموعی راستے سے ہٹا ہوا ہو۔

کن امور میں دعوت کا فریضہ عائد ہوتا ہے؟

یہ بات امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے اور میرے والد ماجدؒ بار بار ارشاد فرمایا کرتے تھے (یاد رکھنے کی بات ہے) کہ مجتہد فیہ امور میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ عائد نہیں ہوتا، صرف مجمع علیہ اور مسلمات دین کے بارے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی مجتہد فیہ مسئلہ میں کوئی دوسرا راستہ اختیار کئے ہوئے ہے، تو اس کو مطعون کرنا ہرگز تبلیغ کا تقاضا نہیں ہے اور حضرت مولاناؒ نے ایسی بات کو کبھی بھی مقصود نہیں بنایا، آپ دیکھئے! اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت کے ذریعے لوگوں کو کتنا نفع پہنچایا۔

اختلاف رائے کا فطری سبب اور اس کی حدود:

آخری گذارش یہ ہے کہ اختلاف رائے کے بارے میں جو طرز عمل مولاناؒ کا تھا، اس کا ذکر بحمد اللہ سامنے آ گیا، لیکن جیسا کہ فطری طور پر دو آدمیوں کے نہ چہرے ایک جیسے ہوتے ہیں، نہ مزاج ایک طرح کے ہوتے ہیں اور نہ فہم۔ اس لئے جب تک فہم کے سانچے مختلف رہیں گے اختلاف بھی رہے گا، چنانچہ دنیا میں اختلافات کا سلسلہ ہر شعبے میں جاری ہے، لیکن اختلاف کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں اور اس کیلئے کچھ حدود بھی مقرر ہیں۔ ایک اختلاف کفر اور اسلام یا حق اور باطل کے درمیان ہوتا ہے، ایک اختلاف فروعی مسائل میں اجتہاد اور رائے کا ہوتا ہے، ایک اختلاف مشرب ومسلک کے حوالے سے سامنے آتا ہے، بلکہ اس سے بھی آگے صرف مزاج وذوق کے فرق سے بھی اختلاف ظاہر ہو جاتا ہے، اس

طرح اختلاف کے بہت سے مراتب اور درجات ہیں، لیکن یہ بات بکثرت دیکھنے میں آتی ہے کہ ہم کسی درجہ بندی اور فرق مراتب کا لحاظ کئے بغیر ہر طرح کے اختلافات کو ایک ہی پیمانے سے ناپنے لگتے ہیں اور ہر قسم کے اختلاف کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کر دیتے ہیں، مثلاً اجتہادی نوعیت کے اختلاف پر بھی ایسا ہی زبردست اور شدید ردعمل ظاہر کیا جاتا ہے، جیسا کفر وباطل کے اختلاف پر ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات مزاج ومذاق کے اختلاف پر بھی تشدد کا انداز اختیار کر لیا جاتا ہے، اس فرق مراتب کو ملحوظ خاطر نہ رکھنے کے سبب لڑائیاں، جھگڑے اور فتنہ وفساد پیدا ہوتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے جہاں اختلافات بہت رکھے ہیں وہاں ہر اختلاف کے بارے میں طرز عمل اور طریقہ بھی جداگانہ مقرر فرمایا ہے۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کا طرز عمل، اختلاف کے ان آداب اور حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے "**تعاونوا علی البر والتقوی**" کے طریقے پر تھا۔

مداہنت بھی درست نہیں:

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آدمی اتنا صلح کل بن جائے کہ وہ صریح کفر اور کھلے باطل کے معاملے میں بھی مداہنت سے کام لے یا لوگوں کے طعنوں سے مرعوب ہو کر باطل کو باطل نہ کہے۔ مثلاً علماء اہل حق کو بعض اوقات یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ وہ ہر وقت کفر کا فتویٰ لئے پھرتے ہیں، اس طعنے سے مرعوب ہو کر اجماعی اور صریح کفر کو کفر نہ کہنا مداہنت ہے۔ حضرت مولاناؒ ایسی باتوں سے مرعوب نہیں ہوئے اور معذرت خواہانہ اور مداہنت کا طرز عمل، کفر اور اسلام کے معرکے میں

اختیار نہیں فرمایا، چنانچہ انھوں نے قادیانیت پر پوری کتاب تالیف فرمائی اور قادیانیوں کے کفر کو دو اور دو چار کر کے واضح کیا۔

لیکن جہاں فروعی اختلافات کا تعلق ہے، تو مولاناؒ نے کہیں کوئی ایسا فتویٰ نہیں دیا جو فتنے کا سبب بن سکتا ہے، پوری امت مسلمہ کے اجتماعی دینی مفاد کے پیش نظر ان کا تعلق ہر ایک سے تھا اور ''**تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان**'' پر اخلاص کے ساتھ وہ عمل پیرا تھے۔

اچھے کاموں میں غیروں کیساتھ تعاون اور حضرت عثمان کا بہترین نمونہ

اختلاف رائے کے باوجود اچھے اور مشترکہ مقاصد میں باہمی تعاون کا نمونہ حضرت عثمان غنیؓ کی سیرت سے بھی ہمیں ملتا ہے، حضرت عثمان غنیؓ کو جب باغی فوجوں نے محاصرے میں لیا ہوا تھا، ان پر پانی تک بند کر رکھا ہوا تھا یہاں تک کہ وہ حضرت عثمان غنیؓ کے قتل کے درپے تھے، اس وقت کسی نے حضرت عثمان غنیؓ سے پوچھا تھا کہ حضرت! مسجد نبوی پر ان باغیوں نے قبضہ کیا ہوا ہے، تو کیا ہم ان کے پیچھے نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں؟ یہ سوال اس وقت کیا جا رہا ہے جب ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ جیسے خلیفہ راشد پر ناقابل بیان ظلم کرتے ہوئے ان کے خلاف زبردست بغاوت کر رکھی تھی، تو ایسے موقع پر بھی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے یہ جواب دیا۔ ''**ان احسنوا فاحسن معھم وان اساء وا فاجتنب اسائتھم**''، یعنی اگر یہ اچھا کام کریں تو تم بھی ان کے ساتھ اچھا کام کرو، اور برے کام کریں تو اس سے اپنے آپ کو بچاؤ۔

اس وقت بھی جب باغی خون کے پیاسے ہیں، خلیفہ راشد کی زبان سے یہ متوازن کلمہ نکل رہا ہے، جب ایسے باغیوں کے ساتھ خلیفہ راشد نے اس طرز عمل کی تلقین فرمائی تو چھوٹے چھوٹے اختلافات میں یا فروعی مسائل کی بنیاد پر اپنے آپ کو دھڑوں میں بانٹ لینا کیسے درست ہو سکتا ہے! یہ ٹھان لینا کہ اب اس سے بات نہیں ہو سکتی، اب اس سے ملاقات نہیں ہو سکتی، اس کے ساتھ اب مذاکرہ نہیں ہو سکتا، جس مجلس میں یہ ہوگا اس میں میں شریک نہیں ہو سکتا، یہ جو باتیں ہمارے معاشرے میں پھیل گئی ہیں، انھوں نے ہمیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے، پوری امت کا شیرازہ بکھیر دیا ہے، اس کی صلاح وفلاح کا راستہ بند کر دیا ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم اتنی عظیم عددی طاقت کے باوجود دشمنوں کیلئے نوالہ تر بنے ہوئے ہیں اور ہماری عظیم اجتماعی قوت ''**ھباء منثورا**'' ہو کر رہ گئی ہے، اس زبوں حالی سے نجات حاصل کرنے اور امت کی سطوت پارینہ کی بحالی کا واحد راستہ وہی ہے جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنایا تھا، اللہ تعالیٰ ہمیں اس راستہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے، مجھے احساس ہے کہ میں نے اپنے استحقاق سے زیادہ وقت لے لیا مگر خیال آیا کہ جو مجلس حضرت مولاناؒ کی یاد میں منعقد ہو اس میں حضرت مولانا کے ان اوصاف کو بیان کئے بغیر مجلس نامکمل رہے گی اور ہم اگر ان کی حیات طیبہ سے استفادہ کرنا چاہیں تو ان اہم نکات کو حرز جان بنانا ہوگا، اللہ تعالیٰ ہمیں ان نکات پر عمل پیرا ہونے اور حضرت مولانا کے مشن کو آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

اقتباسات

از

تصنیفات

اقتباسات

از

نبی رحمت

ماشاء اللہ حضرت مولاناؒ کی یہ تصنیف لطیف نہایت محقق و مدلل ہے اس کو بھی عجم وعرب کے ہر ملک میں سراہا گیا اور قبولیت سے نوازا گیا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ حضرت مولاناؒ نے اس کو عربی میں لکھا اس کا ترجمہ مولانا سید محمد الحسنیؒ نے کیا، انگریزی نیز دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے اور برابر اس کی طباعت کا سلسلہ الحمد للہ جاری ہے۔

اس کتاب کے شروع میں بھی عرب کے علاوہ دوسرے ممالک کی جاہلیت و ضلالت اور اخلاقی گراوٹ اور انسانی بربادی کے قصے وواقعات بہت ہی تحقیق کے ساتھ درج فرمائے ہیں جو نہایت بصیرت افروز ہیں اور ہر عام و خاص کا جاننا ضروری ہے تاکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی مساعی کی خصوصیت وندرت اور تربیتی نظام کے کمال و وسعت کو سمجھنا آسان ہو جائے۔ واللہ الموفق

چنانچہ حضرت مولانا ندویؒ اپنے ''پیش لفظ'' میں یوں رقمطراز ہیں بغور مطالعہ فرمائیں:

مصنف سیرت نگاری کے وقت اس ماحول اور اس عہد کو بھی کسی طرح نظر انداز اور فراموش نہیں کر سکتا جس میں نبوت محمدی کا آفتاب پہلی بار طلوع ہوا، اس لئے اس عہد کی عالم گیر جاہلیت کی پوری تصویر کشی بھی ضروری ہے جو چھٹی صدی مسیحی میں ہمیں ساری دنیا پر محیط نظر آتی ہے، اس میں یہ بھی دکھانا ہوگا کہ اس زمانہ میں فساد، اخلاقی بگاڑ اور انسان کی بے چینی واضطراب کس درجہ پہنچ چکا تھا، اس کی اخلاقی، سماجی، معاشی اور سیاسی حالت کیا تھی؟ تخریب وفساد کے کیا کیا اسباب وعوامل اس وقت کی دنیا میں کارفرما تھے، اور کیسی کیسی ظالمانہ حکومتیں، مسخ شدہ مذاہب، انتہا پسندانہ وخیالی فلسفے، تباہ کن تحریکیں اور دعوتیں اپنا کام کر رہی تھیں، جب مصنف نے اپنی کتاب **"ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین"** کی تمہید اور مقدمہ کے طور پر عہد جاہلیت کی ذرا تفصیل کے ساتھ تصویر کھینچنے کی کوشش کی تو اس قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑا جو اسے آج تک یاد ہے، اس کو اس کیلئے ان تمام مغربی مآخذ کا جائزہ لینا پڑا؛ جن میں ظہور اسلام کے وقت متمدن ملکوں اور اقوام عالم کی تاریخ بیان کی گئی تھی، اس نے ان تمام ضخیم کتابوں سے ان منتشر حالات کو اس

طرح جمع کیا جیسے چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے اکٹھا کئے جائیں۔

یہ تمہید جو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے اور سیرت کا مطالعہ کرنے والے کیلئے روشنی کا کام کرتی ہے اور اس کے سامنے بعثت محمدی کی عظمت و وسعت اور منصب نبوت کی نزاکت واہمیت اور اس کے عظیم الشان نتائج کی مکمل تصویر پیش کرتی ہے، عہد حاضر کے سیرت نگار کیلئے بہت ضروری ہے، اور اس کا کام اس وقت تک مکمل قرار نہیں دیا جائیگا جب تک اس میں بحث وتحقیق کا یہ انداز اختیار نہ کیا گیا ہو اور آغاز اسلام کے وقت عہد جاہلیت کا نقشہ اور اس کے فساد واضطراب، اخلاقی پستی اور خود فراموشی و خودکشی کی زندہ ومتحرک تصویر پوری امانت داری کے ساتھ بے کم وکاست پیش نہ کی گئی ہو۔

یہی اس ماحول اور اس شہر کا نقشہ تھا جہاں اسلام کی پہلی کرن چمکی، جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی اور دعوت حق کے قافلہ نے پہلا قدم آگے بڑھایا جہاں آپؐ کی عمر مبارک کے ۵۳ر سال گذرے اور جہاں تیرہ سال دعوت اسلام کے سخت و جاں گداز مرحلوں میں بسر ہوئے، سیرت کا مطالعہ کرنے

والے کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس زمانہ میں عقل وشعور اور تہذیب وتمدن کی جو سطح تھی اس سے باخبر ہو، نیز اس ملک کے اجتماعی اور سیاسی اور دینی و مذہبی حالات ،اس کے اقتصادی وسیاسی ڈھانچہ اور حربی اور عسکری طاقت کی نوعیت سے بھی واقف ہو؛ تاکہ اس ملک کے باشندوں کے صحیح رجحانات ،ان کے مزاج وافتادطبع ،ان کے ذہن و نفسیات کو اچھی طرح سمجھ سکے اور اس کو ان دشواریوں اور رکاوٹوں کا پورا اندازہ ہو سکے جو اسلام کی ترقی وپیش قدمی کی راہ میں حائل ہو رہی تھیں۔

یہی بات بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی یثرب کے بارہ میں کہی جاسکتی ہے جہاں اسلام مکہ سے منتقل ہوا ، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ نے ہجرت فرمائی اور تقدیر الٰہی نے اس کو اسلام کا اولین مرکز قرار دیا، اسلئے اس کے پس منظر کو سمجھے بغیر اسلام کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا پورا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، ان حالات کو جانے بغیر ہم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ اسلام نے ان افراد کی کیا اور کس طرح تربیت کی ان کو کیسے حیات نو بخشی ، مختلف مسائل کو کس طرح حل کیا، متضاد ومتحارب عناصر کو کس طرح شیر وشکر کیا، اس سلسلہ میں نبوت محمدی کا

کارنامہ کیا تھا؟ اس نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے اور روٹھے ہوئے انسانوں کو ملانے اور ان کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ وتطہیر کا فریضہ کس طرح انجام دیا، یہ بات صرف اسی وقت سمجھی جاسکتی ہے جب آدمی کے سامنے اس عجیب وغریب اور پیچیدہ ماحول کی پوری تصویر ہو جس کا سامنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو کرنا پڑا، بہت سے واقعات اور فیصلے جو حدیث وسیرت کے مطالعہ میں آدمی کی نظر سے گذرتے ہیں اس وقت تک سمجھے ہی نہیں جاسکتے جب تک مدینہ کی اجتماعی اقتصادی اور سیاسی حالت ، وہاں کی زمین کی خاصیت ، اس کے جغرافیہ، اس کے گردونواح ، وہاں کی انفرادی اور علاقائی طاقتوں ، انکے باہمی تعلقات وروابط ، معاہدوں اور عہد ناموں اور ہجرت سے قبل معاملات اور قومی اور ملکی دستور اور رسم ورواج کا قاری کو علم نہ ہو، اگر کوئی شخص ان تمام باتوں سے بالکل ناواقف ہوکر سیرت کی کتابوں میں اپنا سفر شروع کرتا ہے تو اس کی مثال ایک سرنگ میں چلنے والے کی سی ہوگی جس کو اپنے دائیں بائیں اور آغاز و منزل کسی چیز کی خبر نہ ہو۔

یہی اصول اس وقت کی معاصر ومتمدن حکومتوں اور

پڑوسی ریاستوں پر بھی منطبق ہوتا ہے اس لئے کہ ناظرین کے سامنے دعوت اسلامی کے اس اقدام کی اہمیت اور اس کی حوصلہ مندی اور خطر پسندی کی کوئی صاف و واضح تصویر اس وقت تک آ ہی نہیں سکتی جب تک اس کو ان حکومتوں کے حجم اور قوت وشوکت کا اندازہ نہ ہو جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام دی اور ان کے نام فرامین جاری کئے اور ان کی تہذیب اور ثقافت، عسکری قوت، فارغ البالی اور مرفہ الحالی نیز ان کے سلاطین کی مطلق العنانی، رعب ودبدبہ اور شان وشوکت کا صحیح علم نہ ہو، جدید معلومات نے ان حکومتوں اور قوموں کی تاریخ اور ان کے معاشرہ پر خاصی روشنی ڈال دی ہے؛ اور بہت سے ان حالات اور حقائق کا پردہ چاک کر دیا ہے جو عہد قدیم میں لوگوں کے سامنے نہیں آئے تھے، یا زیادہ صاف اور واضح نہ ہو سکے تھے، اس زمانہ کے سیرت نگار کیلئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ اپنے کام میں ان تمام معلومات سے پوری مدد لے اور تاریخ وجغرافیہ اور تقابلی مطالعہ کے میدان میں جو جدید ترین مباحث ومعلومات اب تک سامنے آئے ہیں ان سے پورا فائدہ اٹھائے۔

(نبی رحمت ص/۵۲)

☆...... **ف** : ماشاء اللہ حضرت مولانا ندویؒ نے ان جدید ترین مباحث ومعلومات سے پورا فائدہ اٹھایا ہے جو کتاب کے مطالعہ سے ہویدا ہے۔　(مرتب)

عہد جاہلیت

مذاہب اور اہل مذاہب پر ایک اجمالی نظر چھٹی صدی عیسوی میں

چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کے بڑے مذاہب قدیم مذہبی صحیفے اور ان کے احکام وقوانین (جنہوں نے مذہب، اخلاق اور علم کے میدان میں مختلف موقعوں پر اپنا مخصوص کردار ادا کیا تھا) بازیچہ اطفال بن چکے تھے اور تحریف کے علم برداروں، منافقوں اور ناخدا ترس وبے ضمیر مذہبی رہنماؤں کی ذاتی اغراض کا نشانہ اور حوادث زمانہ کا اس طرح شکار ہو چکے تھے کہ ان کی اصل شکل و صورت کا پہچاننا مشکل بلکہ ناممکن تھا، اگر ان مذاہب کے اولین بانی وعلم بردار اور ان کے انبیاء کرام دوبارہ واپس آ کر اس حالت کو دیکھتے تو ان مذاہب کو خود نہ پہچان سکتے اور ان کا انتساب اپنی طرف کرنے پر ہرگز تیار نہ ہوتے۔

یہودی مذہب چند بے جان رسموں اور روایات کا

نام تھا، جن میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ تھی، علاوہ بریں یہودیت بجائے خود ایک نسلی مذہب ہے جس کے پاس دنیا کیلئے کوئی پیغام، اقوام عالم کیلئے کوئی دعوت اور انسانیت کیلئے چارہ سازی ومسیحائی کا کوئی سامان نہیں ہے۔

یہ مذہب اپنے عقیدۂ توحید میں بھی (جو مختلف مذاہب اور قوموں میں اس کا امتیازی شعار رہا ہے جس میں اس کی عزت وشرف اور زمانۂ قدیم میں بنی اسرائیل کی دوسری قوموں پر فضیلت کا راز پنہاں ہے اور جس کی وصیت حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام نے اپنے بیٹوں کو کی تھی) ثابت قدم نہ رہ سکا، یہودیوں نے اپنے پڑوسی قوموں کے اثر سے یا غالب وفاتح قوموں کے دباؤ سے ان کے بہت سے عقائد قبول کر لئے اور ان کی بہت سی عادتیں اور مشرکانہ، بت پرستانہ اور جاہلی روایات اختیار کرلیں۔

عیسائیت اول ہی میں انتہا پسندوں کی تحریف، جاہلوں کی تاویل اور رومی نصرانیوں کی بت پرستی کا شکار ہوچکی تھی، حضرت مسیح کی سادہ وپاکیزہ تعلیمات اس تمام ملبہ کے نیچے دفن تھیں، توحید اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کا نور گھرے بادلوں کے اندر چھپ چکا تھا۔

دنیا کے ملکوں اور قوموں پر ایک عمومی نظر

یہ ان مذاہب کا حال تھا جو اپنے اپنے زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلانے کیلئے آئے تھے جہاں تک ان متمدن ممالک کا تعلق ہے جہاں عظیم الشان حکومتیں قائم تھیں علوم وفنون کا بازار گرم تھا اور جو تہذیب وتمدن، صنعت وحرفت اور علوم وفنون کا مرکز سمجھے جاتے تھے وہاں مذاہب کی شکل بالکل مسخ ہوچکی تھی اور انہوں نے اپنی اصل حقیقت وقیمت اور قوت وافادیت کھودی تھی اور مصلحین اور معلمین اخلاق دور دور نظر نہ آتے تھے۔

مشرقی رومی سلطنت

مشرق کی رومن شہنشاہی میں ٹیکسوں کی اتنی بھرمار تھی کہ اہل ملک اپنی حکومت پر غیر ملکی حکومت کو ترجیح دینے لگے تھے، بار بار انقلابات اور بغاوتیں ہوتی تھیں صرف ۵۳۲ھ کے ایک فساد میں قسطنطنیہ کے تیس ہزار آدمی قتل کئے گئے تھے ان کا سب سے بڑا مشغلہ اور دلچسپی کسی نہ کسی ذریعہ سے مال حاصل کرنا پھر عیش وعشرت

میں اس کو خرچ کرنا تھا، تفریح و تعیش میں وہ اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ اس کی سرحدیں درندگی و بربریت سے مل گئی تھیں۔ (نبی رحمت)

مصر

مصر (جو دولت مند بازنطینی سلطنت کی ایک ریاست تھی) مذہبی مظالم اور بدترین سیاسی استبداد کا شکار تھا، شام جو بازنطینی شہنشاہی کی دوسری ریاست تھی اہل روما کی توسیع پسندی اور ہوس ملک گیری کا شکار تھا جہاں صرف طاقت کے سہارے غیر ملکیوں کی طرح حکومت کی جاتی تھی اور محکوم رعیت کو کبھی شفقت و محبت سے واسطہ نہ پڑتا تھا۔

ایرانی شہنشاہ

طیفون (المدائن) جو اس شہنشاہی کا پایہ تخت تھا، پانچویں صدی میں اور اس کے بعد کے زمانہ میں اپنے تمدن و ترقی اور تعیش و اسراف کے آخری نقطہ پر تھا، مکمل فساد و اشتراک کی دعوت سے حالت یہ ہوگئی تھی کہ لوگ جس گھر میں چاہے بے تکلف گھس جاتے اور اس کے مال و دولت اور عورتوں پر زبردستی قبضہ کر لیتے۔

ملک کی تمام دولت و آمدنی کے وسائل ان بادشاہوں کی ملکیت سمجھے جاتے، دوسری طرف غریب عوام سخت مفلوک الحال اور مصیبت زدہ تھے اور اپنی قسمت کو روتے تھے ان کو جسم و جان کا رشتہ باقی رکھنے کے لئے بھی جدوجہد کرنی پڑتی تھی مختلف قسم کے ٹیکسوں، طرح طرح کی بندشوں اور بیڑیوں نے ان کی زندگی کو عذاب جان بنا دیا تھا اور وہ مویشیوں کی طرح زندگی گذار رہے تھے، اس مصیبت سے تنگ آکر اور ان ٹیکسوں اور رلازمی فوجی بھرتی سے عاجز ہوکر بہت سے کسانوں نے اپنے کھیتوں کو خیرباد کہہ دیا اور راہبوں کے خانقاہوں اور معبدوں میں پناہ لی، وہ مشرقی ساسانی سلطنت اور مغربی بازنطینی سلطنت کی طویل و خون آشام جنگوں میں (جو تاریخ کے مختلف وقفوں میں ہوتی رہیں اور جن میں نہ عوام کی کوئی مصلحت اور نہ ان کو اس سے کوئی دلچسپی تھی) حقیر ایندھن کی طرح کام آتے رہے۔

ہندوستان

ہندوستان جو عہد قدیم میں ریاضیات، فلکیات اور طب و فلسفہ میں دنیا میں بڑا نام پیدا کر چکا تھا اس کے

متعلق مؤرخین کی عام رائے یہ ہے کہ اس کا مذہبی ، اخلاقی اوراجتماعی طور پر سب سے تاریک اور بدترین دور چھٹی صدی عیسوی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے، بے حیائی اورعیاشی سے ان کی عبادت گاہیں بھی پاک نہ تھیں اوران کاموں میں کوئی عیب نہ سمجھا جاتا تھا، اس لئے کہ مذہب نے ان کو تقدیس اور عبادت کا رنگ دے دیا تھا، عورت کی کوئی قیمت اورعزت وعصمت باقی نہ رہی تھی، شوہر اپنی بیوی کو جوئے میں ہار جاتا تھا، اگراس کا شوہر مرجاتا تھا تو وہ زندہ درگور کی مانند ہوتی تھی، نہ شادی کرسکتی تھی نہ اس کو کوئی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا، شوہر کے انتقال پرعورت کے ستی ہوجانے کا اعلیٰ اور خوش حال خاندانوں میں رواج تھا اوراس کا مقصد اظہار وفاداری اور ننگ وعار سے گلوخلاصی تھا۔ یہ بدترین رسم انگریزی اقتدار کے بعد ہی ختم کی جاسکی۔

پورا ملک انتشار کا شکار تھا اور ٹکڑے ٹکڑے ہورہا تھا اس میں سینکڑوں ریاستیں اور حکومتیں تھیں جو اکثر برسرپیکار رہتی تھیں ، بدامنی اور بدانتظامی اور رعیت کی طرف سے بے پرواہی اورظلم واستبداد عام تھا۔

علاوہ بریں یہ ملک دنیا سے کٹ کر زندگی گذار رہا

تھا، اس پر جمود طاری تھا ، وہ عادات وروایات اور رسم رواج کے سخت شکنجہ میں گرفتار طبقاتی کشمکش اور ناہمواری کا شکار تھا اور خون نسل اور نسب کے تعصّبات سے زار و نزار ہورہا تھا، ایک ہندو مؤرخ ودیا دھر مہاجن سابق پروفیسر تاریخ پنجاب یونیورسٹی کالج، اسلام کی آمد سے قبل ہندوستان کی حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے عوام ساری دنیا سے کٹے ہوئے تھے وہ اپنے آپ میں مگن اور دنیا کے حالات سے بے خبر تھے اوراس بے خبری نے ان کی پوزیشن بہت کمزور کردی تھی ، ان میں جمود پیدا ہوچکا تھا اور ہزیمت اور انحطاط کے آثار نمایاں تھے، اس زمانہ کے ادب میں کوئی جان نہیں تھی، فن تعمیر، مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ میں بھی انحطاط تھا، ذات پات کی پابندیاں شدید تھیں، بیواؤں کی شادی نہیں کی جاتی تھی اور کھانے پینے کے سلسلہ میں شدید پابندیاں تھیں، اچھوت بستیوں کے باہر رہنے پر مجبور تھے۔

جزیرۃ العرب

عربوں کے اخلاق بھی بہت بگڑ چکے تھے وہ شراب اور جوئے کے رسیا تھے، ان کی قساوت قلبی اورحمیت

جاہلی کا اندازہ ان کے لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے سے کیا
جاسکتا ہے، قافلوں کو لوٹنا اور بے گناہوں کو تہہ تیغ کرنا ان
کا محبوب مشغلہ تھا، عورت کی ان کے یہاں کوئی عزت
باقی نہ تھی، مکان کے دوسرے سامان واسباب کی طرح یا
مویشیوں کی طرح جہاں چاہتی منتقل کی جاتی؛ یا ورثہ میں
ملتی، کچھ کھانے مردوں کے ساتھ مخصوص تھے عورتیں ان
کو استعمال نہیں کر سکتی تھیں، آدمی جتنی عورتوں سے چاہتا
شادی کر سکتا تھا، بعض لوگ اپنی اولاد کو افلاس اور معاشی
پریشانی کے خوف سے قتل کر ڈالتے تھے۔

قبائلی اور نسلی، خاندانی اور خونی عصبیت اور جذبہ
داری بے حد شدید تھی، جنگ ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور
ایک دوسرے کو قتل کرنا ان کے لئے ایک کھیل اور تفریح
تھا، ایک معمولی واقعہ اکثر بڑی خوں ریز اور طویل جنگوں
کا سبب بن جاتا بعض جنگوں کا سلسلہ چالیس چالیس
سال چلا اور ہزاروں آدمی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

یورپ

یورپین قومیں جو شمال ومغرب کے اندر دور تک آباد
تھیں جہالت و ناخواندگی کے مہیب سایہ میں تھیں اور

خوں ریز جنگوں میں مشغول وہ تمدن انسانی کے کارواں
سے بہت پیچھے اور علوم وفنون کی دنیا سے بہت دور تھیں نہ
بیرونی دنیا کو ان سے کوئی سروکار تھا نہ ان کو بیرونی دنیا
سے کوئی مطلب، ان کے جسم گندے اور دماغ اوہام و
خرافات سے بھرے ہوئے تھے، وہ نظافت کی طرف توجہ
اور پانی کا استعمال کم سے کم کرتے تھے، ان کے پادری
اور راہب جسم کو اذیت پہنچاتے اور انسانوں سے فرار میں
نہایت درجہ متشدد اور انتہا پسند تھے، ان کے یہاں ابھی
تک یہی بات طے نہیں ہوئی تھی کہ عورت انسان ہے یا
حیوان؟ اس کے اندر ابدی وغیر فانی روح ہے یا نہیں؟
اس کو ملکیت اور بیع وشراء کا حق حاصل ہے یا ان میں سے
کسی بات کا وہ حق نہیں رکھتی؟

لکھتا ہے:

پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ
پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ
گہری اور بھیانک ہوتی جارہی تھی اس کی وحشت و
بربریت زمانہ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجہ
زیادہ بڑھی چڑھی تھی کیونکہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن
کی لاش کی تھی جو سڑ گئی ہو، اس تمدن کے نشانات مٹ

رہے تھے اور اس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی، وہ ممالک
جہاں یہ تمدن برگ وبار لایا اور گذشتہ زمانہ میں اپنی انتہائی
ترقی کو پہنچ گیا تھا، جیسے اٹلی فرانس، وہاں تباہی طوائف
الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا۔

عالمگیر فساد

غرض بعثت محمدی کے زمانہ میں پوری انسانیت خود
کشی کے راستہ پر تیزی کے ساتھ گامزن تھی، انسان اپنے
خالق اور مالک کو بھول چکا تھا اور خود اپنے آپ کو اور اپنے
مستقبل اور انجام کو فراموش کر چکا تھا اسکے اندر بھلائی اور
برائی اور زشت وخوب میں تمیز کرنے کی بھی صلاحیت باقی
نہیں تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کے دماغ ودل کسی
چیز میں کھو چکے ہیں ان کو دین وآخرت کی طرف سر اٹھا کر
دیکھنے کی بھی فرصت نہیں اور روح وقلب کی غذا، اخروی
فلاح، انسانیت کی خدمت اور اصلاح حال کیلئے انکے
پاس ایک لمحہ خالی نہیں، بسا اوقات پورے پورے ملک
میں ایک شخص ایسا نظر نہ آتا جس کو اپنے دین کی فکر ہو جو
خدائے واحد کی پرستش کرتا ہو؛ اور کسی کو اس کا شریک نہ
ٹھہراتا ہو، جسکے جگر میں انسانیت کا درد ہو اور اسکے تاریک
وہولناک انجام پر کچھ بے چینی ہو، یہ صورت حال اللہ

تعالیٰ کے اس ارشاد کی ہو بہو تصویر تھی کہ:

ظھر الفساد فی البر	خشکی اور تری میں لوگوں
والبحر بما کسبت	کے اعمال کے سبب فساد
أیدی الناس لیذیقھم	پھیل گیا ہے، تا کہ خدا ان
بعض الذی عملوا	کو ان کے بعض عملوں کا
لعلھم یرجعون	مزہ چکھائے، عجب نہیں کہ
(سورۂ روم)	وہ باز آجائیں۔

عرب کا تاریک ترین دور

ان صلاحیتوں اور خوبیوں کے باوجود جن سے اللہ
تعالیٰ نے عربوں کو سرفراز کیا تھا اور جن کی وجہ سے بعثت
محمدی اور ظہور اسلام کیلئے ان کا انتخاب فرمایا تھا جزیرۃ
العرب میں بیداری اور بے چینی کے کوئی آثار نظر نہ آتے
تھے اور حنفاء اور تلاش حق کا جذبہ رکھنے والے چند نفوس
باقی رہ گئے تھے جو انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے اور جن کی
حیثیت برسات کی اندھیری اور ٹھٹھری ہوئی رات میں
جگنوؤں سے زیادہ نہ تھی جو نہ کسی گم گشتہ کو راہ دکھا سکتے
ہیں نہ کسی کو گرمی وحرارت پہنچا سکتے ہیں۔

یہ دور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت
ہوئی جزیرۃ العرب کی تاریخ کا بھی تاریک ترین دور تھا

یہ ظلمت وانحطاط کی آخری منزل پر تھا جب اصلاح کی امید ختم ہو جاتی ہے یہ وہ سخت وجانگداز اور سنگین مرحلہ تھا جو کسی نبی کو تبلیغ کے راستہ میں پیش آیا ہوگا۔

سیرت نبوی کے ایک انگریز مصنف ایم. آر. ولیم میور نے جو اسلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں اپنی خوردہ گیری اور عیب چینی میں مشہور ہے؛ اس دور کی خوب تصویر کھینچی ہے اور مغربی مصنفین کے اس نقطۂ نظر کی تردید کی ہے کہ آپ کی بعثت سے قبل لاوا بالکل پک چکا تھا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اتنا کیا کہ بروقت اور صحیح جگہ پہنچ کر اس کو آگ دکھادی، چنانچہ یہ لاوا پھٹ پڑا وہ کہتا ہے:

”محمد کے عنفوان شباب میں جزیرہ نما عرب بالکل ناقابل تغیر تھا شاید اس سے زیادہ ناامیدی کی حالت کسی اور زمانہ میں نہیں تھی۔“

نبی کی ضرورت

چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں حالات کا بگاڑ اتنا بڑھ گیا تھا اور انسانیت کی پستی اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ اب وہ کسی مصلح ریفارمر اور معلم اخلاق کے بس کی بات نہ تھی، مسئلہ کسی

ایک عقیدہ کی تصحیح کا کسی مخصوص عادت کو بدلنے کا یا کسی طریقۂ عبادت کی ترویج کا یا کسی معاشرہ کی سماجی اصلاح کا نہ تھا، اس کیلئے وہ مصلح اور معلمین اخلاق کافی تھے جن سے کوئی زمانہ اور کوئی علاقہ کبھی خالی نہیں رہا، مسئلہ یہ تھا کہ جاہلیت کے مشرکانہ وبت پرستانہ اور انسانیت کے اس مہلک اور تباہ کن ملبہ کو کس طرح ہٹایا اور صاف کیا جائے جو صدیوں اور نسلوں سے تلے اوپر جمع ہو رہا تھا، اور جس کے نیچے انبیاء کرام کی صحیح تعلیمات اور مصلحین کی مساعی اور خدمات دفن تھیں پھر اس جگہ پر وہ نئی مستحکم اور عظیم الشان وسیع وعریض اور بلند و بالا عمارت کیسے قائم کی جائے جس کے سایۂ رحمت میں ساری انسانیت کو پناہ مل سکے، مسئلہ یہ تھا کہ وہ انسان کیونکر بنایا جائے جو اپنے پیش رو انسان سے ہر چیز میں جدا ہو؛ اور ایسا نظر آئے کہ وہ ابھی ابھی وجود میں آیا ہے اس کو نئی زندگی ملی ہے۔

اَو من کان میتاً فأحیینٰه و جعلنا له نوراً یمشی به فی الناس کمن مثله فی فی الظلمت لیس بخارج منها ، (انعام/ ۱۲۳)

بھلا جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے روشنی کردی جس کے ذریعہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے کہیں اس شخص جیسا ہوسکتا ہے جو اندھیرے میں پڑا ہو اور اس سے نکل نہ سکے۔

یہ فساد کی جڑ کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کرنے اور بت پرستی کی بنیاد کو بیخ وبن سے اس طرح اکھاڑ پھینکنے کا تھا کہ دور دور اس کا کوئی اثر ونشان باقی نہ رہ جائے اور عقیدہ توحید نفس انسانی کی گہرائیوں میں عملاً پیوست اور راسخ کر دیا جائے کہ اس سے زیادہ تصور کرنا مشکل ہے، اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور عبادت کا رجحان، انسانیت کی خدمت اور حق پرستی کا جذبہ اور ہر غلط خواہش اور شوق کو لگام دینے کا ملکہ اور اس کی صلاحیت وقوت پیدا کی جائے، مختصر یہ کہ انسانیت کو جو خودکشی پر آمادہ تھی بلکہ اس کے لئے پر تول رہی تھی اور اس میں اپنی دانش میں اس نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، کمر پکڑ کر دنیا و آخرت کے جہنم سے بچایا جائے، اور اس کو اس شاہراہ پر ڈالا جائے جس کا پہلا سرا وہ حیات طیبہ ہے جو عارفین و اہل ایمان کو اس دنیا ہی میں نصیب ہوتی ہے اور دوسرا اور انتہائی سرا وہ ہمیشہ رہنے والی جنت ہے جس کا تقویٰ کی زندگی اختیار کرنے والوں سے وعدہ کیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو ارشاد فرمایا ہے؛ اس سے بڑھ کر اس صورت حال کی کوئی تصویر اور ترجمانی نہیں ہوسکتی ہے؛ ارشاد ہے:

و اذکروا نعمت الله علیکم اذ کنتم اعدآءً فالّف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخواناً و کنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها (آل عمران / ۱۰۳)	اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہوگئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو خدا نے تم کو اس سے بچالیا۔

بنی نوع انسان کی پوری تاریخ میں ہمیں اس سے زیادہ نازک اور پیچیدہ کام اور اس سے بڑی اور عظیم الشان ذمہ داری نظر نہیں آتی جو ایک نبی اور فرستادۂ الٰہی کی حیثیت سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈالی گئی، نہ کوئی کھیتی اتنی زرخیز ثابت ہوئی اور برگ وبارلائی جیسی آپؐ کی، نہ کوئی کوشش وسعی اتنی بارآور ثابت ہوئی جتنا آپ کی سعی انسانیت عامہ کے حق میں مفید وحیات بخش ثابت ہوئی، یہ عجائبات تاریخ کا سب سے بڑا عجوبہ اور دنیا کا سب سے بڑا معجزہ ہے، اس کی شہادت مشہور فرانسیسی ادیب اور شاعر نے بھی بڑی قوت و بلاغت اور وضاحت وصراحت کے ساتھ دی ہے، یہ ادیب لیمرٹائن ہے وہ نبوت محمدی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

''کسی بھی انسان نے کبھی بھی شعوری یا غیر شعوری

طور پر اپنے لئے اتنا رفیع الشان مقصد منتخب نہیں کیا اس لئے
کہ یہ مقصد انسان کی طاقت سے باہر تھا، توہمات اور خوش
اعتقادیوں کو جو انسان اور اس کے خالق کے درمیان حجاب
بن گئی تھیں زیر وزبر کرنا، انسان کو خدا کے حوالہ کرنا اور خدا کی
چوکھٹ پر انسان کو لانا، اس زمانہ کی اصنام پرستی کے مادی
خداؤں کی جگہ خدائے واحد کے پاکیزہ اور عقلی تصور کو از سر نو
بحال کرنا، یہ تھا وہ عظیم مقصد، کسی انسان نے کبھی بھی ایسے
عظیم الشان کام کا جو کسی صورت سے انسانی طاقتوں کے بس
کا نہ تھا اتنے کمزور ذرائع کے ساتھ بیڑا نہیں اٹھایا۔"

آگے لکھتا ہے:

"اس سے بھی زیادہ آپ کا یہ کارنامہ ہے کہ آپ نے
قربان گاہوں، دیوتاؤں، مذاہب، تصورات، عقائد اور نفوس
کے اندر ایک تہلکہ ڈال دیا، ایک ایسی کتاب کو اساس بنا کر
جس کا ہر حرف قانون کی حیثیت رکھتا ہے، آپ نے ایک
ایسی روحانی ملت کی تشکیل کی جو ہر نسل اور ہر زبان کے افراد
پر مشتمل ہے، اس ملت اسلامیہ کی امت کی خصوصیت جسے محمد
نے ہمارے لئے ورثہ میں چھوڑا ہے؛ یہ ہے؛ اسے خدائے
واحد کی اہانت کے خلاف انتقام پر مجبور کر دیتی ہے اور یہی
محبت محمد کے متبعین کی خوبیوں کی بنیاد بنتی ہے، اپنے عقائد کو

ایک تہائی دنیا سے تسلیم کرالینا بیشک آپ کا معجزہ تھا لیکن زیادہ
صحیح تو یہ ہے کہ ایک فرد کا نہیں بلکہ عقل کا معجزہ ہے، خدا کی
توحید کے تصور کا ایسے دور میں اعلان کرنا جب کہ دنیا لاتعداد
ضمنی خداؤں کی پرستش کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی، بذات
خود ایک قوی معجزہ تھا، محمد کی زبان سے جیسے ہی اس عقیدہ کا
اعلان ہوا؛ بتوں کے تمام قدیم معبدوں میں خاک اڑنے لگی
اور ایک تہائی دنیا ایمانی حرارت سے لبریز ہوگئی۔"

یہ عمومی اور ہمہ گیر انقلاب اور انسانیت کی حیات نو یا تعمیر
نو کا عظیم الشان کام نئی رسالت کا طالب تھا جو تمام رسالتوں
اور نبوتوں سے بڑھ کر ہوا؛ اور ایسے نبی کا خواستگار تھا جو
ہدایت اور دین حق کا پرچم آفاق عالم میں ہمیشہ کیلئے بلند
کردے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لم یکن الذین کفروا من اهل الکتاب و المشرکین منفکین حتی تأتیهم البینة رسول من الله یتلو صحفاً مطهرة فیها کتب قیمة (بینة/ ۱)

جو لوگ کافر ہیں یعنی اہل کتاب اور مشرک وہ کفر سے باز رہنے والے نہ تھے، جب تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل نہ آتی یعنی خدا کے پیغمبر جو پاک اوراق پڑھتے ہیں جن میں مستحکم آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔

اقتباسات

از

تزکیہ واحسان

یا

تصوف وسلوک

جس میں تصوف وسلوک کی اہمیت وضرورت کو اپنے خاص انداز میں واضح فرمایا ہے، اور اس کے حیرت انگیز اثرات اور انسان کی اخلاقی و روحانی ترقیات کے بنیادی حصہ کا غیر جانبدارانہ جائزہ پیش فرمایا ہے اور اس کو ایک الہامی نظام ثابت فرمایا ہے جو حضرت مولاناؒ کا عظیم کارنامہ ہے۔ **فجزاهم الله احسن الجزاء**

پیش لفظ

تزکیہ واحسان

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى أما بعد !

و الذين جآء وا من بعدهم يقولون ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذين سبقونا بالايمان ولا تجعل فى قلوبنا غلاً لِّلّذين آمنوا ربنا انك رؤف رحيم ، (الحشر/ ١٠)

اور (ان کے لئے بھی) جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے (اور) دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف فرما، اور مؤمنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (وحسد) نہ پیدا ہونے دے، اے ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں مسلمانوں کی آئندہ نسلوں سے اس بات کا مطالبہ کیا جارہا ہے کہ گذشتہ نسلوں کے بارے میں ان کا رویہ شرح صدر اور اعتراف حق کا ہونا

چاہیئے ،صدق واخلاص ، اطاعت رب ،خوف وانابت ، دین کی خدمت اوراسلامی سرحدوں اورقلعوں کی پاسبانی وحفاظت کے میدان میں جوسبقت اور فضیلت ان کو حاصل ہے،اس کودل سے تسلیم کرنا چاہیئے ،ان کی طرف سے نئی نسل کے دلوں میں کوئی کینہ اورنفرت نہ ہو،ان کی خدمات کے اعتراف میں اس کوانقباض اورتکلیف محسوس نہ ہو،اس کی زبان ان کے لئے دعاگواورثناخواں رہے، ان کے عذراورمجبوریاں اس کے لئے قابل قبول ہوں، اور وہ ان فروگذاشتوں سے جن سے کوئی فرد بشرمحفوظ نہیں رہتا،درگذرسےکام لے،اس لئے کہ جواجتہادکرتا ہےاس کےساتھ خطاوصواب کااحتمال رہتاہے،گرنے کا اندیشہ اسی سے ہوتا ہے جو چلنے اور دوڑنے کا ارادہ کرے،اس کےعلاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وہدایت کےسوادوسرے تمام لوگوں کے احکام وتعلیمات میں رد وقبول دونوں چیزوں کی گنجائش ہے۔

اس آیت کا ہم سے مطالبہ یہ ہے کہ ہم سلف صالحین اور ایمان واحسان کے شعبہ کے امام وپیش رو بزرگوں کے بارہ میں کوئی فیصلہ کرنے، ان کے بارہ میں کوئی رائے

قائم کرنے اوران پرکسی قسم کاحکم لگانے میں احتیاط سے کام لیں،اوراس میں کسی عجلت اورجذباتیت کامظاہرہ نہ کریں،اور جب تک پوری طرح کسی مسئلہ کااطمینان نہ ہوجائے اس پر قطعی حکم لگانے سے باز رہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیّها الذین اٰمنوا اِن جاء کم فاسق بنبأٍ فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجهالة فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین (الحجرات ۷/)	مومنو! اگر کوئی بدکردار تمہارے پاس کوئی خبر لے کرآئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو(مبادا) کہ کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچادو پھرتم کواپنے کئے پر نادم ہونا پڑے۔

پیش نظر کتاب ان مختلف مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جواسی مقصد کی وضاحت کے لئے (عربی اور اردودونوں زبانوں میں)مختلف اوقات میں لکھے گئے، معنوی وحدت نے موضوع کے تنوع اور اوقات کے اختلاف کے باوجودان سب مضامین کوایک لڑی میں پرودیاہےان میں یاتواپنےعلم وتجربہ کی بنیاد پرکسی خیال کی وضاحت کی گئی ہے یا زندگی اوراخلاقیات کےکسی

خاص خلاء کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، جس کا پر کرنا بہت
ضروری ہے، یا اہل حق کی اس جماعت کا دفاع ہے جس
کو تنقید ونکتہ چینی کا مسلسل ہدف بنایا جاتا رہا ہے، اور اکثر
ذاتی معلومات، عملی تجربہ اور اس کی زندگی کے گہرے
مطالعہ اور تحقیق وجستجو کے بغیر ان پر بے تکلف رائے زنی
بلکہ نشتر زنی کی گئی ہے۔

مصنف کو مختلف اسباب کی بنا پر خالص علمی وادبی
ماحول اور جدید سوسائٹی میں رہتے ہوئے ان حضرات کی
خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے استفادہ کرنے کا
موقع اپنے بہت سے معاصرین اور ہم عمروں سے زیادہ
ملا، اور اس نے ان کو بہت قریب سے اور غور سے دیکھا
ہے، اور اسے ان تأثرات و مشاہدات کو اپنے متعدد
مضامین (عربی واردو) میں پیش کرنے کی توفیق ہوئی۔

یہ مضامین طویل تجربہ اور عمیق مطالعہ کا نچوڑ ہیں، اور
آج ان کا یہ مجموعہ ''تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک'' کے
نام سے ایک احساس فرض اور ادائے قرض کے طور پر
طالبین حق کیلئے شائع کیا جارہا ہے، اس میں متعدد جگہ ان
اصحاب کا ذکر بھی ملے گا جن کے احسان سے پورے
پورے ملک اور قومیں سبکدوش نہیں ہوسکتیں، اور جن

مخلصانہ ومجاہدانہ کوششوں اور توجہات وفیوض سے لاکھوں
کروڑوں انسانوں کو دولت اسلام اور نعمت ایمان اور آخر
میں مرتبۂ احسان حاصل ہوا، جو نقد جاں بلکہ دولت
کونین دے کر بھی مل جائے تو ارزاں ہے۔

متاع وصل جاناں بس گراں است
گراں سودا، بجاں بودے چہ بودے

یہ مجموعۂ مضامین سب سے پہلے اجر وثواب اور
رضائے الٰہی کے شوق وطلب میں اور اس کے بعد اس
امید میں شائع کیا جارہا ہے کہ شائد اس سے کسی دل کے
سمندر میں تموج واضطراب پیدا ہو، سوئے ہوئے ایمانی
جذبات پھر سے بیدار ہوں، اور ملت اسلامی ہند کے فہیم و
ذکی اور انصاف پسند اور حق پرست افراد اس مسئلہ پر از سر
نو غور کرنے اور خوب سے خوب تر کی دریافت ویافت پر
آمادہ ہوسکیں۔

ابوالحسن علی ندوی   ۱۳۹۹/۵/۵
دائرہ شاہ علم اللہؒ، رائے بریلی   ۱۹۷۹/۴/۳

(تزکیہ واحسان ص:۱۲)

تزکیہ واحسان ہی تمام خرابیوں کا علاج ہے

ذرا ان ملکوں کی طرف نظر ڈالئے جہاں دعوت الی اللہ، روحانیت اور سچی خدا پرستی اور تزکیۂ نفوس کا کام عرصہ سے بند ہے، اور ایسے داعی اور علماء کی تعداد (جو انسانوں کا رشتہ خدائے تعالیٰ سے استوار کریں، اور ان کی اصلاح باطن کی طرف متوجہ ہوں) مغربی تہذیب کے اثر یا مغرب کے قرب یا اور دوسرے اسباب کی بنا پر بہت کم ہوگئی ہے، وہاں آپ ایک ایسا خلا پائیں گے، ایک مہیب اور طویل خلا جس کو نہ وسعت علم اور تبحر علمی سے پر کیا جاسکتا ہے، نہ ذہانت اور عالی دماغی سے، نہ ادب عالیہ سے، نہ عربی زبان وادب سے گہرے ربط اور نسبی تعلق سے، نہ آزادی وحریت سے، یہ ایک ایسا روحانی واخلاقی مسئلہ ہے جس کا کوئی حل نہیں، اعلیٰ طبقہ کے لوگ اور عوام تیز اور ہمہ گیر مادیت، دولت کی اندھی محبت، اور دوسرے اجتماعی اور اخلاقی امراض کا شکار ہیں، تعلیم یافتہ اور ذہین لوگ (مذہبی تعلیم وثقافت ہو یا مادی) عہدہ ومنصب، حسد اور بخل، تکبر اور انانیت، شہرت کی

خواہش، نفاق اور مداہنت، مادہ اور طاقت سے مرعوبیت جیسے باطنی امراض میں گرفتار ہیں، جہاں تک اجتماعی وسیاسی تحریکات کا سوال ہے، ان کو خودغرضی، تربیت کے فقدان اور لیڈروں کی کمزوری نے خراب کردیا ہے، رہ گئے ادارے تو ان کو اختلافات، احساس ذمہ داری کی کمی، دنیا طلبی اور تنخواہوں میں اضافہ کے عشق نے بیکار کردیا ہے، اور وہ صرف اسی کام کے ہوکر رہ گئے ہیں۔

جہاں تک علماء کا تعلق ہے، ان کے وقار اور عزت کو مظاہر پرستی اور ظاہرداری، فقر سے ضرورت سے زائد اور بیجا خوف، آرام طلبی اور عیش پسندی نے بگاڑ دیا، اور ان سب چیزوں کا علاج اس تزکیۂ نبوی کے علاوہ جس کا ذکر قرآن میں ہے، اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہے اور اس ''ربانیت'' میں جو علماء سے مطلوب ہے، اور کہیں نہیں ﴿و لکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب و بما کنتم تدرسون﴾ میں تزکیہ کی کسی خاص لگی بندھی اور متعین شکل پر زور نہیں دیتا، جس کا رواج عام ہوا، اور جس کا نام آخر دور میں تصوف پڑا، نہ میں تصوف کے حاملین میں سے سب کو ہر طرح کی غلط روی وغلط فہمی سے بری سمجھتا ہوں، اور

نہ ان کو معصوم قرار دیتا ہوں، لیکن یہ ضروری ہے کہ اس خلا کو جو ہماری زندگی اور ہمارے معاشرہ میں واقع ہو گیا ہے، جلد پر کیا جائے، اور تزکیہ واحسان اور فقہ باطن کو پھر سے تازہ کیا جائے، جس طرح ہمارے اسلاف نے اس کو اپنے اپنے زمانہ میں تازہ کیا تھا، اور یہ سب منہاج نبوت اور کتاب اور سنت کی روشنی میں ہو، بہر حال ہر دور میں اور ہر جگہ جہاں مسلمان بستے ہوں، یہ کام ضروری ہے، اس لئے کہ حقیقت میں یہ خلا ایک عظیم خلا ہے، اور ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کے اثرات اور نتائج بہت دور رس ہیں۔

اپنے اپنے دور میں اس ذمہ داری کو ادا کرنے والوں اور اس خدمت کے انجام دینے والوں پر تنقید کرنے والوں سے ایک عربی شاعر کی زبان میں کہنا چاہتا ہوں ؎

اقلّوا علیهم لا أبا لأبیکم
من اللوم أو سدّوا المکان الذی سدّوا

ان اللہ کے بندوں پر ملامت بہت ہو چکی، مسئلہ یہ ہے کہ کیا ان کی جگہ لینے والا اور درد کا مداوا کرنیوالا کوئی ہے؟

☆☆☆

تصوف وسلوک، ایک الہامی نظام

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو اجتماعی الہام کی دولت سے نوازا ہے، جو ہر قسم کے خطرہ اور ضرر اور انفرادی کمزوریوں اور غلط فہمیوں سے پاک اور محفوظ ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب اسلام اور مسلمانوں کے سامنے کوئی نازک اور اہم مسئلہ آتا ہے، اور اس کے بارے میں فیصلہ کرنا اور کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے، یا زمانہ کے تغیر اور حالات کے تقاضہ سے کوئی نئی ضرورت سامنے آتی ہے تو اللہ تعالیٰ علماء و مخلصین کے ایک معتد بہ گروہ کے دل میں جو نفس زکی اور ارادۂ قوی کے مالک ہوتے ہیں، اس ضرورت کی تکمیل کا شدت سے خیال پیدا کر دیتا ہے، اور ہمہ تن ان کو اس طرف اس طرح متوجہ کر دیتا ہے کہ وہ اپنے کو اس کام کے لئے مامور اور عند اللہ مسئول سمجھنے لگتے ہیں، ان کو اس کام کی تکمیل میں کھلے طور پر تائید الٰہی اور نصرت غیبی نظر آتی ہے، اور وہ دل کی گہرائی سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس کی طرف کشاں کشاں لے جائے جا رہے ہیں، یہ

وہ حقیقت ہے، جس کو ہم نے ''اجتماعی الہام'' یا جماعتی ہدایت سے تعبیر کیا ہے، اور تاریخ اسلام اس کی مثالوں سے پر ہے۔

کبھی یہ الہام معدودے چند اصحاب کو ہوتا ہے، جیسا کہ اذان کے واقعہ میں عبداللہ بن زیدؓ اور حضرت عمر بن خطابؓ کے ساتھ پیش آیا کہ دونوں کے خواب یکساں نکلے، اور دونوں کو خواب میں کلمات اذان کی تلقین کی گئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصویب فرمائی اور اذان کو شرعی حیثیت دے دی، جو آج تمام عالم اسلام میں رائج ہے، اور جیسا کہ لیلۃ القدر کے سلسلہ میں پیش آیا، جس کے بارے میں شیخین نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ ''چند صحابہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے جنہیں خواب میں لیلۃ القدر کو رمضان کی اخیر سات راتوں میں دکھایا گیا تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے خواب سات آخری راتوں کے بارے میں یکساں ہیں تو جو اسے تلاش کرنا چاہتا ہے وہ انہیں سات راتوں میں تلاش کرے۔''

اور اسی کے قریب صلوٰۃ تراویح کا معاملہ ہے، جس

کی اصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، جسے آپ نے تین دن کے بعد اس خیال سے چھوڑ دیا تھا کہ یہ امت پر فرض نہ ہو جائے اور اس طرح مشقت کا سبب نہ بن جائے، مسلمان اسے اکیلے اکیلے پڑھنے لگے، حضرت عمرؓ نے اس کی جماعت قائم کر دی، حضرت عمرؓ کا یہ فعل الہام الٰہی پر مبنی اور آسمانی رہنمائی کا نتیجہ تھا، اور اس میں بڑا ہی خیر پوشیدہ تھا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں اس نماز کو باجماعت ادا کرنے کا خیال اور اس میں قرآن کا شوق پیدا کر دیا، جو حفظ وحفاظت قرآن کا بڑا ذریعہ ثابت ہوا، اور اس کی وجہ سے مسابقت اور رمضان کی راتوں میں بیدار رہنے کا داعیہ پیدا ہو گیا، اس سلسلہ میں اہل سنت جنہوں نے تراویح کو اپنایا اور ان جماعتوں کے درمیان جنہوں نے اس کا انکار کیا اس کھلے فرق کو دیکھا جا سکتا ہے جو حفظ قرآن کی کثرت اور اس کے مطالعہ و اہتمام کے سلسلہ میں پایا جاتا ہے۔

اور کبھی یہ الہام مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اور جم غفیر کو ہوتا ہے، جس کا کسی امر پر متفق یا کسی ضرورت کی طرف متوجہ ہو جانا محض اتفاقی واقعہ یا کسی سازش کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا، ان کی اس کوشش سے اسلام اور

مسلمانوں کو نفع عظیم پہنچتا ہے، یا مسلمانوں کی زندگی کا کوئی خلا پر ہوتا ہے، یا کسی مہیب فتنہ، یا رخنہ کا سد باب ہوتا ہے، یا دین کے عظیم مقاصد میں سے کوئی مقصد پورا ہوتا ہے۔

اس طرح کے مبارک اجتماعی الہام کی مثال (جو بے شمار راسخ العلم علماء اور مخلص و باعمل لوگوں کو ہوا) حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں قرآن کو مصاحف میں جمع کرنا اور قرن اول و ثانی اور اس کے بعد کی ابتدائی صدیوں میں حدیث کے جمع و تدوین کا کام، مجتہدین کا استنباط، احکام اور جزئیات فقہ کی تفریع، علم نحو و قرأت، اصول فقہ اور قرآن اور اس کی زبان کو محفوظ کرنے والے تمام مفید علوم کی تدوین اور مدارس کی تعمیر، کتابوں کی نشر و اشاعت وغیرہ اس اجتماعی الہام کی بہترین مثالیں ہیں، جس کے ذریعہ دین اور امت کی یہ اہم ترین ضرورتیں پوری کی گئیں، اور آنے والے خطرات کا سد باب کیا گیا۔

اسی اجتماعی الہام کی ایک مثال گمراہ فرقوں، ملحدین و متشککین، تعطل و بے عملی کی دعوت دینے والے فلسفوں اور تخریب پسند تحریکوں کی تردید و ابطال کا کام بھی ہے، جس کے لئے مسلمانوں میں سے علم و ذہانت، فکری

صلاحیت اور ایمانی قوت میں امتیاز و تفوق رکھنے والے افراد میدان میں آئے اور انہوں نے ان دعوتوں اور فلسفوں کو بے نقاب کر دیا، مسلمانوں کو ان کے برے اثرات سے بچالیا، یہ سب کارنامے الہام ربانی کا کرشمہ ہیں جس سے تاریخ اسلام کے ہر مرحلہ اور علم و تہذیب کے مرکز میں مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت مشرف و سرفراز کی گئی، اور جو اس امت پر (جو آخری امت اور انسانیت کا مرکز امید ہے) خدا کی عنایت اور اللہ کے نزدیک اس کے بلندی مرتبہ کی دلیل ہے، اور یہ غیر منقطع الہام اور مسلسل مدد الٰہی، ختم نبوت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سلسلۂ وحی کے منقطع ہونے کی روشن دلیل ہے، جس کی اگلی امتوں میں کوئی واضح اور مسلسل نظیر نہیں ملتی، اس لئے کہ انہیں اس کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ سلسلہ نبوت قائم اور کار نبوت باقی تھا۔

تزکیۂ نفس و تہذیب اخلاق کا وسیع و مستحکم نظام جس نے بعد کی صدیوں میں ایک مستقل علم اور فن کی شکل اختیار کر لی، نفس و شیطان کے مکاید کی نشاندہی، نفسانی اور اخلاقی بیماریوں کا علاج، تعلق مع اللہ اور نسبت باطنی کے حصول کے ذرائع و طرق کی تشریح و ترتیب جس کی

اصل حقیقت تزکیہ واحسان کے ماثور وشرعی الفاظ میں پہلے سے تھی، اور جس کا عرفی و اصطلاحی نام بعد کی صدیوں میں ''تصوف'' پڑ گیا، اسی اجتماعی الہام کی ایک درخشاں مثال ہے، رفتہ رفتہ اس فن کو اس کے ماہرین نے اجتہاد کے درجہ تک پہنچادیا اور اس کو دین کی بڑی خدمت اور وقت کا جہاد قرار دیا، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے قلوب ونفوس کی مردہ کھیتیوں کو زندہ کیا، اور روح کے مریضوں کو شفادی، ان مخلص علماء ربانیین اور ان کے تربیت یافتہ اشخاص کے ذریعہ دنیا کے دور دراز گوشوں اور طویل وعریض ممالک (جیسے ہندوستان، جزائر شرق الہند اور براعظم افریقہ) میں وسیع پیمانہ پر اسلام کی اشاعت ہوئی اور لاکھوں انسانوں نے ہدایت پائی، ان کی تربیت سے ایسے مردان کار پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے اپنے عہد میں مسلم معاشرہ میں ایمان ویقین اور عمل صالح کی روح پھونکی، اور بارہا میدان جہاد میں قائدانہ کردار ادا کیا، اس گروہ کی افادیت اور اس کی خدمات سے انکار یا تو وہ شخص کریگا جس کی تاریخ اسلام پر نظر نہیں، یا جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔

جیسا کہ حدیث متواتر کی تعریف اور اس کے قطعی

الثبوت ہونے کی دلیل میں اہل اصول کہتے ہیں کہ ''اتنی بڑی تعداد نے ہر زمانہ میں اس کی روایت کی ہو کہ عقل سلیم اور انسانی عادات اس بات کو ماننے کیلئے تیار نہ ہوں کہ اتنے کثیر انسانوں نے غلط بیانی اور افتراء پردازی پر اتفاق کرلیا ہے اور یہ کسی سازش کا نتیجہ ہے'' تاریخ کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرن ثانی سے لے کر اس وقت تک بلا انقطاع اور بلا استثنا ہر دور اور ہر ملک کے خدا کے کثیر التعداد مخلص بندوں نے اسی طریقہ کو اختیار کیا، اور اس کی دعوت دی، خود فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو فائدہ پہنچایا، اور ساری زندگی اس کی اشاعت میں مشغول وسرگرم رہے، اور ان کو اس کی صحت وافادیت کے بارے میں پورا یقین واطمینان حاصل تھا، وہ اپنے ماحول ومعاشرہ کا خلاصہ وعطر تھے، اور نہ صرف اپنی راست بازی، خلوص وبے غرضی، پاک نفسی اور نیک باطنی میں، بلکہ کتاب وسنت کے علم، سنت کی محبت وعشق اور بدعات سے نفرت وکراہیت میں بھی اپنے معاصرین میں فائق اور ممتاز تھے، ایک دو کا، یا دس پانچ کا کسی غلط فہمی یا سازش کا شکار ہوجانا ممکن ہے، اور بعید از قیاس نہیں لیکن لاکھوں انسانوں کا جو اپنے علم وعمل میں بھی

امت کی صف اول میں نظر آتے ہیں، علیٰ سبیل التواتر صدیوں تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہنا، اس پر اصرار کرنا، اور اس کی دعوت دینا، اس پر پورے عزم واستقامت کے ساتھ قائم رہنا خلاف عقل اور خلاف عادت بات ہے، پھر ان انفاس قدسیہ سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہدایت یافتہ اور فیض یاب ہونا اور اعلیٰ باطنی وروحانی کمالات تک پہنچنا خبر متواتر ہے، جس کا انکار ممکن نہیں، عقلاً وعادتاً یہ بات بالکل ناممکن معلوم ہوتی ہے کہ زمانی و مکانی اختلاف کے باوجود صادقین ومخلصین کا یہ گروہ عظیم متواتر ومسلسل طریقہ پر ایک غلط فہمی میں مبتلا رہا، اور اللہ تعالیٰ نے بھی جو رحیم وحکیم اور ہادیٔ مطلق ہے، اور جس کا وعدہ ہے کہ:

و الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا و ان اللہ لمع المحسنین (العنکبوت / ۹۶)

اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں بڑے بڑے مجاہدے اور کوششیں کیں ہم ان کو ضرور بالضرور اپنے صحیح راستوں پر لگا دیں گے، بیشک اللہ تعالیٰ ہمت وصداقت کے ساتھ کام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ان کی اس غلط فہمی کا پردہ چاک نہیں کیا، اور ان کی دستگیری نہیں فرمائی، آپ تاریخ اسلام میں سے ان صادقین ومخلصین کو جن میں ایک ایک آدمی اپنے عہد کا گل سرسبد، منارۂ نور اور نوع انسانی کے لئے شرف و عزت کا باعث ہے، نکال کر دیکھیں کہ ان کے بعد کیا رہ جاتا ہے، اور اگر ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تو پھر کون سی جماعت لائق اعتماد اور سرمایۂ افتخار ہوگی؟

(تزکیہ واحسان، ص/۳۱)

☆......**ف** : سبحان اللہ! کیا خوب بصیرت افروز واثر انگیز مضامین وحقائق ہیں جو غور وخوض سے پڑھنے کے لائق ہیں، اور اس کے مطابق ہم سب کو اس سانچہ میں اپنے کو ڈھالنے بلکہ سنوارنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ حضرت مولاناؒ کا یہ تصوف وسلوک کا سلسلہ بھی باقی بلکہ ترقی پذیر ہو، ماشاء اللہ حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب (خلیفہ مولانا مذکور) اس سلسلۂ سلوک کو بھی جاری فرمائے ہوئے ہیں اور طالبین ان کی طرف متوجہ بھی ہیں جو ہمارے لئے بہت ہی مسرت کی بات ہے۔ **اللھم زد فزد**

☆☆☆

اقتباسات
از
''پاجا سراغ زندگی''

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصنیف لطیف ''پاجا سراغ زندگی'' (جس میں طلباء علوم نبوت کا منصب ومقام، ملت کی ان سے توقعات، عصر حاضر میں ان کی ذمہ داریوں سے روشناس کرایا گیا ہے) سے چند اہم ومفید مضامین درج کرتا ہوں ان کا مطالعہ انشاء اللہ طلباء کیلئے ہی نہیں بلکہ علماء کرام کیلئے بھی نفع بخش وبصیرت افروز ثابت ہوگا۔ (مرتب)

طلبہ وفضلاء مدارس کی ذمہ داریاں

دوستو! مدرسہ کے طالب علم کی حیثیت سے آپ کا کام سب سے زیادہ نازک اور سب سے زیادہ عظیم ہے، میں نہیں جانتا کہ اس وقت دنیا کی کسی جماعت یا کسی گروہ کا کام اتنا نازک، وسیع اور اہم ہو، ان الفاظ پر آپ دوبارہ غور کیجئے کہ آپ کا ایک سرا نبوت محمدی سے ملا ہوا

ہے دوسرا سرا زندگی سے، یہی آپ کے کام کی نزاکت کی وجہ اور آپ کی عظمت کی دلیل ہے، نبوت محمدی سے وابستگی اور اتصال جہاں ایک بہت بڑی خوش نصیبی اور سرفرازی ہے، وہاں ایک عظیم ذمہ داری بھی ہے، آپ کے پاس حقائق اور عقائد کی سب سے بڑی دولت اور سب سے عظیم سرمایہ ہے، اس وابستگی سے آپ پر چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، آپ میں غیر متزلزل یقین اور راسخ ایمان ہونا چاہئے، آپ میں یہ حوصلہ اور ہمت ہونی چاہئے کہ ساری دنیا ملتی ہو، تو اس کے ایک نقطہ سے بھی دست بردار ہونے کے سوال پر غور نہ کرسکیں، آپ کے دلوں میں اس کی حمایت ونصرت کا جذبہ موجزن ہونا چاہئے، آپ کا دل اس بے بدل دولت پر فخر اور شکر سے لبریز ہو، آپ کو اس کی صداقت، اس کی معقولیت، اس کی ابدیت، اس کی ہر زمانہ میں صلاحیت، اس کی بلندی و برتری اور اس کی معصومیت پر غیر متبدل یقین ہو، آپ اس کے مقابل ہر چیز کو پورے یقین کے ساتھ جاہلیت اور جاہلیت کی میراث سمجھتے ہوں، آپ جہاں احکام خداوندی اور تعلیمات اسلامی کو سن کر ﴿ **سمعنا و اطعنا** ﴾ کہیں، وہاں جاہلیت کے نظام اور جاہلیت کے

علم برداروں کو مخاطب کر کے کہیں کہ ﴿**کفرنا بکم و بدا بیننا و بینکم العداوۃ و البغضاء ابدا حتی تؤمنوا باللہ وحدہ**﴾ آپ اسلام ہی کی رہنمائی اور اسوۂ محمدی ہی کی روشنی میں دنیا کی نجات کا یقین رکھتے ہوں، اور آپ کا اس پر عقیدہ ہو کہ اس طوفان نوح میں سفینۂ نوح صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور امامت ہے، آپ یقین کرتے ہوں کہ افراد اور اقوام کی سرفرازی اور سربلندی کی شرط صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے، اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ ؎

محمد عربی کہ آبروئے ہر دو سرا ست
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

آپ کی تعلیمات نبوت کو علم کا لب لباب اور حقیقۃ الحقائق سمجھتے ہوں، آپ اس کے مقابلے میں تمام دنیا کی الٰہیات اور فلسفۂ مابعد الطبعیات اور قیاسات وروایات کو افسانہ وخرافات سے زیادہ وقعت دینے کیلئے تیار نہ ہوں، آپ توحید کی حقیقت سے واقف اور اس پر مصر ہوں، اور شرک اور تمام دنیا کے علم الاصنام کو خواہ وہ کیسے ہی پرجلال علمی اصطلاحات اور فلسفہ کی زبان میں بیان کیا گیا ہو، حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں، اور ﴿**زخرف**

القول غروراً﴾ سے زیادہ مرتبہ دینے کیلئے آمادہ نہ ہوں، آپ سنت کے اتباع کے حریص اور ”**خیر الھدی ھدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم**“ پر یقین رکھتے ہوں، اور بدعات کے مضر اور نامقبول ہونے پر آپ کو شرح صدر ہو، غرض آپ اعتقادی، ذہنی، فکری، قلبی، ذوقی اور علمی حیثیت سے نبوت محمدی کی جامعیت اور عملیت کے قائل ہوں اور اس کی عملی تفسیر ہوں۔

طلبہ وفضلاء کا امتیاز

دوستو! دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں آپ کا امتیاز یہ ہے کہ ان حقائق پر دوسروں کا اجمالی ایمان کافی ہے مگر آپ کو اس پر پورا ذہنی اطمینان اور شرح صدر ہونا چاہئے، آپ کا صرف قائل ہونا کافی نہیں، اس کا داعی ہونا ضروری ہے، دوسروں کا یقین لازمی ہو تو کافی ہے، آپ کا یقین متعدی ہونا چاہئے، جو سیکڑوں ہزاروں انسانوں کو یقین سے لبریز کردے، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ کا یہ سرور خوشی وسرمستی اور بےخودی کی حد تک نہ پہنچا ہو، اور آپ میں ”**یکرہ ان یعود الی الکفر کما یکرہ ان یقذف فی النار**“ کی حقیقت نہ پائی جاتی ہو، تعلیمات نبوت سے

دوسروں کی سرسری واقفیت کافی ہے، مگر آپ کے لئے
علوم نبوت میں رسوخ، علوم نبوت سے عشق، علوم نبوت
میں مقام فنائیت، علوم نبوت پر اصرار ضروری ہے، اس
کے بغیر دعوت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، بلکہ دعوتوں اور
تحریکوں کے اس طوفانی دور میں اس کے بغیر اپنی
خصوصیات اور سرمایہ کی حفاظت بھی مشکل ہے۔

☆......**ف** : یقیناً طلبہ کیلئے قابل توجہ مضمون ہے اس لئے
بغور مطالعہ کریں اور مولانا کی نصیحت قبول کریں۔ (مرتب)

کیفیات باطنی

یہ بھی یاد رکھئے کہ نبوت محمدی نے جس طرح علوم و
احکام کا ایک بے پایاں دفتر اور وسیع ترین ذخیرہ چھوڑا
**"فان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما ولکن
ورثوا ھذا العلم"** یہ ذخیرہ قرآن وحدیث، فقہ واحکام
کی صورت میں محفوظ ہے، اور آپ کا مدرسہ بحمداللہ اس کی
خدمت واشاعت کا بہت بڑا مرکز ہے، اسی طرح نبوت
محمدی نے کچھ اوصاف، خصوصیات اور کیفیات بھی
چھوڑے، جس طرح پہلا سرمایہ نسل درنسل منتقل ہوتا رہا،
اور اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت واشاعت کا انتظام کیا،

اسی طرح دوسرا سرمایہ بھی برابر منتقل ہوتا رہا، اور اللہ تعالیٰ
نے اس کی حفاظت کا بھی انتظام فرمایا ہے، یہ اوصاف
اور خصوصیات کیا ہیں؟ یقین واخلاص، ایمان واحتساب،
تعلق مع اللہ، انابت واخبات، خودشکنی وخودداری، علوم
نبوت واحکام اور اوصاف وکیفیات دونوں کی جامع تھی
**﴿ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یتلو
علیھم اٰیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب و
الحکمۃ﴾** نبوت محمدی سے صرف علوم واحکام لینا اور
کیفیات واوصاف کو ترک کردینا ناقص وراثت ہے اور
نامکمل نیابت دنیا میں جن لوگوں نے نبوت کی نیابت کی
اور اسلام کی امانت ہم تک پہنچائی، وہ صرف ایک حصہ
کے امین نہ تھے، وہ دونوں دولتوں سے مالا مال تھے، اب
بھی اسلام کی دعوت اور اسلامی انقلاب صرف پہلے حصہ
سے برپا نہیں کیا جاسکتا، آپ کو جن اسلاف کی طرف
نسبت کا شرف حاصل ہے وہ بھی ان دونوں خصوصیتوں
کے جامع تھے، آپ اگر حقیقی نیابت کے منصب بلند پر
سرفراز ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو اس جامعیت کی کوشش
کرنی پڑے گی، اس کے بغیر علم وفن کی صناعی کاغذی
پھول ہیں، جن میں نہ خوشبو، نہ تازگی، آج دنیا کے بازار

میں کاغذی اور ولایتی پھولوں کی کمی نہیں، ہم اور آپ اس میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کر سکتے، یہاں تو نبوت کے باغ کے شاداب پھول چاہئیں جو مشام جاں کو معطر کردیں اور جن کے سامنے دنیا کے پھول شرما جائیں ﴿**فوقع الحق و بطل ما کانوا یعملون**﴾

مدارس کا باطنی انحطاط

آپ برا نہ مانیں، کہنے والا بھی آپ ہی میں سے ہے، عرصہ سے ہمارے مدارس ان شاداب پھولوں سے خالی ہوتے جارہے ہیں، ان اوصاف میں روز افزوں انحطاط ہے، ہم کو دل پر پتھر رکھ کر سننا چاہئے، اور دیکھنا چاہئے کہ کہنے والے نے کہاں تک صحیح کہا ہے۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس سے جس تعداد میں لوگ فارغ ہو کر نکلتے ہیں اس سے پہلے اس تعداد میں نہیں نکلتے تھے، لیکن زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈال رہے ہیں۔

☆...... **ف** : بیشک یہ بات حضرت مصلح الامتؒ بھی برابر فرماتے رہتے تھے، کاش کہ ہمارے طلبہ اس طرف توجہ کرتے

تو آج مسلمانوں کا یہ حال زار نہ ہوتا۔ (مرتب)

انقلاب انگیز شخصیتیں

پہلے اسی ملک میں خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ یا سید علی ہمدانی کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جیسا ایک فقیر بے نوا آیا اور پورے ملک کو اپنے قلب کی حرارت اور اپنے ایمان کے نور سے بھر دیا، حضرت مجدد الف ثانی نے حکومت مغلیہ میں انقلاب برپا کردیا، انہیں کی خاموش مساعی کا نتیجہ تھا کہ ہم اکبر کے تخت پر اورنگ زیب جیسے فقیہ ومتشرع بادشاہ کو دیکھتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے اس طویل وعریض ملک کا رجحان بدل دیا اور پورے نظام فکر اور نظام تعلیم پر گہرا اثر ڈالا، مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عام مایوسی اور پسپائی کے دور میں اتنا بڑا اسلامی قلعہ تعمیر کردیا، اور علوم شریعت کو ایک نئی حیات بخش دی، ابھی پچھلے عرصہ میں مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان اور دینی جد وجہد کی ایک نئی روح پھونک دی، غرض.....

جہانے راد گرگوں کرد یک مرد خود آ گاہے
(یعنی ایک مرد خود آگاہ نے دنیا کا رنگ ہی بدل دیا)

اقتباسات

از

پندرہویں صدی ہجری

ماضی وحال کے آئینہ میں

پیش لفظ

پندرہویں صدی ہجری کا آغاز اگرچہ یکم محرم ۱۴۰۱ھ (۱۰/نومبر ۱۹۸۰) سے ہونے والا تھا، لیکن عالم اسلام میں بلکہ اس سے باہر بھی اس کی آمد آمد کا ۱۴۰۰ھ ہی سے شور بلند ہوگیا تھا، اور اس کے استقبال کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں، مختلف سیاسی اسباب، حوادث وواقعات، اور متعدد اسلامی تحریکوں کے اثر سے اس تبدیلی کو (جو ہر صدی کے اختتام پر ہوتی ہے) وہ اہمیت حاصل ہوگئی تھی جو اس سے پہلے مشکل سے کسی نئی صدی کو حاصل ہوئی ہوگی، عرب وغیر عرب ممالک میں جابجا مختلف ناموں اور عنوانوں سے کانفرنسیں اور سیمینار

منعقد کئے جارہے تھے، حتیٰ کہ خود ہندوستان کی سیکولر حکومت نے بھی اس کا جشن منایا اور یادگار ٹکٹ جاری کئے، اسلامی اخبارات ورسائل کے خصوصی نمبروں کے نکالنے کی تیاریاں شروع ہوئی، اس سلسلہ میں مختلف مرکزوں، تنظیموں اور اسلامی رسائل ومجلّات کی طرف سے راقم سطور سے مقالے کی فرمائش ہوئی، اور ان جلسوں میں شرکت کی دعوت دی گئی، جو اس موقع پر منعقد کئے جارہے تھے۔

لیکن اس عالمگیر ہماہمی کے باوجود مختلف طبعی اسباب کی بنا پر راقم کی طبیعت میں اس موضوع پر کچھ لکھنے یا کسی اجتماع میں تقریر کرنے کی تحریک نہیں پیدا ہوئی، عالم اسلام کی موجودہ صورت حال، اور تازہ واقعات وحوادث نے طبیعت کو ایسا افسردہ کردیا تھا کہ وہ اپنے اندر نئی صدی کے استقبال کا کوئی جوش وولولہ نہیں پاتا تھا، اس لئے اس نے زیادہ تر ان فرمائشوں اور دعوتوں کے جواب میں معذرت سے کام لیا، لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا، طلبہ کی اسلامی تنظیم (STUDENT ISLAMIC MOVEMENT) نے جو (S. I. M.) کے نام سے مشہور ہے، ملک میں پندرہویں صدی تقریبات کا ہفتہ منانے کا فیصلہ کیا، اس ہفتہ کا آغاز انہوں نے یکم نومبر ۱۹۸۰ء (مطابق ۲۲/ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ) کو گنگا پرشاد میموریل ہال

لکھنؤ کے ایک جلسہ سے کرنا چاہا اور اس کے افتتاح کیلئے مجھ
سے اصرار کیا، میں نے ان کے اصرار کی بنا پر، اور ان
نوجوانوں کی خاطر سے جو بڑے ولولہ اور امنگ سے یہ
تقریبات منا رہے تھے، اس کو منظور کر لیا، ذہن میں اس کے
سوا کچھ نہ تھا کہ میں چند منٹ تقریر کروں گا، اور بعض اہم
پہلوؤں کی طرف متوجہ کردوں گا، اس دن مجھے ضلع ایٹہ کی
ایک دینی تعلیمی کانفرنس میں شرکت کیلئے سفر کرنا تھا، اور وقت
میں اتنی ہی گنجائش تھی کہ میں ہال سے سیدھے اسٹیشن پہنچ
جاؤں، لیکن ماحول کا اثر، سامعین کی طلب اور شوق، اور سب
سے بڑھ کر ارادۂ الٰہی، کہ جب تقریر شروع کی تو بالکل بھول
گیا کہ مجھے سفر کرنا ہے، اور ابھی ٹرین پکڑنی ہے، شاید اگر قلم
ہاتھ میں لے کر اس موضوع پر لکھنے کی کوشش کرتا تو اتنی آمد نہ
ہوتی۔

تقریر ٹیپ کر لی گئی تھی، جب قلمبند ہوکر وہ میرے
سامنے آئی تو تقریر وتحریر کے مزاج کے اختلاف، اور ماحول
کے فرق کی وجہ سے اس میں جابجا اضافوں، ترمیم اور تنقیح کی
ضرورت محسوس ہوئی، کئی باتیں اپنے حافظہ پر اعتماد کر کے کہی
گئی تھیں، بعض تاریخی کتابوں کے اقتباسات تھے، جو اپنی یاد
سے سنا دیئے گئے تھے، تو اریخ وسنین اور حوالوں کی کمی تھی،

بعض اشارات تھے، جن کی توضیح وتفصیل کی ضرورت تھی، راقم
نے ان سب گوشوں کی طرف توجہ کی اور ان لوگوں کی مدد اور
رہنمائی کیلئے جو مزید وضاحت اور تفصیل کے طالب ومشتاق
ہوں، بڑی کتابوں اور ماخذوں کا حوالہ دے دیا، تاکہ یہ مختصر
مضمون مفصل اور مفید کتابوں کے مطالعہ کا محرک اور ذریعہ
بن جائے، اس طرح ایک برجستہ تقریر کو جو بغیر کسی تیاری کے
ہوئی تھی، ایک تاریخی مضمون کی شکل میں ڈھال دیا۔

اتفاق سے اس کے کچھ دن بعد آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ
کے اسٹیشن نے مجھ سے اس موضوع پر چند کلمات کہنے کی
فرمائش کی، موضوع کا ایک گوشہ اس مختصر گفتگو میں بھی آ گیا
جس کو راقم نے اس مضمون کی تمہید کے طور پر شامل کر دیا ہے۔

نظر ثانی، اضافہ، اور ترمیم کے بعد جب اس مضمون پر
نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ اب یہ مضمون اس قابل ہوگیا ہے کہ
اس کو شائع کر دیا جائے، وہ ایک مختصر تبصرہ، جائزہ اور پیغام
بن گیا ہے، اور اس میں چند اہم صدیوں کی تاریخ کا عطر آ گیا
ہے، مصنف کی اس میں ایک ذاتی غرض اور مصلحت بھی مضمر
ہے کہ وہ اس طرح روز روز اس موضوع پر خیالات کے اظہار
اور مضامین وتقریروں کی فرمائش سے بچ جائیگا، جن کا سلسلہ
جاری ہے، اور غالباً عرصہ تک جاری رہے گا، اس کو جو کچھ کہنا

تھا، یا کہنا چاہئے، وہ تقریباً تمام اس مضمون میں آگیا ہے۔

اگر اس مقالہ میں (جو اصلاً ایک تقریر کی شکل میں تھا) کسی صاحب نظر کو کوئی خلا یا نقص نظر آئے، یا کسی اہم شخصیت یا ادارہ کا نام نہ ملے تو اس کو سمجھنا چاہئے کہ یہ پچھلی صدیوں میں اصلاحی وتجدیدی کوششوں، اور اسلامی جدوجہد کی مفصل روداد یا اہم دینی واصلاحی شخصیتوں یا تحریکوں کی ڈائرکٹری نہیں ہے، یہ چند آخری صدیوں کی اصلاحی کوششوں کا مختصر تذکرہ ہے اور ایک مختصر جائزہ ہے، اور اس کا پیغام ہے کہ

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

اب وہ راقم سطور اور ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' کی طرف سے محض سال نو کا ایک تحفہ ہی نہیں، نئی صدی کا ایک تحفہ، اور اس کے لئے پیغام ہے، امید ہے کہ ان خامیوں سے چشم پوشی کی جائیگی، جو ایک تقریر اور مضمون میں ہوتی ہیں اور اس مخلصانہ تحفہ کو قبول کیا جائے گا۔

ابوالحسن علی ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ　　یکم محرم الحرام ۱۴۰۱ھ ۱۰ر نومبر ۱۹۸۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدلله والصلوة والسلام على رسول الله صلى الله عليه وسلم ،

اس وقت دنیا میں پندرہویں صدی ہجری کی آمد آمد کا چرچا ہے، اس صدی کا آغاز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعۂ ہجرت سے ہوتا ہے، عام طور پر صدیوں کا آغاز کسی بڑی شخصیت کی پیدائش یا وفات، قیام سلطنت یا عظیم فتوحات سے ہوا ہے، اور اس سے ایک مستقل تقویم (جنتری) وجود میں آئی ہے، لیکن اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے اپنے دین کا نام بھی اپنے پیغمبر کے نام پر نہیں رکھا، بلکہ پیغام پر رکھا ہے، اسلام کسی شخصیت کا نام نہیں ہے، اسلام ایک فیصلہ اور طرز عمل کا نام ہے، یعنی خدا کے احکام کے سامنے سر جھکا دینا، یہی خصوصیت اس صدی کی ہے، اس صدی کا آغاز بھی کسی بڑی شخصیت، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب ومحترم شخصیت سے بھی نہیں ہوتا، جو مسلمانوں کے عقیدہ اور نظر میں اللہ کے بعد سب سے محبوب ومحترم شخصیت ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن نہ آپؐ کی پیدائش سے اس صدی کا تعلق ہے، اور نہ آپؐ کی وفات سے، حالانکہ دونوں دنیا کے اہم ترین واقعات ہیں، بلکہ آپ کے واقعۂ ہجرت سے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نئی اسلامی صدی شروع ہوگی تو ایک پیغام لے کر آئیگی، وہ محض ایک شخصیت یا جماعت کی یاد تازہ نہیں کرتی، بلکہ ایک پیغام کی یاد تازہ کرتی ہے، یعنی یہ کہ آپؐ نے ایک عظیم مقصد کیلئے اپنے عزیز وطن کو خیر باد کہا، اور ایک نئے شہر میں بودوباش اختیار کی، یہ بات ایک پیغام، اور ایک بڑے اقدام کو یاد دلاتی ہے، آپ نے اتنا بڑا اقدام اپنی یا اپنے چند دوستوں اور ساتھیوں کی جان بچانے کیلئے نہیں کیا تھا بلکہ خدا کے پیغام کو محفوظ کرنے اور اس کو ساری دنیا تک پہنچانے کا موقع مہیا کرنے کیلئے کیا تھا، تو یہ صدی ہم کو یاد دلاتی ہے کہ کسی عظیم مقصد کیلئے عزیز سے عزیز چیز کو چھوڑا جاسکتا ہے، اور اتنا بڑا اقدام کیا جاسکتا ہے، دنیا کی تاریخ میں یہ ایک ہمت افزا اور حیات آفریں پیغام ہے، جو ہمت دلاتا ہے کہ کوئی چیز خواہ کیسی ہی نرالی اور کیسی ہی اجنبی ہو، اور اس کی راہ میں کیسی ہی رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا کی جائیں، اور کیسے ہی ناسازگار حالات ہوں، اور اس کو کیسی ہی شدید مخالفتوں اور عداوتوں کا سامنا کرنا پڑے، اگر اس سے انسانیت کی فلاح مقصود ہے، نیت میں خلوص ہے اور ارادہ میں

عزم وپختگی، تو ساری مخالفتوں کے باوجود وہ پیغام زندہ رہے گا اور اس کی قسمت میں کامیابی وکامرانی لکھی ہوئی ہے۔

اس لئے یہ پندرہویں صدی صرف مسلمانوں ہی کو ہمت کا پیغام نہیں دیتی، بلکہ پوری نوع انسانی کو اور ان سب لوگوں کو جو کوئی صحیح مقصد رکھتے ہیں، کسی مفید دعوت کے علم بردار ہیں، کسی اچھی بات کیلئے جدوجہد کرنا چاہتے ہیں، کسی عظیم مقصد کیلئے وہ کھڑے ہوئے ہیں ان سب کیلئے حیات نو کا پیغام ہے۔

لیکن یہ پندرہویں صدی مسلمانوں اور بالواسطہ انسانیت کے حق میں مبارک ثابت ہوگی، یا (خدانخواستہ) منحوس و نامبارک؟ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہوسکتا، وہ چند فیصلے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہیں، اور قرآنی حقیقتیں اور صداقتیں جو ابدی ہیں، ان میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ:

و ان لیس للانسان الا ما سعی (النجم/۳۹) اور انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

انسان کو اپنی زندگی، اور زندگی کے بعد کی زندگی میں اتنا ہی حصہ ملتا ہے جس کی اس نے کوشش کی، اس کے حصے میں اس کی سعی آئیگی، اور سعی کے نتائج آئیں گے، اس کے بعد فرماتا ہے:

و انّ سعیه سوف یریٰ (النجم/۴۰) اور یہ کہ انسان کی سعی بہت جلد دیکھ لی جائیگی۔

یہ ایک حیات آفریں پیغام ہے، تمام انسانی نسلوں ، اور تاریخ کے تمام دوروں کیلئے کہ انسان کی کوشش کا نتیجہ ضرور برآمد ہوگا، اوراس کے اثرات ونتائج مشاہدہ میں آئیں گے۔

ثم یجزٰہ الجزاء الاوفی (النجم / ۱۴)　　پھر اس کو اس کی کوشش کا بھرپور بدلہ ملے گا۔

انسانی سعی کی جس نتیجہ خیزی، اور بار آوری کا اس آیت میں اظہار کیا گیا ہے وہ ایک حوصلہ افزا اور حیات بخش پیغام ہے، اقبال نے انسان کیلئے کہا تھا۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

میں صدی کے متعلق یہی شعر پڑھوں گا ''خاکی'' کی جگہ آپ ''صدی'' کہہ لیجئے ، یہ پندرہویں صدی ، اور وہ صدیاں جو گذر چکی ہیں، سب کے متعلق حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت میں نہ مبارک ہیں نہ منحوس، اس کے مبارک ومنحوس ہونے کا فیصلہ انسانوں کی کوششوں کے صحیح رخ پر ہونے ، اور صحیح طریقہ پر انجام پانے پر منحصر ہے، ہم کسی صدی کے متعلق ، بلکہ کسی سال ، کسی مہینہ، کسی دن، کسی ساعت کے متعلق بھی پہلے سے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ مبارک ہوگی یا منحوس؟ اسلام میں برکت ونحوست کے اس بے لچک نظریہ کا وجود نہیں، جو بعض جاہلی قوموں میں

(جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے محروم رہی ہیں) اب بھی پایا جاتا ہے، ہم یہ کہیں کہ آنے والی صدی بہت مبارک ہے اور یہ ملت کی اقبال مندی کا دور ہوگا، یا یہ صدی کسی ملت، یا تقدیر انسانی کے حق میں منحوس ثابت ہوگی، یہ بالکل اسلامی طرز فکر نہیں ہے اور کتاب وسنت سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی، اس لئے کہ یہ تخیل کہ فلاں وقت دائمی طور پر اپنی جگہ پر مبارک ہے یا منحوس، انسانی قوت عمل کو سخت نقصان پہنچانے والا ہے، اگر انسان پہلے سے یہ سمجھ جائے کہ کوئی ساعتِ نحس آنے والی ہے، یا فلاں گھڑی منحوس ہے تو اس کے قویٰ مضمحل ہو جائیں گے اور اس کی قوت عمل کیا بلکہ قوت فیصلہ بھی جواب دے جائیگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہم پرستی ، بلکہ غالیانہ خوش عقیدگی ، اور شخصیت پرستی کی جڑ پر تیشہ چلایا ، ایک مرتبہ سورج گرہن ہوا، خدا کو اس امت کی تربیت مقصود تھی ، اس سے کچھ پہلے ہی فرزند رسول سیدنا ابراہیم کا انتقال ہوا تھا، عرب جاہلیت سے قریب العہد تھے، اور اس کے اثرات تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے، واقعہ بھی ایسا غیر معمولی اور ایسا جذباتی تھا کہ بعض مسلمانوں کی زبان سے یہ نکلا کہ کیوں نہ ہو، اللہ کے پیغمبر کے فرزند کا انتقال ہوا اور سورج اس سے متأثر نہ ہو؟ دنیا کا کوئی داعی، کوئی پیشوا، کسی تحریک کا علم بردار، کسی انسانی جماعت کا قائد ہوتا تو کم سے کم

درجہ یہ تھا کہ اگر اس کی تردید نہ کرتا تو خاموش رہتا کہ یہ بات ہماری تحریک کے مفاد میں جاتی ہے، میں نے تو کہلوائی بھی نہیں ،خود بخود لوگوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ سورج گرہن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے کے انتقال پر ہوا ہے، اس کی تردید کچھ ضروری نہیں ہے! یہی فرق ہے پیغمبر اور غیر پیغمبر میں کہ سیاسی ذہن رکھنے والے جن واقعات سے فائدہ اٹھاتے ہیں (خواہ وہ واقعات غیر اختیاری طریقے پر پیش آئے ہوں) پیغمبر دین کا نقصان کر کے ان سے فائدہ اٹھانا حرام اور کفر کے مرادف سمجھتا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اس امتحان میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کوئی پورا اترا ہو، پیغمبروں کی جماعت میں بیشک اس کی مثال مل سکتی ہے، لیکن بانیانِ جماعت، اور سیاسی رہنماؤں کے یہاں نہیں مل سکتی، آپ نے اس پر مستقل خطبہ دیا اور فرمایا:

ان الشمس والقمر اٰیتان من اٰیات الله لایخسفان لموت احد و لا لحیاته (صحیح مسلم)

سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، ان کو کسی کی موت یا زندگی پر گرہن نہیں لگتا۔

گویا آپ نے فرمایا: تم نے کیا کہا؟ سورج اور چاند میں کسی کے مرنے اور کسی کے جینے پر کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا یہ تو اللہ کی

نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، اور ان کا قانون دوسرا ہے، وہ اسی قانون کے پابند ہیں، ان پر کسی بڑی ہستی کے دنیا سے چلے جانے، یا کسی بڑی شخصیت سے تعلق رکھنے والے کسی واقعہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا، اس موقع پر اگر آپ خاموشی اختیار فرماتے تو اس سے دنیا میں کوئی عظیم فساد پیدا ہونے والا نہیں تھا، بس ایک غلط خیال جو خوش عقیدگی اور محبت وعظمت پر تھا، پیدا ہوا تھا اور اضطراری طور پر پیدا ہوا تھا، اللہ کا رسول اس کو بھی برداشت نہ کر سکا، اور کہا کہ نہیں نہیں! میرے خاندان یا میری اولاد سے اس واقعہ کا کوئی تعلق نہیں، کائنات اس سے زیادہ وسیع اور اللہ کی ذات اس سے غنی ہے، اللہ کا قانون ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے، یہ ایک اصولی رہنمائی تھی، جو پوری نسل انسانی کو دی گئی، ذہن انسانی نسل انسانی سے بھی زیادہ قیمتی اور قابل لحاظ ہے، وہ ساری نسل انسانی پر حکومت کرتا ہے، نسل انسانی ذہن انسانی پر حکومت نہیں کرتی، یہ ذہن انسانی کا انحراف تھا جو بہت خطرناک ہے اور اس کا علاج اور سد باب ضروری ہے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کوئی صدی اپنی جگہ پر نہ مبارک کہی جا سکتی ہے نہ منحوس، میں گلاس کی مثال دوں گا، گلاس اگر خالی ہے تو آپ اس کے متعلق کوئی حکم نہیں لگا سکتے کہ یہ گلاس اچھا ہے یا برا ہے؟ اس کا انحصار اس ''مظروف'' پر ہے جس کا گلاس ظرف

ہے، یہ پانی کا گلاس ہے، خدانخواستہ اگر شراب ہوتی تو شراب کا جام ہوتا، اگر اس کے اندر زہر بھرا ہوتا تو یہ زہر کا پیالہ ہوتا، یہ گلاس اپنی جگہ پر ایک معصوم، ایک بالکل غیر جانبدار چیز ہے، آپ پر منحصر ہے کہ آپ اس کو کس چیز سے بھرتے ہیں؟ آپ اس کو زمزم سے بھرتے ہیں تو یہ زمزم کا گلاس ہے، اگر خدانخواستہ اسے شراب سے بھرتے ہیں تو یہ شراب کا پیمانہ ہے، اس لئے نسل انسانی کے حق میں یہ صدی کیا ثابت ہوگی، مبارک ہوگی یا منحوس ہوگی؟ اس کا سراسر انحصار ہماری اور آپ کی اور امت کی سعی پر ہے، جس کو خدا نے اپنے آخری پیغام کا حامل بنایا ہے۔

☆☆☆

اس کے بعد حضرت مولانا نے تاتاریوں کے اس حملے کو ذکر فرمایا ہے جو ۶۱۶ھ میں اس وقت کی سب سے بڑی شہنشاہیت علاء الدین خوارزم شاہ کی سلطنت پر ہوا۔

یہ ساتویں صدی ہجری کا آغاز تھا اور تیرہویں صدی مسیحی چل رہی تھی تاتار مور و ملخ کی طرح اٹھے اور عالم اسلام پر چھا گئے ترکستان وایران کو زیروزبر اور پورے پورے شہروں کو انہوں نے تاراج و بے چراغ بنا دیا، انسانی سروں اور لاشوں کے مینارے بنائے، جن پر چڑھ چڑھ کر انہوں نے صدا لگائی، پورے پورے شہر قبرستانوں میں تبدیل ہو گئے۔

اس واقعہ کو مسلمانوں نے کس نظریہ سے دیکھا، اس کا اندازہ اس مشہور مقولہ اور کہاوت سے کیا جاسکتا ہے جو اس زمانہ میں مسلمانوں کی زباں زد تھی:

" اِذا قیل لک ان التتر انهزموا فلا تصدق "

ہر بات مان لینا لیکن جب یہ کہا جائے کہ کسی معرکہ میں تاتاریوں نے شکست کھائی تو اس کو باور نہ کرنا۔

علاء الدین خوارزم شاہ کی ایک غلطی سے تاتاری اپنے صدیوں کے "حصار" سے نکلے تھے، جس کی تفصیل آپ تاریخ میں پڑھ سکتے ہیں، نشانہ مسلمان تھے، اور انہوں نے وہاں سے نکل کر پورے ترکستان، اور ایران وعراق کا تختہ الٹ دیا تھا، اور ان ملکوں کی حکومت اور تہذیب وتمدن کا چراغ گل کر دیا تھا، یہی وقت ہے جب ذہین انسانوں کے قافلے تیزی کے ساتھ ہندوستان کی طرف آئے اور ان کو یہاں پناہ ملی، یہ تیرہویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔

اس وقت ہر حساس آدمی جس کو خدا نے دیکھنے کے لئے دو آنکھیں دی تھیں، اور مقدمات و اسباب سے نتائج نکالنے کی صلاحیت عطا کی تھی، پیشین گوئی کرسکتا تھا کہ اسلام کے دن پورے ہو چکے ہیں، مسلمانوں کا ستارۂ اقبال اب ہمیشہ کیلئے غروب ہو رہا ہے، اس عالم آشوب واقعہ سے مسلمانوں کو اصل

نقصان پہنچا تھا، کیونکہ وہی اصل نشانہ تھے، اسی لئے سب سے زیادہ مسلمانوں کیلئے کام کرنے کا میدان تنگ تھا، اور سب سے کم اُمیدان کیلئے تھی۔

آرنلڈ نے اپنی کتاب (PREACHING OF ISLAM) (اسلام کی نصیحت) میں مسلمانوں کی مایوسی، اور شکستہ دلی کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے، آرنلڈ لکھتا ہے:

"(اسلام کے علاوہ) دو مذہب اور اس بات کی کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تاتاریوں کو اپنا حلقہ بگوش بنائیں، وہ حالت بھی عجیب وغریب، اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہوگی، جس وقت بودھ مذہب اور عیسائی مذہب، اور اسلام اس جدوجہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں کو جنھوں نے تین بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو پامال کیا تھا، اپنا مطیع بنائیں۔

اسلام کیلئے ایسے وقت میں بودھ مذہب، اور عیسائی مذہب کا مقابلہ کرنا اور مغلوں کو ان دونوں مذہبوں سے بچا کر اپنا پیرو بنانا ایسا کام تھا جس میں بظاہر کامیابی ناممکن معلوم ہوتی تھی۔"

سارے قرائن اس بات پر دلالت کرتے تھے کہ عیسائیت کو کامیابی ہوگی، اس لئے بھی کہ اس جنگ میں عیسائیت اصل فریق نہیں بنی تھی، اور دوسری مشکل یہ تھی کہ چنگیز خاں کے شہزادوں کے گھر میں عیسائی عورتیں تھیں، اور ان کے پادری ان کے

درباروں میں تھے، اس لئے اگر قبول مذہب کا سوال ہوتا تو حتمی طور پر یہ بات کہی جاسکتی تھی کہ وہ تنہا عیسائیت کو قبول کریں گے، لیکن آپ کو معلوم ہے کیا ہوا؟ آرنلڈ کو یہ الفاظ لکھنے پڑے کہ:

"بالآخر اپنی گذشتہ شان وشوکت کے خاکستر سے اسلام اٹھا اور واعظین اسلام نے ان ہی وحشی مغلوں کو جنھوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کرلیا۔"

آرنلڈ مزید لکھتا ہے:

"باوجود ان مشکلات کے، مغلوں اور وحشی قوموں نے جو بعد میں آئیں، انہیں مسلمانوں کا مذہب قبول کیا جن کو انہوں نے اپنے پیروں میں روندا تھا۔"

پس وہ صدی جس کا آغاز عالمگیر تاریکی، اور عالمگیر مایوسی سے ہوا تھا وہ صدی اسلام کی "فتح مبین" کی صدی بن گئی اور دنیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بلکہ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں کہ وہ تاتاری جن کی تلواروں سے ابھی مسلمانوں کے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے وہ اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے۔

آپ جانتے ہیں کہ کس نے تاتاریوں کو فتح کیا اور کس نے تاتاریوں کو اسلام کا کلمہ پڑھایا؟

اس نازک گھڑی اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اہل دل سامنے آئے، جن کے اندر روحانی طاقت تھی، اور تقریباً نصف

صدی کے اندر اندر انہوں نے تاتاریوں کو من حیث القوم مسلمان بنالیا۔

اس کے بعد حضرت مولانا بادشاہ تغلق تیمور کا واقعہ اور اعیان مملکت کے اسلام لانے کا واقعہ تفصیل سے بیان کرنے کے بعد یوں رقمطراز ہیں:

یہ مسلمان دانشور، مخلص علماء، واعظین، مبلغین اور سب سے بڑھ کر اہل دل کا کارنامہ تھا، اس حقیقت میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں، پوری تاریخ شہادت دیتی ہے کہ ان اہل دل نے اندر اندر کام کیا ہے، اور تاتاری ان کے نامۂ اعمال میں ہیں، یہ لاکھوں انسان (جنھوں نے تاریخ پر اثر ڈالا ہے) قیامت کے دن جب اٹھیں گے تو انہیں کے حساب میں شمار ہوں گے، ان اہل دل کا ذکر کرتے ہوئے اکبر الٰہ آبادی مرحوم کا ایک شعر بے اختیار زبان پر آرہا ہے ؎

اچھے وہی ہیں آج جو سوتے ہیں زیر گل
افسوس ہے انہیں کے ہزاروں گلے ہوئے

اس کے بعد حضرت مولاناؒ دسویں صدی ہجری (یعنی اکبری دور) کی ضلالت اور اسلام کے خلاف بغاوت کے حالات یوں ارقام فرماتے ہیں:

چنانچہ یہاں ہندوستان میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک قوی الارادہ، صاحب عزم، ذہین، فاتح اور کشور کشا سلطان وقت کے

ساتھ اس وقت کی نسل کے چند ذہین ترین علماء اور دانشور (جن میں ابوالفضل اور فیضی کا نام سب سے نمایاں ہے) ایک تحریک میں شامل ہوگئے، جس کا مقصد ہندوستان کا رخ اسلام سے ہٹا کر اکبر کے دین الٰہی اور اس وحدت ادیان کی طرف موڑنا تھا جس میں پلڑا ہمیشہ دوسری طرف جھکا ہوا تھا۔

یہ مادی طاقت اور ذہانت دونوں کا خطرناک سنگم تھا، یا اسلام کے خلاف مطلق العنان سلطنت، اور بے قید اور آزاد عقلیت کی سازش تھی جس کی مثالیں تاریخ میں کم ملتی ہیں، اس وقت اس بات کو برملا کہا جانے لگا تھا کہ دسویں صدی ختم ہورہی ہے گیارہویں صدی شروع ہونے والی ہے، کسی دین کیلئے ایک ہزار سال کی مدت بہت ہوتی ہے۔

پھر کیا ہوا؟

دسویں صدی کا آخر یہ خبر لے کر آیا کہ اسلام کے قدم اس ملک سے اکھڑ رہے ہیں، اب ہندوستان میں سیاسی اقتدار ہی نہیں، دینی اور روحانی اقتدار بھی دوسری طاقتوں کی طرف منتقل ہورہا ہے، یہ انقلاب ان فاتحین کی کوششوں پر پانی پھیر رہا تھا جنھوں نے کئی صدی قبل اپنی جان کی بازی لگا کر اس ملک کو فتح کیا تھا اور دوسری طرف حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے پاک نہاد خلفاء کی کوششوں پر جنھوں نے اپنے اپنے گوشے

میں بیٹھ کر سعید روحوں کو انسانیت اور محبت، مساوات انسانی اور عدل اجتماعی (SOCIAL JUSTICE) کا درس دیا تھا، باہر رہ کر حکومت وقت کی دینی و اخلاقی نگرانی کی تھی، اور حکومت و معاشرہ کو صالح، قوی، اور امانت دار، خداترس، انسانیت دوست افراد مہیا کئے تھے، اور ملک کی علمی و تعلیمی تحریک میں بھی نئی روح پھونک دی تھی۔

پھر کیا ہوا؟

مجھے کہنا پڑتا ہے کہ سیاسی افق سے نہیں، کسی مادی افق سے نہیں، صرف اسی ایمان وروحانیت کے گوشے سے، اسی اخلاص و للّٰہیت کے گوشہ سے، اسی علم وحکمت کے گوشہ سے جو ہمیشہ اپنا کام کرتا رہا ہے اور جس نے گرتوں کو سنبھالا ہے، ایک ستارہ طلوع ہوتا ہے، جس کا نام شیخ احمد سرہندی حضرت مجدد الف ثانی (۹۷۱ھ ...۱۰۳۴ھ) ہے جس کے متعلق اقبال نے کہا ہے۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمئ احرار

اسلام کے خلاف اس سازش کا مقابلہ کرنے کیلئے جس میں اس وقت کے ذہین ترین انسان شریک تھے، ایک فقیر بے نوا

سرہند کے گوشہ میں بیٹھ کر یہ عزم کرتا ہے کہ یہ نہیں ہونا ہے، انہوں نے کہا کہ مسلمان اس ملک میں باعزت وآزاد طریقہ پر رہنے اور اپنے دینی شعائر کو باقی رکھنے کے حق سے کیوں محروم کئے جاتے ہیں، اور صرف انہیں پر زندگی کا میدان کیوں تنگ کیا جارہا ہے؟

پھر کیا نتیجہ ہوا؟

گیارہویں صدی جب شروع ہوئی تو دنیا نے دیکھا کہ رنگ بالکل بدل گیا ہے، اس کے بعد دوتین صدیوں تک کے لئے اسلام کا مستقبل اس ملک میں بالکل محفوظ کردیا گیا، اس وقت اللہ کا یہ بندہ سرہند میں بیٹھ گیا، نبوت و رسالت محمدی کی ضرورت وبقا اور شریعت وسنت کے مقام ودوام کے خلاف جو علمی واشراقی مغالطے تھے، ان کا پردہ چاک کیا، اور اس پر اعتماد بحال کیا، دوسری طرف اس خطرہ کا سد باب جو تیزی سے بڑھ رہا تھا اس کی حکمت عملی (STRATEGY) کیا تھی؟ کوئی شور نہیں، کوئی ہنگامہ نہیں، اکبر کے خلاف کسی طاقت کو منظّم کرنے کی کوشش نہیں، اس کے تاریخی مطالعہ نے بھی، اور اس کی قرآنی بصیرت نے بھی اس کو بتایا کہ اگر حریف بن کر سامنے آؤ گے تو کچل دیئے جاؤ گے، تمہیں کام کرنے کا کوئی وقت نہیں ملے گا، اللہ سے دعائیں کرو، اپنے گرد مخلص لائق افراد کو اکٹھا کرو، ان کی ہمہ گیر تربیت کرو، وہ

دولت اور حکومت کے دریا سے گذر جائیں، لیکن ان کا دامن بھی تر نہ ہو، وہ جاہ وحشمت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں، جو مسلمان امراء دربار جہانگیری میں اعلیٰ عہدوں اور ذمہ داریوں پر فائز تھے، ان کے دلوں کو چھوؤ، ان کو لکھو کہ ''ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام اس وقت موت وزندگی کے آخری مرحلہ سے گذر رہا ہے، آپ کو کچھ کرنا چاہئے، جارحانہ طریقہ سے نہیں، بالکل تعمیری علمی اور فکری طور پر، اور دل کے اعتقاد اور یقین کے ساتھ۔''

مجدد صاحبؒ نے خط وکتابت شروع کی، ان لوگوں کے ناموں کی فہرست طویل ہے، جن سے انہوں نے مراسلت کی، ان میں عبدالرحیم خان خاناں اور نواب مرتضٰی خاں (سید فرید) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، نتیجہ کیا ہوا؟ پندرہ بیس برس کے عرصہ میں ماحول بدل گیا۔ ہندوستانی مسلمان صرف ہندوستان کیلئے نہیں، پورے عالم اسلام کیلئے مرجع ومرکز بن گئے، روحانیت میں، علم حدیث اور عربی لغت تک میں (جو خالص عرب ملکوں کی چیز تھی) یہ اسی برگزیدہ شخصیت کی کوششوں کا نتیجہ ہے، جس کی وجہ سے ہندوستان کو وہ دینی مرکزیت حاصل ہوئی، اور علوم دینیہ کے بلند پایہ ماہر ومحقق پیدا ہوئے، پھر چراغ سے چراغ جلا اور کچھ عرصہ بعد حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ (١١١٤....١١٧٦ھ) کی شخصیت سامنے آئی، جنہوں نے ایک نیا ''علم کلام'' پیدا کیا، نظام

خلافت کی ایسی تشریح وتفصیل اور صحیح اسلامی حکومت کا خاکہ پیش کیا جو علمی طور پر اس سے پہلے شاید پیش نہیں کیا گیا تھا، اسی کے ساتھ انہوں نے ہندوستان کی گرتی ہوئی مسلم حکومت کو (جس کا بدل اس وقت موجود نہیں تھا) سہارا دینے اور اس کے جسم میں نیا خون پہنچانے کی کوشش کی کہ اس کی شکست وریخت سے ہندوستان میں سخت سیاسی واخلاقی انتشار کا خطرہ تھا۔

ان کے باکمال اور باتوفیق فرزندوں نے (جن میں حضرت شاہ عبدالعزیز پیش پیش تھے) اس ملک میں کتاب وسنت کا علم عام کیا، قرآن مجید کے مطالعہ اور فہم کا ذوق پیدا کیا، حدیث کی اشاعت کی، اور عقائد، اعمال ورسوم کی اصلاح کا عظیم الشان کام انجام دیا۔　(حوالہ بالا، ص:٢٩)

☆☆☆

پندرہویں صدی اب پورے عالم پر سایہ فگن ہوگئی ہے، اگر ملت اسلامیہ اور عالم اسلام اس عظیم سرمایہ اور اس اعتقادی، فکری، علمی، سیاسی، طبعی اور انسانی ثروت وصلاحیت طاقتور تحریکوں اور کثیر التعداد آزاد ملکوں اور وسیع سلطنتوں سے بھی محروم ہوتا، جس کی طرف کچھ مختصر اشارے اوپر گذر گئے ہیں، تب بھی خدا کی رحمت سے مایوس ہونے کی ضرورت نہ تھی کہ اس کے پاس قرآن مجید کا یہ صحیفہ اور اللہ کا آخری اور ابدی دین (اسلام) موجود ہے

جس کی وجہ سے ہر زمانہ میں ملت کے تن مردہ اور قلب افسردہ میں زندگی کی نئی روح پیدا ہوتی رہی ہے، اور معجزات وعجائبات کا ظہور ہوا ہے۔

پھر مسلمان ہی اس دور میں تنہا انسانیت کی امیدوں کی پناہ گاہ، خدا کا آخری پیغام اور انسانیت کے امین و پاسبان ہیں، شاید یہ صدی ایک ایسا فیصلہ کن موڑ لائے جو پورے عالم انسانی پر اثر انداز ہو، اللہ کی رحمت سے ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے، انسانیت کی زبوں حالی انسانوں کی ذلت ونگوساری، اپنے آخری نقطہ پر پہنچ چکی ہے، یہی وقت ہوتا ہے جب رحمت الٰہی بلکہ غیرت الٰہی کو حرکت ہوتی ہے، اور دنیا میں کوئی بڑا انقلاب آتا ہے۔

مغربی تہذیب کو پورے طور پر گھن لگ چکا ہے، وہ اب محض اپنی صلاحیت اور زندگی کے استحقاق کی بنا پر نہیں جی رہی ہے بلکہ اس لئے کہ بدقسمتی سے کوئی دوسری تہذیب اس کی جگہ لینے کیلئے تیار نہیں، اس وقت جتنی تہذیبیں یا قیادتیں ہیں، یا مغربی تہذیب کی لکیر کی فقیر، اور اس کی روکھی پھیکی تصویر ہیں، یا اتنی کمزور اور شکست خوردہ ہیں کہ اس سے آنکھیں نہیں ملا سکتیں، اب اگر اسلامی ممالک اور عالم اسلام مجموعی طور پر اس خلا کو پر کرنے کی صلاحیت پیدا کرسکے جو

مغربی تہذیب کے خاتمہ سے عالم انسانی میں پیدا ہوگا تو اس کو دنیا کی امامت کا دوبارہ منصب تفویض کیا جاسکتا ہے، جو سنت اللہ کے مطابق ایک جری وقوی اور تازہ دم ملت یا قیادت کے سپرد کیا جاتا رہا ہے، اب ان قائدین کو یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ کیا مغرب کی دائمی غاشیہ برداری، اور کشکول گدائی مناسب ہے، یا دنیا کی رہنمائی کا منصب عالی اور عالم انسانی کی ہدایت کی مسند رفیع جس سے (نبوت کے بعد) بڑھ کر کوئی سرفرازی اور سربلندی نہیں، کیا اس کیلئے ظاہری نام و نمود، عہدہ ومنصب، لذت و راحت اور مادی و جسمانی ترغیبات کی قربانی کوئی حقیقت رکھتی ہے، اگر اس کے لئے سو جانیں بھی قربان کی جائیں تو درحقیقت گھاٹے کا سودا، اور زیاں ونقصان کا معاملہ نہیں ۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

میں اپنے اس مختصر جائزہ اور اس مخلصانہ پیغام کو اقبالؔ کے ان روح پرور اور حیات آفریں اشعار پر ختم کروں گا، جن میں انہوں نے مسلمان کو مخاطب کرکے کہا ہے ۔

ناموس ازل را تو امینی تو امینی — دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی — صہبائے یقین درکش واز دیر گماں خیز

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں، از خواب گراں، از خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

پندرہویں صدی میں عالم اسلام کیلئے
دس نکاتی نظام

ساتویں صدی اور دسویں صدی ہجری میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے جو واقعات اور اسباب بیان کئے گئے ان سے نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ اسلامی معاشرہ کو ہر دور میں ایسے ربانی، حقانی، بیدار مغز، عالی ہمت مصلحین اور داعیوں کی ضرورت ہے جو دعوت الی اللہ اور نفوس قدسیہ کی اصلاح وتقویت کا کام ناسازگار سے ناسازگار ماحول میں انجام دیں، جب اسلامی حکومتیں زیر وزبر ہورہی ہوں، مال ودولت کے حصول کی ایک اندھی ''ریس'' جاری ہو، وہ گرتے ہوئے دلوں کو تھامنے اللہ تعالیٰ سے ان کو جوڑنے اور ان میں تازہ ایمان ویقین، محبت وخوف الٰہی اور اعتماد وتوکل پیدا کرنے کے کام میں لگ جائیں، وہ لوگوں کو پست اغراض سے بلند رہنے کا سبق دے رہے ہوں، دنیا کے مال ومتاع کی حقارت ان کے

دلوں میں جاگزیں کررہے ہوں، دولت وحشمت اور سلطنت وقوت کے سامنے سرنگوں اور سجدہ ریز ہونے، ضمیر وملت فروشی اور ملکوں اور قوموں کا سودا کرنے سے بیزار اور بالاتر بنائیں، اور عقیدہ واصول کیلئے قربانی اور راہ خدا میں شہادت کی آرزو سینوں میں بیدار کردیں، ناامیدیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکال کر رحمت ونصرت الٰہی کی روشنی میں لے آئیں، زوال آمادہ اور کرم خوردہ معاشرہ کو ایسے اہل، طاقتور اور امانتدار اشخاص مہیا کریں جو حکومت کی نازک سے نازک ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں، اور اسلام کی سرحدوں کی حفاظت ونگہداشت کرسکیں، یہ وہ ربانی، حقانی لوگ ہیں جو اپنے اپنے معاشرہ وماحول میں وہ خدمت انجام دیتے ہیں جو خواجہ حسن بصریؒ نے بنوامیہ کے دور میں اور حافظ ابن جوزیؒ، حجۃ الاسلام امام غزالیؒ اور سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ نے عباسیوں کے دور میں انجام دی تھی۔

ان ربانی اشخاص کا وجود ہر ملک اور ہر زمانہ کی بنیادی ضرورت ہے، وہ اس وقت کامیاب وبامراد ہوتے ہیں جب حکومتیں ناکام ونامراد ہوجاتی ہیں، ان کا علم دولت واقبال اس وقت بلند ہوتا ہے جب حکومتوں اور طاقتوں کے فلک بوس جھنڈے سرنگوں ہوجاتے ہیں، اسلامی معاشرہ کیلئے سب

سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ وہ ان نفوس قدسیہ سے سراسر محروم ہو جائے، بہت سے وہ اسلامی اور عرب ملک جہاں اللہ تعالیٰ نے رزق اور اپنی نعمتوں کے دہانے کھول دیئے ہیں وہاں آج بشدت یہ ”دعوتی و روحانی خلا“ محسوس ہوتا ہے، یہ خلا وسیع تنظیمات، عظیم علمی اداروں، سیاسی واشاعتی سرگرمیوں، فلک شگاف نعروں اور خدمت دین کے بلند بانگ دعووں سے پر نہیں کیا جا سکتا۔

دینی دعوت اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کیلئے جو کوششیں دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں میں، مختلف انداز سے، اور اپنی اپنی بصیرت، تجربے اور حالات کے تقاضے سے ہو رہی ہیں ان کو اپنے اپنے مرتبے پر رکھتے ہوئے اور ان کی کسی نہ کسی درجہ میں افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس پندرہویں صدی ہجری میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور مسلم معاشرہ کو مزید انحطاط وزوال کے خطرے سے بچانے اور نئی صدی کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کیلئے کچھ متعین نکات (POINTS) اور چند واضح خطوط (LINES) (خواہ ان کی حیثیت اشارات اور عنوانات سے زیادہ نہ ہو) پیش کر دیئے جائیں، شاید با توفیق اور بلند حوصلہ کارکنوں اور اسلام اور مسلمانوں کیلئے فکرمند جماعتوں کو ان

سے کچھ روشنی یا مدد حاصل ہو:

☆......(۱) مسلم عوام میں ایمان وعقیدہ کو طاقت پہنچانے (جس کی چنگاریاں ان کے خاکستر میں بہرحال موجود ہیں) اور ان کے دینی شعور کو بیدار و متحرک بنانے کی ضرورت ہے، ان مسلم عوام کی اسلام کے ساتھ وابستگی اور اس کے لئے گرم جوشی (خواہ وہ بعض اوقات حالات وحوادث ہی کا نتیجہ ہو) ایک ایسی بلند و مستحکم فصیل اور اسلام کا آہنی حصار ہے جس کی بدولت بہت سے مسلم (یا مدعی اسلام) قیادتوں اور حکومتوں کو کھل کر کفر کا راستہ اختیار کرنے، اور اپنے ملکوں اور ماتحت مسلم قوموں کو کفر والحاد کی آغوش میں ڈال دینے کی ہمت نہیں ہوتی، اور اسلام ان تمام سازشوں اور منظّم اور وسیع منصوبوں کے باوجود جو اس کو ان ملکوں سے بے دخل کرنے کیلئے اندرون یا بیرون ملک تیار کئے جاتے ہیں، ان ملکوں میں زندہ اور کسی نہ کسی درجہ میں فعال اور مؤثر ہے، خدانخواستہ اگر کسی دن یہ حصار ٹوٹ گیا اور مسلم عوام کا رشتہ اور ان کی روحانی وابستگی اور جذباتی وابستگی اسلام سے ختم ہو گئی تو پھر ان ملکوں میں اسلام کے بقا اور تحفظ کی کوئی ضمانت، اور ان قیادتوں (LEADER SHIP) اور حکومتوں کے کھیل کھیلنے اور اپنے ملکوں کو اسپین اور ترکستان بنا دینے سے کوئی چیز روک

نہیں سکتی، پھر یہی عوام وہ نرم اور بارآور زمین ہے جس سے
ہر طرح کی قدرتی دولت حاصل کی جاسکتی ہے اور اس پر ہر
طرح کے پرثمر باغات لگائے جاسکتے ہیں اور محل تعمیر کئے
جاسکتے ہیں، وہ ''خام مال'' **(RAW MATERIAL)** ہے
جس سے بہترین انسانی مصنوعات تیار کی جاسکتی ہیں، اور
مردم سازی اور آدم گری کا کام کیا جاسکتا ہے، صدہا خامیوں
اور قابل اصلاح پہلوؤں کے باوجود یہ وہ انسانی مجموعہ ہے
جس پر پیغمبرانہ توجہات، اور اہل قلوب اور اہل خلوص کی محنتیں
صرف ہوئی ہیں، اور وہ آج بھی اپنے خلوص قلب، اپنی محبت
اور گرمجوشی اور ایثار وقربانی کے جذبہ اور صلاحیت میں دوسری
انسانی جماعتوں اور مذہبی قوموں سے فائق وممتاز ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ اس کی ضرورت ہے کہ ان مسلم عوام
(MASSES) اور مسلم ممالک کی مسلم آبادی میں ان صفات
کو بھی پیدا کرنے، اور اس اسلامی سیرت کو بروئے کار لانے
کیلئے بھی سخت جدوجہد کی جائے، جن کی بناء پر انسانی نفوس،
نصرت آسمانی اور فتح وکامرانی کے مستحق ہوتے ہیں، اور جن کی
وجہ سے مخالفتوں اور رکاوٹوں کے پہاڑ گرد وغبار بن جاتے
ہیں، مثلاً صحیح عقیدہ، توحید خالص (جو شرک کے ہر شائبہ سے
محفوظ ہو) اسلامی سیرت اور اسلامی معاشرہ (جو جاہلی رسم و

رواج اور غیر مسلم اقوام کی تقلید سے پاک ہو) اس کیلئے بھی
ضروری ہے کہ مسلم معاشرہ کو اس مرض نفاق اور اس ''تضاد''
سے پاک کیا جائے جو عرصہ سے اس میں سرایت کئے ہوئے
ہے، اور جو اسلام کی اصل تعلیمات اور مثالی مسلم معاشرہ کے
منافی ہے، اسی طرح ان اخلاق وعادات اور نفس امارہ اور
دولت وطاقت کے ان اثرات سے بھی بچانے کی کوشش کی
جائے جن کی بنیاد پر انبیاء سابقین کی بہت سی امتیں مستحق
عذاب، اور مورد غضب الٰہی ہوئیں، اسی طرح مغربی اقوام
کے اس اخلاقی ''جذام'' سے بھی ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی
جائے جس میں مغربی تہذیب اور اہل مغرب مبتلا ہیں، اور
اب وہ چاہتے ہیں کہ مشرقی اقوام اور بالخصوص مسلم ملکوں میں
بھی وہ پوری طرح پھیل جائے۔

لیکن یہ اصلاحی کام ادھورا رہے گا، اور اس کے نتائج
ظاہر نہیں ہوں گے جب تک کہ مسلمانوں میں صحیح دینی شعور نہ
پیدا کیا جائے اور ان کی صحیح ذہنی تربیت نہ ہو، ضرورت ہے کہ
ان میں حقائق اور مسائل کا صحیح فہم اور دوست دشمن میں تمیز کی
صلاحیت پیدا ہو، ان کا شعور اتنا بالغ اور ان کا دینی فہم اتنا
عمیق ہو کہ وہ گہرے سیاسی مقاصد رکھنے والے رہبروں،
سیاسی بازی گروں، اور کھوکھلے نعروں سے دھوکہ نہ کھائیں،

اور عالم اسلام میں پھر ان روح فرسا المیوں Tragedies
کا اعادہ نہ ہو جن میں بعض بڑی پر جوش مسلم قومیں اور ممالک
جاہلی قوم پرستی (NATIONALISM) یا لسانی
(LINGUISTIC) اور ثقافتی (CULTURAL) تعصّبات
کی آندھیوں میں پتوں کی طرح اڑ گئے اور آسانی کے ساتھ
شاطر قیادتوں اور غیر ملکی سازشوں کا شکار ہو کر اپنی سادگی اور
شعور کی ناپختگی کے بھینٹ چڑھ گئے۔

☆......(۲) دینی حقائق اور قرآنی و ایمانی اصطلاحات کو،
نیز دین کے صحیح تصور اور فہم کو ہر طرح کی تحریف سے بچایا
جائے اور ان کو جدید عصری و مغربی تصورات اور سیاسی و
اقتصادی نظاموں کے (بے اعتدالی کے ساتھ) تابع اور
مطابق بنانے، اور اسلام کی خالص سیاسی تشریح وتعبیر، اور
اسلام کو ایک جذبۂ حیات ثابت کرنے، اور عصری فلسفوں،
اور سیاسی نظاموں کی سطح پر لے آنے میں شدید احتیاط برتی
جائے، اس لئے کہ حکومت واقتدار، نظام وفلسفہ، تغیر وترقی
پذیر چیزیں ہیں، لیکن یہ دینی حقائق اور دین کا صحیح عقیدہ
اسلام کی بنیاد اور وہ نقطہ ہے جس سے اس کا آغاز وانجام
مربوط ہے، انبیاء علیہم السلام نے اپنے اپنے زمانہ میں انہیں
کی دعوت دی، اور انہیں کے راستہ میں ان کی ساری جدوجہد

اور جہاد تھا، اسی طرح ہر ایسی چیز سے احتیاط ضروری ہے جس
کی بنیاد ''ایمان بالآخرۃ'' پر نہ ہو اور جس سے حصول رضائے
الٰہی کا جذبہ کمزور، اور ایمان واحتساب کی روح مضمحل ہوتی
ہو، اور تقرب الی اللہ زندگی کی اصل غایت نہ ٹھہرتی ہو، نیز
جس تعلیم وتلقین اور تفہیم وتشریح سے دور جاہلیت کی بت پرستی
(جو ابھی زندہ ہے) اور شرک اور اس کے عام اعمال ومظاہر
کی قباحت ونفرت کم ہوتی ہو، اور اس کو دور جاہلیت کی ایسی
یادگار سمجھنے کا ذہن پیدا ہو جس کا زمانہ لد گیا، اور جس کی اب
اس ترقی یافتہ دور میں کوئی گنجائش نہیں، حالانکہ بقول اقبالؔ ؎

اگرچہ پیر ہے مومن، جواں ہیں لات ومنات

☆......(۳) ذات نبوی (علیہ الف الف سلام) سے
مسلمان کے روحانی اور جذباتی تعلق پیدا ہونے اور برقرار
کرنے کی کوشش، دل میں آپ کیلئے گہری محبت اور مسلم
معاشرہ میں عشق نبوی پیدا کرنے کی کوشش جو ایک مسلمان کی
نظر میں آپ کو اہل وعیال، یہاں تک کہ اپنی ذات سے زیادہ
محبوب بنا دے، جیسا کہ صحیح احادیث کے مطابق وہ ایمان کا
تقاضہ اور اس کی علامت ہے، اور اس بات پر ذہنی طور پر پورا
اطمینان اور اعتماد کہ آپ ''ختم الرسل، مولائے کل، دانائے
سبل'' ہیں، اور ایسے تمام اثرات سے احتراز جو محبت کے ان

سرچشموں کو خشک و پایاب، سنت پر عمل کرنے ، اسوۂ رسول کی پیروی اور سیرت کے مطالعہ کے شغف اور اس کے تأثر کو کمزور کردیں ، یہی وہ وابستگی اور گرویدگی تھی جس نے عجمی قوموں کو اسلام کے رشتہ سے منسلک اور غیر اسلامی تہذیب اور قومیتوں میں تحلیل ہوجانے سے محفوظ رکھا۔

یہ پہلو اس زمانہ میں ممالک عربیہ کیلئے خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے، جہاں پچھلے برسوں میں عرب قوم پرستی کی تحریکوں ،عیسائی اور یہودی مصنفین کی کتابوں اور جدید عرب ادیبوں اور ان داعیوں وفضلاء نے جو محبت کے عنصر سے محروم یا مقام ''محمد عربی'' سے ناآشنا تھے، اس کو اس حد تک کمزور کردیا ہے کہ اب اس کے دوبارہ احیاء اور تقویت ، اور ایک ایسے ایمان افروز وروح پرور اسلامی ادب کی ضرورت پیدا کردی ہے جس کے پیش کرنے والے ایک عجمی عاشق رسول (اقبالؔ) کے الفاظ میں کہہ سکیں کہ ؎

سپاہِ تازہ بر انگیزم از ولایت عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد ست

☆...... (۴) مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں، اور جن کے ہاتھ میں آج ممالک اسلامیہ کی فکری، تعلیمی قیادت اور ذرائع ابلاغ ہیں، اسلام کی ہر زمانہ میں رہنمائی کرنے ، نئے

نئے مسائل کا سامنا کرنے ، نئی نئی گتھیوں کو سلجھانے ، اور انسانی قافلہ کو اس کی منزل مقصود پر پہنچانے ،اور کشتی حیات کو کنارہ لگانے کی صلاحیت پر اعتماد کی بحالی ، جو غلط تعلیم اور مغربی افکار کے اثر سے یا تو ختم ہوگیا ہے، یا متزلزل ہو چکا ہے، اس طبقہ نے فرض کرلیا ہے کہ اسلام ایک ایسی بیٹری یا ٹارچ ہے جس کا مسالہ ختم ہوگیا ہے، یا ایک ایسی بتی ہے جس کا تیل ختم اور اس کا فتیلہ جل چکا ہے، اس کے دل میں ازسرنو یہ اعتقاد اور اعتماد پیدا کرنا کہ اسلام ایک عالمی اور جاوداں پیغام ہے، جس میں زبان ومکان کی کوئی تفریق نہیں، اس کی ہر زمانہ میں کشتیٔ نوح کی حیثیت ہے، جو تنہا غرق ہونے سے بچا سکتی ہے۔

اس اعتماد کا اس طبقہ کے دلوں سے بالکل نکل جانا، یا اس کا کمزور پڑ جانا، اس طبقہ کا وہ اصلی مرض ہے جو اس وقت اس کے اکثر خلاف اسلام اقدامات اور ''اصلاحات'' کا محرک اور اس ذہنی وتمدنی ارتداد کا سبب ہے جس نے اس وقت پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور جس کی وجہ سے ان رہنماؤں اور اہل حکومت ، اور مسلم عوام کے درمیان وہ عمیق اور عریض خلیج پیدا ہوگئی ہے جو کسی طرح پر نہیں ہوتی اور جس کی وجہ سے ان ملکوں میں ایک شدید ذہنی تہذیبی اور

معاشرتی کشمکش برپا ہے، جو کبھی کبھی بغاوتوں اور انقلابات پر منتج ہوتی ہے۔

☆......(۵) اسلامی ممالک میں نظام و نصاب تعلیم کی بنیادی تبدیلی، اور از سر نو تشکیل، جوان مسلم اقوام و ممالک کے قدو قامت، قدر و قیمت، پیغام وفرائض، اور اغراض مقاصد سے پوری مطابقت رکھتی ہو، اور جو قطعاً کسی دوسرے ملک یا ''کیمپ'' سے درآمد نہ کی گئی ہو، بلکہ ان مسلمان ماہرین تعلیم، اور ماہرین فنون کے اجتہاد و مطالعہ، اسلام کے عمیق و جامع فہم اور بصیرت و تجربہ کا نتیجہ ہو، جو قدیم و جدید، اور مشرق ومغرب کے خودساختہ حدود وخطوط سے بالاتر اور آزاد ہوں، یہ ایک ایسا ضروری کام ہے جس میں مطلق تاخیر کی گنجائش نہیں، اس کے بغیر یہ اسلامی ممالک اپنے پاؤں پر نہ کھڑے ہوسکتے ہیں نہ اپنے دماغ سے سوچنے کے قابل ہوسکتے ہیں، نہ اپنے عزم و ارادہ سے ان ممالک کا نظام چلاسکتے ہیں، اور نہ ان ممالک کی دانش گاہیں، ادب وصحافت اور ذرائع ابلاغ، اسلام کے مزاج و روح اور معاشرہ کی ضرورت کے مطابق فرض انجام دے سکتے ہیں۔

☆......(۶) ایک ایسی طاقتور، عالمگیر، علمی وتحقیقی تحریک جو جدید نسل کا اسلام کے علمی ذخیرہ سے رشتہ استوار کرسکے،

اسلامی علوم میں نئی روح پھونک سکے، اور اس حقیقت کو ثابت کرسکے کہ اسلامی قانون اور فقہ نہایت وسیع اور ترقی پذیر قانون ہے، اور وہ ایسے ابدی اصولوں پر قائم ہے جو کبھی فرسودہ اور از کار رفتہ نہیں ہوسکتے، جس میں زندگی کے تغیرات وترقیات کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت ہے، اور جس کی موجودگی میں کسی وضعی اور انسانی قانون کی پناہ لینے کی ضرورت نہیں، یہی عصر حاضر کا وہ ''تجدیدی'' کام ہے جو اسلامی ملکوں، اور موجودہ اسلامی معاشرہ کو ذہنی و معاشرتی ارتداد سے بچاسکتا ہے اور مغرب زدگی وتجدد کے اس دھارے کو روک سکتا ہے جو عالم اسلام میں اس وقت پوری طغیانی پر ہے۔

☆......(۷) اسلامی ممالک اور مسلم معاشرہ میں اس اسلامی تمدن کی کارفرمائی اور جلوہ نمائی کی کوشش جو اسلام کے اصول ومقاصد، طہارت وعفت، اعتدال، ذوق سلیم، قرآنی تعلیمات، اسوۂ رسول، اور قرون اولیٰ کی اسلامی زندگی، اور اسلام کے مثالی معاشرہ کے بہت سے محاسن کا جامع ہے، کسی ملک اور قوم کا محض عقائد وعبادات سے وابستہ رہنا، اور اس تمدن سے کنارہ کشی اختیار کرلینا جوان دینی تعلیمات اور ان کے وسیع، جامع اور لچکدار اصول کے ماتحت پروان چڑھا ہو،

اور کسی اجنبی تمدن کا اختیار کر لینا، دین کو عبادت گاہوں، اور
مذہبی رسوم **(RITUALS)** میں محدود، اور ان ممالک کو
تہذیبی ومعاشرتی ارتداد کے خطرے سے دوچار کر دینے کے
مرادف ہے، جہاں تک ان مسلم ممالک کا تعلق ہے جو مغربی
تہذیب کے زیر اثر ہیں، ان میں دانایانِ فرنگ کی سازش
پورے طور پر کامیاب ہوگئی ہے، جنہوں نے ان ممالک کو چند
عبادات اور اسلامی شعائر کو چھوڑ کر بالکل اپنے رنگ میں
رنگ لیا ہے، اور حکومت کے دفاتر سے لے کر قومی زندگی کے
تمام شعبوں اور دائروں، سکونتی مکانات اور ہوٹلوں میں بعض
اوقات یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہم کسی اسلامی ملک میں
ہیں یا کسی خالص مغربی ملک میں، ملی تشخص، اور دین کے
ساتھ زندہ اور طاقتور ربط کیلئے ضروری ہے کہ اسلام کا پیدا کیا
ہوا مخصوص تمدن اور طرز زندگی بھی ان ملکوں میں کارفرما ہو کہ
تمدن اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

☆......(۸) عالم اسلام کی اس وقت ایک بڑی ضرورت یہ
ہے کہ ایک ایسی فکری قیادت ابھرے جو مغربی تہذیب کا
جرأت، اعتماد اور قوت اجتہاد کے ساتھ سامنا کرے، اور
تہذیب جدید کے مختلف سانچوں، مکاتیب فکر، اور طریقہائے
عمل کے درمیان ایک نیا راستہ پیدا کرے، ایسا راستہ جو تقلید،

نقل، غلو اور انتہا پسندی سے محفوظ، ظاہری اشکال، مظاہر اور
سطحی نقطۂ نظر سے بلند ہو، حقائق و وسائل قوت اور مغز کی
طرف متوجہ ہو، اور اس کے ظاہری خول میں نہ الجھے، مغربی
تہذیب اور علوم کے ساتھ خام مال (RAW
MATERIAL) کا سا معاملہ کرے، اور اس سے ایک نئی
طاقتور تہذیب کی عمارت تعمیر اور زندگی کا ایک ایسا ڈھانچہ تیار
کرے جو اس کے مقاصد، اس کے عقیدے، اور اس کے
اصول، اخلاق کے ساتھ ہم آہنگ ہو، یہ وہ انقلاب انگیز
مجتہدانہ کام ہے جس کے بغیر عالم اسلام حقیقی طور پر آزاد و خود
کار نہیں ہوسکتا۔

☆......(۹) ان حکومتوں کو جو مسلم اکثریت کے ممالک
میں دین پسند اور اسلام دوست عناصر سے برسرپیکار ہیں، اور
وہاں ایک معنوی و اعتقادی نسل کشی **(GENOCIDE)** کی
مہم جاری ہے اور اس پر اس ملک کے قائدین اور حکمرانوں کی
(جو کسی فوجی انقلاب کے نتیجہ میں، یا کسی سازش کے ماتحت)
حکومت و اقتدار میں آگئے ہیں، بہترین توانائیاں صرف
ہو رہی ہیں، نیز بعض ان عرب ممالک کے سربراہوں کو دینی
حقائق و مفاہیم، اور شرعی احکام و نصوص میں ایسی تبدیلی
لانا چاہتے ہیں جو ان کے سیاسی اغراض، شخصی کمزوریوں یا

غیر ملکی منصوبوں کی کامیابی میں مدد کرسکیں، یہ باور کرانے کی کوشش کرنا کہ یہ حکمت عملی بے نتیجہ قومی سلامتی اور استحکام کیلئے مضر، اور انتشار انگیز کوشش ہے، جو ہر مسلم ملک میں ناکام ہوچکی ہے، ان کو ان مقاصد اور کوششوں کی طرف متوجہ کرنا، جو ملک کے لئے حقیقی طور پر مفید اور اس کی طاقت و حفاظت کا ذریعہ ہے۔

اسی طرح ان مسلمان حکومتوں اور ان کے سربراہوں کو جن کے دل میں اسلام کی عزت ومحبت ہے، شریعت اسلامی کے نفاذ اور اسلامی قوانین کے اجراء پر اور اس مقصد کیلئے مناسب فضا اور ماحول تیار کرنے پر آمادہ کرنا، اور اس بات کا یقین دلانا کہ تبدیلی خدا کی طرف سے فتح ونصرت، اور معاشرہ میں سعادت وبرکت پیدا ہونے کا موجب ہوگی۔

اسی کے ساتھ عالم اسلام میں ایک ایسی مرکزی قیادت کے عالم وجود میں آنے کی فکر وسعی جو ''شورائیت'' کے اسلامی اصول اور ﴿تعاونوا علی البر و التقوی﴾ کی بنیاد پر قائم ہو، اور اپنی اس کوتاہی اور محرومی پر کم سے کم تأسف و ندامت کہ اس وقت عالم اسلام خلافت کے اس ضروری ادارے، اور اس مبارک نظام سے محروم ہے، جس کے قیام کے مسلمان مکلّف بنائے گئے تھے، اور جس سے محرومی کا

جرمانہ وہ مختلف شکلوں میں ادا کررہے ہیں۔

☆......(۱۰) جہاں تک خالص غیر مسلم ممالک کا تعلق ہے وہاں اسلام کا ایسا مؤثر اور معقول تعارف اور اس طرح اسلامی دعوت پیش کرنا جو اسلام کے مزاج اور اس زمانہ اور ان قوموں کی نفسیات کے مطابق ہے، اس لئے کہ ان ممالک میں (صحیح دین اور روحانی واخلاقی تعلیم کا خلا موجود ہونے، اور تہذیب حاضر کی ناکامی کی وجہ سے) اسلام کے لئے روشن امکانات پیدا ہوگئے ہیں، اور اس کی اشاعت کا وسیع میدان پایا جاتا ہے۔

جہاں تک ان ممالک کا تعلق ہے جن میں مسلم اقلیتیں پائی جاتی ہیں، وہاں مسلمانوں کو اپنی نئی نسل کی دینی تعلیم کیلئے آزاد وخود کفیل انتظام، اپنے پرسنل لاء کے تحفظ، نئے نئے قوانین کے بارے میں بیدار مغزی، اور خودداری کا ثبوت دینے کے ساتھ، ان ممالک کی اخلاقی قیادت کے خلا کو پر کرنے کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے، جس کو صرف وہی پر کرسکتے ہیں، اور جس کے ذریعہ سے وہ نہ صرف اپنی افادیت وضرورت ثابت کرسکتے ہیں بلکہ اس برسرانحطاط معاشرہ اور ان زوال پذیر ملکوں کے نجات دہندہ اور معمار بن کر ان کے محبوب رہنما، اور محترم قائد بھی بن سکتے ہیں، اور

اس طرح اسلام کیلئے خدمت اور ان مسلمانوں کیلئے عزت و اعتماد کا راستہ کھل سکتا ہے، جو مخصوص سیاسی حالات اور گذشتہ تاریخ نے اگر بند نہیں تو سخت دشوار گذار بنا دیا ہے۔

تاریخ انسانی بلکہ درحقیقت نسل انسانی کی اس نئی صدی کے آغاز میں ایسے مردان کار کی طرف ٹکٹکی لگی ہوئی ہے جو نہ صرف اسلام بلکہ عصر حاضر کی ان ضرورتوں کی تکمیل کریں، اور ایسے مجتہدانہ اور جرأت مندانہ اقدامات کریں جو تاریخ کے دھارے کو بدل دے، زمانہ کا حقیقت شناس، فراخ نظر اور کشادہ دل مؤرخ قلم ہاتھ میں لئے ہوئے اس انتظار میں ہے کہ وہ ان کارناموں کو سنہرے حروف سے لکھے، اور ان کے انجام دینے والوں کو خراج عقیدت ادا کرے۔

(پندرہویں صدی ہجری ماضی وحال کے آئینہ میں، ص:۵۵)

☆...... **ف** : ماشاء اللہ کیا خوب اہم نکات ہیں جن کو پیش نظر رکھنا بلکہ ان کو لائحۂ عمل بنانا وقت کی اشد ضرورت ہے۔ واللہ الموفق

☆☆☆

دنیا سے جانے سے پہلے

حضرات! آپ سلسلۂ ابراہیمی سے تعلق رکھتے ہیں، اس خاندان کا شیوہ اور شعار یہ رہا ہے کہ دنیا سے جانے سے پہلے اپنی نسل کے بقائے ایمان اور تعلق باللہ کا اطمینان اور ضمانت کر لی جائے اور دنیا سے جانے سے پہلے اولاد سے یہی عہد و پیمان لے لیا جائے کہ دنیا میں جب تک رہنا ہے مسلمان بن کر رہنا ہے اور جانا ہے تو مسلمان کی حیثیت سے جانا ہے۔

نہ صرف یہ عہد و پیمان ضروری ہے بلکہ اس کے لئے وسائل کا مہیا کرنا، اس کو ممکن و آسان بنانے کی تدبیریں اختیار کرنا اور اس کا اطمینان حاصل کر لینا بھی ضروری ہے۔

(تکبیر مسلسل ص ر۲۳۰)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اقتباسات

از

میر کارواں

مؤلفہ

مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی

دنیا کی اہم مشکلات کا اسلامی حل

اسی تسلسل میں مولانا کی ایک اور اہم تقریر کا مختصر ترجمہ نقل کرنا مناسب ہوگا جو دانشوروں، ادیبوں اور دنیا سے باخبر اور وقت کے مشاکل و مسائل سے آگاہ افراد کیلئے کی گئی تھی اور اس کا اصل عنوان یہی تھا کہ دنیا کی اہم مشکلات کا اسلامی حل (**القضایا الانسانیة و حلولها الاسلامیة**) یہ موضوع سعودی ریڈیو کے ڈائرکٹر (شیخ محمد شطا مرحوم) نے دیا تھا، مولانا نے اسی موضوع پر ایک ریڈیائی تقریر لکھی مگر ادبی اور جدت پسندوں نے (جس کو معاصر ادباء تخلیقی صلاحیت کہتے ہیں) اس کا عنوان "**من غار حرا**" کردیا۔ گویا ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

کو اپنے خاص اسلوب میں پیش کیا، یہ مقالہ جب دوسرے دعوتی مقالات کے مجموعہ کے ساتھ شائع ہوا؛ تو اس پر جامعہ ازہر کے استاذ ڈاکٹر احمد الشرباصی مرحوم نے مختصر سا نوٹ لکھا تھا، اس ریڈیائی تقریر کا ترجمہ یہ ہے:

"جبل نور" نامی وہ پہاڑ جس کے اندر یہ غار ہے، یہاں پہنچ کر میرے دل میں یہ بات آئی کہ یہی وہ غار ہے جہاں جبرئیل امین خالق کائنات کا پیام لے کر آئے

تھے، یہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خلعتِ نبوت سے نوازا گیا تھا، اور پہلی وحی " اقرأ " نازل ہوئی تھی، حق یہ ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں سے آفتاب ہدایت طلوع ہوا، یا یوں کہئے کہ یہیں وہ صبح نمودار ہوئی، سچی صبح، دنیا کو روشن کرنے والی صبح، یوں تو رات اور دن کے آنے جانے اور صبح وشام کے بدلنے کا سلسلہ ازل سے قائم ہے اور ابد تک باقی رہے گا مگر وہ "صبح" جس سے شبستان وجود روشن ہوئی، اس صبح کی کرنیں یہیں سے پھوٹیں، اس صبح کی روشنی سے ہر شئی چمک اٹھی، انسان تو ہر جگہ رات گذارنے کے بعد صبح نمودار ہوتے جاگ اٹھتا ہے، مگر جس صبح سے صرف انسان نہیں بلکہ انسانیت جاگ اٹھی صرف تن ہی نہیں من بھی بیدار ہو گیا، جسم کے ساتھ روح نے بھی تازگی محسوس کی وہ صبح درخشاں یہیں سے طلوع ہوئی تھی۔

آفتاب رسالت کے طلوع ہونے سے پہلے ہر گوشۂ حیات تاریک تھا، یوں سمجھئے تاریکیوں کا سلسلہ قائم تھا، خیر کے دروازے بند اور فتنوں کے دروازے کھلے تھے، ہر مسئلہ اپنی جگہ پیچیدہ مسئلہ بنا ہوا تھا، جس کے کھولنے سے انسان کے ناخن تدبیر عاجز و درماندہ تھے،

گویا ہر دروازہ بند اور اس ایسے بھاری قفل لگے تھے جس کو کھولنے کیلئے کوئی کلید (چابی) دریافت نہیں ہوئی تھی۔

عقل انسانی پر بھاری بھر کم قفل لگا تھا، جن کو کھولنے کی صلاحیت کسی "حکیم وقت" اور "دانائے روزگار" میں نہیں تھی، ضمیر انسانیت بھی خودغرضی اور نفس پرستی کے خانے میں بند تھا، اس پر جو قفل لگا تھا اس کو کھولنے کی قوت کسی مصلح قوم کے پاس تھی نہ کسی "واعظ شیریں بیان" کے پاس۔

انسان کے دل پتھر کے سِل بن گئے تھے اس کو توڑنا بڑی بڑی تعلیم گاہوں اور تربیتی اداروں کے بس سے باہر تھا، قدرت کی کھلی نشانیاں اور عبرت کے واقعات جو آئے دنوں سامنے سے گذرتے تھے، انسان کے ضمیر اور اس کے قلب میں کوئی حرکت پیدا نہیں کر سکے تھے، کہنے کو عدالتیں بھی تھیں اور انصاف دلانے کے نام پر ادارے، پنچایتیں تھیں، علاقائی حکام کے دربار بھی تھے، مگر وہاں مظلوم کی دادرسی کا کوئی سامان نہ تھا، گھریلو مسائل، آپس کے اختلافات خاندانی غرور، قبائلی عصبیت سب کا کام قوت وشدت کے ساتھ جاری تھا، مگر ان مشاکل ومسائل کو سلجھانے والے مصلحین ومفکرین کم تھے۔

راجاؤں اور حکمرانوں کے عالیشان محلوں کی اونچی دیواروں سے غریب جفاکش مزدور سر ٹکرا سکتے تھے مگر اپنا حق، اپنا پیدائشی اور انسانی حق نہیں حاصل کر سکتے تھے، اہل ثروت اپنی عیش کوشیوں میں مست تھے، وہاں شیر خوار بچوں کے رونے اور بھوک سے بلبلانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی تھی، وہاں مظلوم پھٹے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی نیم برہنہ عورت اپنی جان کو محفوظ رکھنے کیلئے معمولی سی چادر عصمت نہیں حاصل کر سکتی تھی، یہاں ناداروں کو انسانی زمروں میں شمار نہیں کیا جاتا تھا، ان کے گوشت پوست کے جسم کو انسانی جسم سمجھا ہی نہیں جایا کرتا تھا، دراصل وہ مفتاح (چابی) ہی گم تھی جس سے انسانی مشکلات کے بھاری قفل کھل سکتے، لوگوں نے کوششیں ضرور کیں، مگر وہ ان قفلوں کو غلط قسم کے خود ساختہ چابیوں سے کھولنا چاہتے تھے لیکن وہ چابیاں سب بیکار ثابت ہوئیں اور ایک تالا (قفل) بھی نہ کھول سکیں، یہ بھی کوشش کی گئی کہ اگر کوئی چابی نہیں لگ رہی ہے تو تالا ہی توڑ دیا جائے، مگر اس کوشش کا انجام بھی سوائے پشیمانی کے کچھ نہیں نکلا، تالے تو کھل نہ سکے اور نہ ٹوٹ سکے ہاں وہ اوزار جن سے ان قفلوں کو توڑنے کی کوشش کی گئی وہ

خود ٹوٹ گئے۔

یہی وہ زمانہ تھا کہ آبادی سے ذرا دور، ایک سنسان و بیابان علاقہ میں ایک پہاڑ کے اوپر یہی وہ غار تھا جہاں قدرت حق نے حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت کی دولت عطا فرمائی، اور یہی وہ جگہ ہے جہاں سے وہ انسانی مشکلات حل ہوئیں جواب تک لاینحل تسلیم کی جا چکی تھیں، جن کو حل کرنے میں دنیا کے اعلیٰ ترین ذہن و ذی علم افراد ناکام رہ چکے تھے، رسالت محمدی کی شکل میں وہ مفتاح (چابی) مل گئی جس سے تمام مشکلات کا حل نکل آیا، ہر قسم کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کا راستہ نکل آیا، انسانیت کو وہ چابی مل گئی جو صدیوں سے گم تھی، وہ چابی کیا تھی؟ اللہ کی وحدانیت کا اقرار، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو قطعی اور یقینی باور کرنا اور اس حقیقت کو ماننا کہ اس زندگی کے بعد آخرت ہے جس میں اپنے تمام اعمال کا حساب دینا ہوگا، یہی وہ مفتاح سعادت ہے جو انسان کو راہ نجات دکھا سکتی ہے اور اسی سے دنیا کے تمام پیچیدہ مسائل کا حل نکل سکتا ہے اس چابی سے آپ نے وہ تمام قفل کھول دیئے جو صدیوں سے بند تھے، یا یوں کہئے آپؐ نے وہ تمام گتھیاں سلجھا دیں جو صدیوں سے

الجھی پڑی تھیں، انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں نئی جان آ گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مفتاح ایمانی کے ذریعہ عقل انسانی کو سوچنے، سمجھنے، عبرت حاصل کرنے، اپنے نفع نقصان کو سمجھنے کی صلاحیت دے دی، عقل درماندہ اس لائق ہوگئی کہ وہ دنیا کی حقیقت سمجھ سکے، اپنی حقیقت کو سمجھے اور کائنات کے سربستہ راز کو سمجھے، زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی نشانیوں کو دیکھ سکے، اس کائنات کے بنانے والے کی ذات وصفات سے تعلق قائم کر سکے، اور اپنے خالق کو پہچان سکے، ''کثرت'' کے اندر ''وحدت'' کا جلوہ دیکھ سکے، خدا ناشناسی کی وجہ سے اس عقل پر جو پردے پڑے تھے اسے چاک کر سکے، شرک و بت پرستی اور رسومات واوہام کے بند دروازوں کو توڑ کر فکر ایمانی کی کھلی فضا میں سانس لے سکے، یہ اسی ایمان کا کرشمہ تھا کہ نفس انسانی جو ہمیشہ بدی اور بے حیائی پر ابھارا کرتا تھا (نفس امارہ بالسوء) وہ نفس لوامہ بن گیا (محاسبہ کرنے والا، اپنے عیوب پر منکشف ہوگئے ہوں) اور محاسبہ نفس نے انسان کی جان کو ''نفس مطمئنہ'' بنادیا، یعنی وہ نفس جس کے اندر شک وشبہات اور عدم یقین کی وجہ سے کشاکش تھی اب ایک سمجھے ہوئے یقینی مقصد کو

جان لینے کی وجہ سے مطمئن ہوگیا، یعنی الجھنیں ناپید ہوگئیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ایمانی (کلید) کے ذریعہ ضمیر انسانی کو بیدار فرمادیا، اس کا شعور جو صدیوں سے مردہ تھا اس نے زندگی کی نئی کروٹ لی، اب اس کے اندر کسی باطل کے بسنے کی گنجائش نہیں رہی، ضمیر انسانی کی بیداری کی ایک جھلک دیکھی گئی کہ گنہگار خود آکر اپنی معصیت کا اقرار کرتا ہے، اقرار ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی التجا کرتا ہے کہ اس پر قانون کو نافذ کر کے آخرت کے عذاب سے نجات کا سامان کر دیا جائے، ایک عورت اپنی معصیت کے داغ اسی دنیا میں دھلانے کی درخواست لے کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوگئی، اپنے سنگسار کئے جانے کی درخواست کرتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم عذر شرعی کی وجہ سے اس کی سزا کو ملتوی کر دیتے ہیں، وہ اپنے قبیلہ واپس جاتی ہے جہاں کوئی پہرہ دار نہ تھا صرف اس کا ضمیر جو جاگ اٹھا تھا، اس کا پہرہ دار تھا، اور عذر شرعی کے دور ہونے کے بعد پھر دربار رسالت میں حاضر ہوتی ہے اور اس سزا کی طالب ہوتی ہے جو تلوار کی کاٹ سے قتل ہونے کے مقابلہ میں زیادہ اذیت ناک زیادہ رسوا کن

اورزیادہ دردناک تھی، یعنی پتھروں سے مار مار کر ہلاک کیا جانا۔ (سنگسار کیا جانا)

جب ایران فتح ہوا، ایک معمولی سے سپاہی کے ہاتھ کسریٰ کا تاج زریں آ گیا وہ اس کو کپڑوں میں چھپا لیتا ہے اور اپنے امیر کی خدمت میں لے جا کر پیش کر دیتا ہے، یہ امانت کی ادائیگی کا جذبۂ ایمانی تھا، نمائش اور شہرت کی نہ خواہش تھی اور نہ تمنا۔

قلوب مقفل تھے، خوف خدا سے محروم، نرمی و رقت سے بے گانہ، عبرت پذیری کی صلاحیت سے دور، ان کی بند کوٹھریوں پر تالے پڑے تھے، مفتاح رسالت سے ان کے سارے دریچے یکایک کھل گئے، وہی دل خوف خدا سے کانپنے لگے، حوادث و واقعات سے درس عبرت لینے لگے، کائنات میں پھیلی ہوئی اللہ کی نشانیاں ایک ایک کر کے ان کو خالق کائنات کی طرف متوجہ کرنے لگیں، وہ لوگ جو انسانی خون کی کبھی پرواہ نہیں کرتے تھے، اب یہ عالم ہو گیا کہ آنسو نکل آئے جو کسی کو دم توڑتے دیکھا، دوسروں کے بھوک کا احساس اتنا بڑھ گیا گویا وہ خود بھوک سے بیتاب ہیں، کسی کو پیاسا دیکھ کر ان کے اپنے حلق خشک ہونے لگے، کسی مجبور و مظلوم کو حقیر نہیں سمجھتے بلکہ اس

کے ساتھ محبت اور دلجوئی کا معاملہ کرتے، انسانوں کی فطری صلاحیتیں، ذوق جستجو اور آرزوئے کمال پر پردے پڑے ہوئے تھے، گویا یہ بھی ایک طرح سے مقفل تھے، ان کو بھی رسالت نے ہاتھ لگایا تو مس خام کو کندن بنا دیا، ان کو انسان کو ہلاک کرنے، ایذا پہنچانے، ان کو زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچانے میں مزہ ملتا تھا، مگر یہ عالم تھا کہ وہ رحم دل، آپس میں ایک دوسرے کا احترام کرنے والے، کمزوروں اور ناتوانوں کی نگہبانی کرنے والے بن گئے، اور ان کی قوت ایجاد تعمیری کاموں میں صرف ہونے لگی، شتربانوں کے گہوارے علم و تحقیق کے رکھوالے بن گئے، ان کے کھردرے ہاتھوں میں اونٹوں کی لگام کی جگہ جہاں بانی کی زمام آ گئی، اور وہ دنیا کے نقشے پر طرح نو کے آئین ساز بن گئے، علم کی قدر آ گئی، علماء کی عزت بڑھ گئی، مکتب و مدرسہ کی عظمت دلوں میں قائم ہو گئی، مسجدیں تعلیم گاہ بن گئیں، ہر مسلمان اپنے حق میں متعلم اور دوسرے کے لئے معلم بن گیا۔ "**کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ**" تم میں سے ہر شخص دوسرے کا نگراں بھی ہے اور کسی کے سامنے جواب دہ بھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بدمعاملگی کا خاتمہ ہوا، آپس

کے تعلقات استوار ہوئے، دشمن دوست بن گئے اور دوست عزیزوں سے بڑھ کر عزیز اور رشتہ داروں سے بڑھ کر رشتہ دار بن گئے، ان کی باتیں سچی باتیں تھیں، ان کی شہادتیں (گواہیاں) حق پر مبنی ہوتی تھیں، خواہ اس کی زد ان کے گھر والوں پر پڑتی ہو، باپ، فرزند اور عیال کو اس سے ضرر پہنچتا ہو مگر جب گواہی دیں گے تو سچی اور واقعہ کے مطابق گواہی دیں گے۔

قبائلی عصبیت ختم ہوئی، خاندانی رقابتیں کافور ہوئیں، حسب ونسب کا غرور تہہ خاک ہوا، اب کاروبار کرنے والے ایسے نہ رہے جن کے بارے میں فرمایا گیا:
﴿ **اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوهم او وزنوهم یخسرون** ﴾ بلکہ ان کے اندر امانت کا شعور پیدا ہوگیا، اب ایک ایک دانہ کا خدا کے سامنے حساب دینے کا خوف ان کی طبیعت کا خاصہ بن گیا، ان کو معلوم ہوگیا کہ وہ مال و دولت کے مالک نہیں بلکہ اس کے رکھوالے اور امین ہیں، ان کو قرآن نے تعلیم دی کہ ﴿ **وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیه** ﴾ اور خرچ کر اس (مال میں سے) جس میں اللہ نے تم کو اپنا نائب بنایا ہے۔

اور پوری وضاحت کیساتھ اس نکتہ کو ذہن نشین کرایا گیا: ﴿ **و اتوهم من مال الله الذی اتاکم** ﴾ جو مال تم کو اللہ نے دیا ہے اس میں سے حاجت مندوں کو دو۔

ان کے اندر قبائلی عصبیت اور خاندانی غرور کو مٹا کر کافور کردیا، ان کو جتلا دیا گیا کہ تم ایک آدم وحوا کی اولاد ہو:

﴿ **یـٰأیها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة و خلق منها زوجها و بث منهما رجالا کثیرا و نساء واتقوا الله الذی تساء لون به والارحام ان الله کان علیکم رقیباً** ﴾

(سورۂ نساء/۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا (اس طرح) کہ اس کا ایک جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں (کی نسل) سے پھیلا دیئے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم مانگتے ہو اور قرابتوں کا خیال رکھو، بیشک اللہ تم پر نگراں ہے۔

غار حرا کے دہانے پر کھڑا تھا اور اپنے دل میں سوچ رہا تھا، عہد رفتہ کی یاد نے مجھے گرد وپیش سے تھوڑی دیر

کیلئے اپنے ماحول اور خود اپنے وجود سے بے خبر کردیا، مجھے ایسا لگا جیسے میں اسی ماحول میں سانس لے رہا ہوں، اس وقت کی باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں گویا وہ میرے سامنے کے واقعات اور آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں، ماضی کے آئینے میں عہد سعادت کے خط و خال نمایاں نظر آنے لگے، اسی عالم تصور میں مجھے اپنے زمانہ کا خیال آیا، جس فضا میں سانس لے رہا اور جی رہا ہوں، میں نے دیکھا کہ آج زندگی کے پیروں میں بھاری بیڑیاں پڑی ہیں، آج پھر وہ قفل سارے کے سارے زندگی کے ہر دروازے پر لگے ہیں، وقت بدل گیا ہے اس لئے مسائل مشکلات بھی بدل گئے ہیں، کیا آج بھی ان تالوں کو اسی پرانی کنجی سے کھولا جاسکتا ہے؟ قفل نئے، دروازے بھی آہنی ہیں، دست و بازو بھی شل ہو چکے ہیں، یہ بات بھی میرے دل میں آئی مگر میں نے کہا پہلے ''ان نئے تالوں'' یا دوسروں الفاظ میں ان نئی مشکلات کا جائزہ لینا چاہئے، میں نے جب اس ارادہ سے ان قفلوں کو ٹٹولا الٹ پلٹ کر دیکھا تو یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ یہ تالے نئے نہیں ہیں، تالے وہی پرانے قسم کے ہیں، صرف ان پر پالش بدل گئی ہے، انسانی

زندگی میں پیش آنے والی الجھنیں جن کو نئے زمانے کے مشکلات و مسائل کے نام دیئے گئے ہیں سب وہی پرانے اور ہر زمانے میں پیش آنے والے مشکلات و مسائل ہیں اوران سب کی پیچیدگی ایک ہی ہے (مرض کی شکلیں اوران کے نام بدل گئے ہیں، مگر اصل مرض ایک ہی ہے) اصل مسئلہ فرد کی تعمیر سیرت، تعمیر کردار اور تعمیر اخلاق کا ہے، فرد اپنی جگہ پر ایک اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے، اگر اینٹیں اپنی جگہ پر ٹھوس اور پختہ ہیں تو عمارت بھی ٹھوس اور پختہ ہوگی، آج کا انسان بھی اسی طرح کے گوشت و پوست کا انسان ہے جیسے ہزاروں برس پہلے تھا، اس کی خواہشات، اس کی تمنائیں، اس کی حوصلہ مندی اور مہم جوئی میں کوئی فرق نہیں آتا ہے، وہ مادہ اور قوت کے علاوہ کسی چیز کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہے، اس کی خواہشات اس کے ہر فعل وعمل پر حکمراں ہے، خیر وشر کا معیار، اچھے برے کے درمیان امتیاز کا پیمانہ صرف اس کی اپنی ''انا'' اور اپنی خواہش ہے جس کا وہ غلام ہے، اس کا رشتہ اپنے پیدا کرنے والے سے ٹوٹ چکا ہے، وہ رسالت اور تعلیم رسالت سے منہ موڑ چکا ہے، اس کے نزدیک آخرت کا تصور ایک واہمہ ہے، اس کے مرض کی

جڑ یا جراثیم جن کا زہر اس کے رگ و پے میں سرایت
کر گیا ہے، وہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو وہ کسی کے سامنے
جواب دہ نہیں سمجھتا، آخرت کا عقیدہ باقی نہیں رہا کہ اس
کو اپنے اعمال کا حساب دینے کی فکر و لحاظ ہو، اس کی
ساری بدبختیوں کا سبب یہی ہے کہ وہ اس زندگی کو اپنی
اول آخر کائنات سمجھتا ہے، آپس کی لڑائیاں ، خون
خرابیاں، آئے دن کی جنگیں اور آپس میں تناؤ اسی وجہ
سے ہے، ایک شخص تجارت کرتا ہے تو اس کو ایک لمحہ کیلئے
بھی یہ غم نہیں ہوتا کہ اس کی ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے
ہزاروں انسان کا رزق ضائع ہوجائیگا، اور لاکھوں کو فاقہ
کرنا پڑے گا، بھوکوں اور ننگوں کی تعداد بڑھ جائیگی ، یہ
فرد اگر نادار ہوتا ہے تو چاہتا ہے کہ دوسروں کی محنت سے
پیدا کردہ روزی کو اپنا لے، اگر مزدوری کرتا ہے تو اپنے
فرض کی ادائیگی میں کام چوری کرتا ہے اور مزدوری اپنے
حق سے کہیں زیادہ طلب کرتا ہے ، اگر جائز و ناجائز
طریقہ پر دولت اکٹھا کرلیتا ہے تو انتہائی سنگدل، بخیل ،
دین واخلاق سے بے بہرہ ہوجاتا ہے، اور دنیا کے ہر
آرام اور لذت کو اپنی میراث سمجھتا ہے، دوسروں کو انسان
بھی مشکل سے سمجھتا ہے، اگر اس کے ہاتھ اقتدار کی کنجی

آجاتی ہے تو فرعون وقت بن کر نمودار ہوتا ہے، اپنی
ذات اور اپنی اولاد کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، اگر کسی
ادارے کا سربراہ، یا کسی منفعت عامہ کے کام کا ذمہ دار
ہوتا ہے تو اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اس کے اقتدار کو
صدمہ نہ پہنچے، اور اس کی پارٹی اور اولاد کے علاوہ کوئی
اس کا شریک نہ بن سکے، اگر لیڈر ہوتا ہے تو اس کے
سامنے اپنی پارٹی کے علاوہ کہیں خیر کا پہلو نظر نہیں آتا، اگر
کسی ملک کا صدر جمہوریہ یا وزیر بن جاتا ہے تو اس کو
اپنے عوام اور اپنے ووٹ دینے والوں کے علاوہ کسی کی
بہبود مد نظر نہیں ہوتی، ایجاد کی صلاحیت ہے تو ایسے آلات
ایجاد کرتا ہے جس سے انسانی برادری کی ہلاکت کا سامان
تیار ہو، زہریلی گیس ایجاد کرتا ہے، اگر اس کو قانون
سازی کا اختیار مل جاتا ہے تو ظالمانہ قوانین بناتا ہے اور
ملک کے بھوکے غریب عوام پر بھاری ٹیکس عائد کرتا ہے،
غرض وہ جہاں بھی ہے اور جس حال میں بھی ہے اس کے
سامنے سوائے اپنی ذات ، اپنی آل اولاد، اپنی پارٹی ،
اپنے گروہ کے علاوہ کسی کا نفع ،نقصان نظر نہیں آتا، ان
میں سے ایک شخص اپنی من مانی اور اپنی شہوت رانی کیلئے
ہزار ہا انسانوں کو درندوں سے زیادہ بے دردی اور بے

رحمی سے چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے، ایسے افراد سے جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ معاشرہ انسانوں کا نہیں درندوں کا معاشرہ ثابت ہوگا، معاشرہ یا حکومت دونوں کے کل پرزے یہی افراد ہیں اور جب افراد اپنی جگہ پر انسان دشمن ہوں گے تو پورا معاشرہ انسان کش بن جائے گا، اور مشکلات و مسائل حل ہونے کے بجائے پیچیدہ ہوتے چلے جائیں گے، ایک گرہ کھلے گی تو دوسری گرہیں پڑ جائیں گی، ایک مرض دور ہوگا تو دوسرے بیسوں مرض سامنے آجائیں گے، زہر سے زہر کا علاج تلاش کیا جائے گا تو نتیجہ موت ہی ہوگا، یہ ہے مادہ پرستی یا خواہش پرستی کا فساد جس کے بطن سے ہر قسم کی الجھنیں، برائیاں، بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور ہورہی ہیں جن کو ہم انسانی زندگی کے مشکلات کا نام دیتے ہیں۔

ان سب کا علاج، ان تمام مشکلات کا اسلامی حل فرد کی تعمیر سیرت ہے، یہ تعمیر بغیر؛ اللہ، اللہ کے رسول اور یوم آخرت پر ایمان لائے مکمل نہیں ہوسکتی۔

(میر کارواں، ص:۲۹۹ تا ۳۱۱)

ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر

مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ کی یہ معرکۃ الآراء کتاب ہے جس کو عربوں نے تلقی بالقبول فرمایا، چنانچہ حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی مدظلہ اس کے متعلق اپنی تصنیف لطیف ''میر کارواں'' میں یوں تحریر فرماتے ہیں ''سب سے پہلے اس کتاب کی پذیرائی وہاں ہوئی جہاں عالم اسلام کے جید علماء، دانشور اور علوم اسلام (کتاب وسنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ماہرین کا مجمع ہے اور تادم تحریر اس کتاب کے ستر (۷۰) سے زائد ایڈیشن قانونی اجازت سے اور بہتیرے ایڈیشن بغیر اجازت کے شائع ہوچکے ہیں، اس پر دمشق یونیورسٹی کے ایک صاحب نے پی ایچ ڈی بھی کیا ہے، کوئی پڑھا شخص مثقف نہیں سمجھا جاسکتا اگر اس نے اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا۔'' چنانچہ ہم پہلا اقتباس جو کتاب کے پہلے باب کے متعلق ارقام فرمایا ہے اس کو نقل کررہے ہیں:

''کتاب کا پہلا باب ''جاہلیت عالمیہ'' کی تصویر کشی پر مشتمل ہے، سیرت نگار علماء کا روایتی اسلوب یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اہل مکہ یا بعض عرب قبائل کی اعتقادی وعملی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہیں؛ مثلاً معاشی بے انصافی، اخلاقی بدعنوانی، اور انارکی؛ شرح وبسط سے بیان کرتے ہیں، جس میں دختر کشی، سرقہ ورہزنی، شراب نوشی اور قمار بازی (جوا کھیلنا) آپس میں جنگیں اور طویل مدت تک انتقام کا سلسلہ قائم ہونا وغیرہ۔

"ماذا خسر" کے مصنف نے صرف عربوں کے نہیں بلکہ تمام انسانی آبادی کا اخلاقی سروے پیش کیا ہے، اور عرب کے باہر ساری دنیا میں جو جاہلی نظام رائج تھا اس واقعات وحقائق کی روشنی میں تصویر پیش کی ہے تا کہ معلوم ہو کہ انسانیت عالمگیر پیمانے پر کس پستی بلکہ خودکشی اور خودسوزی کی منزل پر پہنچ گئی تھی، اور قرآن نے جو عربوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے ﴿كُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ (تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر پہنچ گئے تھے) وہ صرف عربوں کا حال نہیں بلکہ اس وقت تمام عالم کا حال یہی تھا، اور اسلام کا ظہور کن نامساعد حالات اور کس تاریک ماحول میں ہوا، اور اس انسانیت کی نشأۃ ثانیہ کیلئے کتنا عظیم اور کس درجہ دشوار کام انجام پایا۔

اس حقیقت کو ثابت کرنے کیلئے کہیں یکجا اتنا مواد نہیں ملتا جتنا "ماذا خسر" میں موجود ہے، کیونکہ اس زاویہ سے کسی نے پہلے سوچا بھی نہ تھا کہ جاہلیت کا مسکن صرف عرب قبائل کے علاقے ہی نہیں بلکہ سارا عالم اس شکنجہ میں تھا، لہٰذا ہر براعظم بلکہ ہر بڑے ملک کے حالات، اخلاقی گراوٹ اور انسانی بربادی کے قصے کو مختلف مآخذ ومصادر سے حاصل کئے گئے، اس کی خاطر برسہابرس کی دیدہ ریزی اور مختلف زبانوں کے لٹریچر، تہذیب وتمدن اور رسوم واعیاد سے متعلق معلومات جمع کرنا تھا، یہ کام چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے جمع کرنے اور اس کا انبار لگانے کے مرادف تھا۔

یہ کام اللہ تعالیٰ کی عطاء کردہ توفیق وتائید غیبی کے بغیر ناممکن تھا، اس باب کا حق ادا کرنے کیلئے مصنف کو کتب خانے کھنگالنے پڑے، اور اس کتاب کا یہ نادر باب یہ ہے کہ یہ مضمون کہیں یکجا پہلے نہیں دیکھا گیا۔" (میر کارواں، ص: ۴۸۰)

نشاں یہی ہے زمانہ میں زندہ قوموں کا

"قوموں کے سیاسی وتعلیمی تغیرات، قوموں کے اجتماعی وباہمی تعلقات، انسانی زندگی کی افسردگی وزندہ دلی، زمانے کے تیور، واقعات کے اشارے، مشکلات کے پہاڑ، وقت کے دھارے، ان میں سے کوئی چیز بھی تقدیر الٰہی اور مشیت خداوندی کے سامنے آخری مبرم اور لاعلاج وغیر تغیر پذیر نہیں، نصرت الٰہی اور اہل ایمان کے اخلاص اور اہل یقین کے عزم وفیصلہ نے بارہا ان میں تغیر وانقلاب پیدا کر دیا ہے، تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا ہے، زندہ قوموں کی کوئی چیز آخری وابدی نہیں ہوتی، ایک زندہ اور صاحب عزم قوم کی طرح ہندوستان میں اپنا مقام بنانے، اپنی راہ نکالنے اور ہندوستان کو ایسا آزاد جمہوریہ بنانے کی کوشش کیجئے جو اس کے اعلان اور دستور کے مطابق اور آپ کے حالات اور ضروریات کے مناسب ہو۔ اپنے اس تعلیمی مسئلے کو اپنے ایمان ویقین، اپنے عزم وفیصلہ، جوش عمل اور ولولۂ کار سے حل کرنا ہے، اگر آپ نے اس کی شرطیں پوری کر دیں تو ہر مشکل آسان اور ہر عقدہ حل ہے۔

(تکبیر مسلسل ص: ۲۰۴)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

انتخابات

از

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اکابر ومشاہیر کی نظر میں

مکرم مولانا ممشاد علی قاسمی صاحب نے حضرت مولانا کی عظمت و رفعت جو اکابر ومشاہر کی نظر میں تھی اس کو انہیں حضرات کے مکتوبات و ارشادات سے عیاں فرمایا ہے، ان میں سے چند مکتوبات وارشادات کو نقل کررہا ہوں جو انشاء اللہ ناظرین کرام کی بصیرت اور مولاناؒ کی عظمت میں ازدیاد کا سبب ہوگا۔

شاہ فیصل شہید سے ملاقاتیں اور مکاتبت

سابق فرمانروا مملکت سعودی عرب اور اپنے عہد کے عفت صفات ومنفرد خصوصیات کے حامل بادشاہ فیصل بن عبدالعزیز آل سعود کسی تعارف کے محتاج نہیں، وہ تاریخ کی بڑی شخصیتوں میں شامل ہیں، اتحاد اسلام کے علمبردار شاہ فیصل شہید سوجھ بوجھ، ذہانت، دوراندیشی اور زودفہمی میں بےنظیر تھے، یہ عظیم الشان اور کریم النفس بادشاہ اہل اللہ واہل الرائے اصحاب بصیرت حضرات کی خاص عزت کرتا تھا، ان کے مفید مشوروں اور پرخلوص تجاویز کی قدردانی کرتا اوران کو اہمیت دیتا تھا۔

اسی مناسبت سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اور شاہ فیصل شہید کے درمیان عمر ومنصب میں فرق کے باوجود ذاتی اغراض اور محدود مقاصد سے بلند ہوکر خلوص ومحبت اوراعتماد کا گہرا رشتہ اور خاص تعلق قائم تھا۔

حضرت مولانا دامت برکاتہم نے بادشاہوں ، وزیروں اور اراکین سلطنت وافسران حکومت سے ملاقات واختلاط سے ہمیشہ احتیاط واجتناب فرمایا، اور ''کسی دینی وملی ضرورت کے علاوہ'' کبھی اس طرف توجہ نہیں فرمائی۔

لیکن اپنے وقت کے دو مقتدر سربراہان مملکت یعنی سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل شہید اور صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق شہید سے ان کے دینی مزاج اوراسلامی غیرت کے باعث حضرت مولانا کو ان دونوں حضرات سے خاص

مناسبت رہی، ہمیشہ ان کے لئے دعاء گو رہے اور آج بھی ان کا تذکرہ اپنی مجلسوں میں بڑی محبت اور احترام سے کرتے ہیں۔

شاہ فیصلؒ سے آپ کی پہلی ملاقات ۱۹۶۳ء میں مدینہ منورہ میں اس وقت ہوئی جب وہ سعودی عرب کے وزیر اعظم اور ولی عہد سلطنت تھے، شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ الباز (جو اس وقت مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے) کی وساطت سے حضرت مولانا اور شاہ فیصلؒ کی یہ ملاقات تنہائی میں ہوئی، اس پہلی ملاقات کی گفتگو کا خلاصہ حضرت مولانا نے ''کاروان زندگی'' میں اسطرح بیان کیا ہے کہ:

''شاہ فیصلؒ کے سامنے میں نے اس اندیشہ کا اظہار کیا کہ مملکت بالخصوص حجاز مقدس کو ترقی یافتہ عرب ملکوں کے راستہ پر لے جایا جارہا ہے، اور ایسے منصوبے زیر غور ہیں جن سے حرمین شریفین میں حاضری کے مقاصد، ان کے ایک مثالی اسلامی شہر ہونیکی حیثیت اور ان کے تقدس کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے، انہوں نے خاموشی کے ساتھ میری گفتگو سنی، حجاز مقدس کی تخطیط، (منصوبہ بندی) کے بارے میں اپنی مملکت کی احتیاط اور نیک نیتی کا اظہار کیا، اور مجھے اطمینان دلایا کہ یہاں کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جو مرکز اسلام کے مقام وپیغام کے منافی ہو۔

میں نے اس کے بعد جب انہوں نے زمام سلطنت سنبھالی ایک مفصل مکتوب لکھ کر پیش کیا، جس کا بنیادی خیال یہ تھا کہ حجاز مقدس کی ایک مخصوص شخصیت ''مقام وپیغام ہے، اور ہر دور میں اس کی حفاظت ضروری ہے تجدد وترقی کا کوئی قدم اور کوئی رفاہی تفریحی اقدام جائز نہیں جو اس کی شخصیت اور مقاصد کو ادنیٰ درجہ کا نقصان پہنچاتا ہو، اس کے بعد ایک دوسرا مکتوب لکھا، جس میں صاف

طریقہ پر عرض کیا کہ کسی ملک کی آبادی کے لئے فارغ البالی، تفریح طبع اور من مانی زندگی گزارنے کے اسباب اور مواقع مہیا کرنے اور اس کے ذریعہ اس کو حکومت پر نکتہ چینی اور حالات میں تبدیلی اور اصلاح پیدا کرنے کے خیال سے غافل و مشغول رکھنے کا تجربہ بنوامیہ کے دور سے اس وقت تک ناکام رہا ہے، یہی طبقہ جس کے اندر دولت کی ریل پیل ہوتی ہے اور اس کو کچھ اور سوچنے کی بظاہر فرصت نہیں ہوتی سب سے زیادہ غیر مطمئن، ناشکرا، اور احسان فراموش ہوتا ہے، اور سرکشی اور بغاوت کا ظہور اسی سے ہوتا ہے، اس کے بالمقابل دیندار طبقہ ہی قابل اعتماد اور وفادار ثابت ہوتا ہے اس کا جواب انہوں نے اپنے ۹؍صفر ۱۳۸۵ھ (۱۱؍جون ۱۹۶۵ء) کے مکتوب میں دیا، جس پر ان کے دستخط ہیں، اس کے ماسوا ایک مرتبہ جدہ میں، اور ایک مرتبہ مکہ معظّمہ میں میری ان کی تنہائی میں گفتگو ہوئی، جس میں میں نے اپنے خدشات ظاہر کئے اور انہوں نے نمبر وار اپنی حکومت کے موقف کی وضاحت کی میں ملک معظم کی غیر معمولی ذہانت، تحمل وحسن اخلاق وسادگی سے بڑا متاثر ہوا، اور یہ تاثر ہمیشہ قائم رہا۔

حضرت مولانا اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''راقم سطور نے ان کی ولی عہدی اور وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں ان سے ملاقات کی اور ان کو سرزمین مقدس پر اثر انداز ہونے والے بعض واقعات منصوبہ بندی اور تعلیم وتربیت کے بعض پہلوؤں کی طرف متوجہ کیا، اور باہمی اعتماد واحترام کی فضا میں ان سے تخلیہ میں گفتگو کی، سربراہِ مملکت ہوجانے کے بعد متعدد بار ان سے نجی طور پر ملاقاتیں اور گفتگو ہوئی، لیکن یہ گفتگو ہمیشہ خود انہیں کے ملک کے حالات، ضروریات

حال و مستقبل اور اداروں اور شعبوں تک محدود رہتی تھی، انہوں نے بھی اس بات کو محسوس کیا اور اس کی قدر کی کہ ان ملاقاتوں سے نہ اپنے لئے ذاتی طور پر نہ کسی تعلق رکھنے والے ادارہ یا منصوبہ کے سلسلہ میں اجتماعی طور پر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی، انہوں نے اپنی خداداد ذہانت سے (جس میں مشکل ہی سے ان کی مثال ملے گی) اس کی بڑی قدر کی، اور بعض اوقات جب میری طرف سے ملاقات کے لئے وقت حاصل کرنے کی کوشش نہیں ہوتی تھی، ان کی طرف سے ملاقات کا اشارہ ہوتا تھا۔ (پرانے چراغ حصہ سوم صفحہ ۱۲۸)

شاہ فیصل مرحوم جو اپنی ذکاوت وفراست اور مردم شناسی میں جواب نہیں رکھتے تھے وہ حضرت مولانا سے اس لئے محبت کرتے، آپ کا احترام و اعتماد اور آپ کے مشوروں کی دل سے قدر اسلئے کرتے تھے کیونکہ وہ اپنی خداداد بصیرت اور وسیع تر ذرائع اعلام سے اچھی طرح جان چکے تھے کہ مولانا کی ہر بات خالصۃً لوجہ اللہ اور اسلام ومسلمانوں کے وسیع تر مفادات کے لئے ہوتی ہے، مولانا علی میاں صاحب ذاتی اغراض ومفادات سے بلند اور بہت بلند ہیں۔

اس گوہر گراں مایہ کی قدر ومنزلت کو شاہ فیصلؒ جیسا جوہر شناس اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ وہ بادشاہ بھی تھا اور جوہری بھی، چنانچہ حضرت مولانا اسی احترام و اعتماد کی بنیاد پر شاہ فیصل کو تنہائی میں مشورے دیتے، خطوط لکھتے، اور وہ آپ کی باتوں کو بڑی توجہ واحترام سے سنتے اور محبت وامتنان کے ساتھ جواب دیتے۔

یہاں پر حضرت مولانا کے نام شاہ فیصل شہید کے دو خط نقل کئے جا رہے ہیں جن سے ان کے اعتماد واحترام اور محبت وانسیت کی عکاسی اور دو عظیم المرتبت

شخصیتوں کی ''اللہ کے لئے محبت'' کا اظہار ہوتا ہے۔

مکتوب (۱)

مکتوب شاہ فیصل شہید

فضیلۃ الشیخ ابی الحسن علی الحسنی الندوی حفظہ اللہ تعالیٰ

آپ کے لئے اللہ تعالیٰ سے صحت وسلامتی اور ہر طرح کی خیر سے بہرہ یاب رہنے کے لئے دعا کرتا ہوں۔

جناب کا مکتوب مؤرخہ ۱۵/۱۲/۱۳۸۴ھ کو ملا، اور آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کا علم ہوا، آپ کے پاکیزہ احساسات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، آپ کی اسلامی اور دینی غیرت کی قدردانی کے ساتھ آپ کو یقین دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ میں نے کسی ایسی چیز کی اجازت نہ دی اور نہ کبھی دے سکتا ہوں جو ہمارے دین حنیف اور اس کی صحیح تعلیمات سے ٹکراتی ہو۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ ہم لوگوں کو ان کاموں کی توفیق بخشے جن میں اس دین کی بھلائی اور اس کی شان کو بلند کرنے والی بات ہو اور مسلمانوں کو ایسی بات پر متفق کرنے کی توفیق دے جس میں ان کے دین ودنیا دونوں کی بھلائی ہو، خدا آپ کا نگہبان ومحافظ رہے۔ (تعمیر حیات ۲۵ر نومبر ۱۹۹۰ء)

فیصل بن عبدالعزیز عبدالرحمٰن آل سعود

۹/۲/۱۳۸۵ھ

مکتوب (۲)

شاہ فیصل شہید

صاحب الفضیلۃ الشیخ ابوالحسن علی الحسنی الندوی حفظہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا خط مورخہ ۲۷/ رجب ۱۳۸۷ھ کو ملا ، ہم آپ کے پاکیزہ احساسات اور اسلامی جذبات کے شکر گذار ہیں، ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمارا اپنے ہندوستانی بھائیوں سے روحانی تعلق ہے جن کے ہمارے ملک سے اخلاص ومحبت میں ہمیں ذرا بھی شبہ نہیں ہوتا، ان کو یہاں کام سے نہیں روکا گیا، نہ ایسی ہدایات دی گئی ہیں کہ ان کو روکا جائے، آپ کو جو اطلاع پہنچی وہ صحیح نہیں ہے، ہم ایک اور دوسری جگہ کے مسلمانوں میں فرق نہیں کر سکتے، سب ہمارے بھائی ہیں اور سب کے ساتھ برادرانہ معاملہ کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو ان کاموں کی توفیق دے جن میں اسلام کی سر بلندی اور مسلمانوں کا اتحاد ہو، اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت ونگہبانی فرمائے۔

(تعمیر حیات ۲۵/ نومبر ۱۹۹۰ء)

فیصل بن عبدالعزیز   ۵/۷/۱۳۸۷ھ

شیخ محمد المبارک (سوڈان) کے دو مکتوب

محترم جناب شیخ محمد المبارک الجزائری نے علوم دینیہ حاصل کرنے کے بعد شام یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی، پھر پیرس جا کر فرانسیسی زبان سیکھی، شام یونیورسٹی میں ''کلیۃ الادب'' اور ''کلیۃ الشریعۃ'' میں استاذ رہے، پھر سیاست میں اور الیکشن میں منتخب ہو کر محنت ومواصلات اور زراعت کے وزیر مقرر ہوئے، اخیر وقت میں شام کے حالات نے ان کو ملک شام چھوڑ کر سعودی عرب میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا جہاں وہ شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی میں استاذ مقرر ہوئے، کئی اہم تصنیفات بھی ان کی یادگار ہیں، ۱۵/ صفر ۱۴۰۲ھ کو وفات پائی۔

اس عالی مرتبت شخصیت کو حضرت مولانا سے انتہائی درجہ میں عقیدت ومحبت تھی، جس کا کچھ اندازہ ان کے خطوط سے بھی ہوتا ہے، نمونہ کے طور پر شیخ کے دو خط نقل کئے جاتے ہیں۔

مکتوب اول

سیدی الاخ الاستاذ ابی الحسن علی الحسنی الندوی

حفظہ اللہ ورعاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دمشق میں آپ سے ملاقات کا موقع ہمارے لئے بڑی سعادت کا باعث تھا، آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ مجھے آپ سے جو خصوصی محبت ہے وہ کسی اور مفکر اور

داعی سے نہیں، باوجودیکہ میں ان سب حضرات کا قدر دان ہوں اور سبھی سے محبت رکھتا ہوں۔ مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ حشر میں مجھے آپ کے ساتھ اپنی رحمت کے سایہ میں رکھے گا۔

محمد المبارک ۱۶ر رمضان ۱۳۸۴ھ

مکتوب ثانی

سیدی الاخ الاستاذ ابا الحسن علی حفظکم اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا گواہ ہے کہ آپ کی بے رخی کا سبب میں نے اپنے گناہوں، کوتاہیوں اور بدقسمتی ہی کو سمجھا، اور اپنے ہی کو لعنت ملامت کیا، اس لئے کہ میں آپ کی عنایت و توجہ کو رضاء خداوندی کے اسباب میں سے شمار کرتا ہوں، یہ میرا عقیدہ ویقین ہے، محض تکلف اور خوش کرنے کیلئے نہیں لکھ رہا ہوں۔

اس وقت آپ کے سوا اور کوئی میرے لئے اس منزل ومرتبہ کا نہیں، میری اس عقیدت کا یہ عالم ہے کہ میں برابر سوچتا رہتا ہوں کہ قیامت کے دن آپ میرے سامنے ہوں گے، میں آپ کو پکاروں گا، اور مضبوطی کے ساتھ آپ کا دامن پکڑلوں گا، میرے دل میں بارہا یہ خیال آیا لیکن میں نے آپ سے بیان نہیں کیا۔

آپ کا بھائی
محمد المبارک

جامعہ ام درمان الاسلامیہ
ام درمان، ص؛ ب؛ ۲۸۳، سوڈان

مفتی اعظم پاکستان

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کا تأثر:

آپ کے نامور صاحبزادۂ گرامی جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے مختلف مجالس میں متعدد حضرات کے سامنے بارہا فرمایا ہے کہ میرے والد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب موفق من اللہ ہیں۔

حضرت مولانا دامت برکاتہم کی ذات سراپا فیض سے دار العلوم ندوۃ العلماء کو جو عالمگیر شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، وہ تو دنیائے اسلام کی علمی تاریخ کا ایک زریں باب ہے ہی لیکن اسی کے ساتھ ندوہ کو آپ نے ایک اور لازوال تحفہ دیا جس سے اس کی عظمت ومقبولیت اور اعتماد واحترام میں چار چاند لگ گئے اس اجمال کی قدرے تفصیل مولانا محمد تقی عثمانی صاحب .... کے معتدل قلم سے (ندوۃ العلماء کی زیارت کے بعد بے ساختہ طور پر اس طرح نکلی ہے۔

ندوہ کو حیات نو بخش دی

ندوہ کی علمی ودینی فضا دیکھ کر بڑی امیدیں قائم ہوئیں اور حوصلہ بڑھا بقول اکبر مرحوم ندوہ مسلمانوں کی زبان ہوشمند تو ہمیشہ سے تھا لیکن دلِ دردمند کی جو کسر بیان کی جاتی تھی وہ حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ اور حضرت مولانا سید

ابوالحسن ندوی صاحب مدظلہم نے پوری فرمادی ہے۔

خاص طور سے حضرت مولانا علی میاں مدظلہٗ العالی کی فکروبصیرت جہدوعمل اورسوزوگداز کے اثرات نمایاں نظرآتے ہیں اورایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا (علی میاں) مدظلہم نے اس ادارہ کو حیات نوبخش دی ہے۔

(جہانِ دیدہ)

دمشق یونیورسٹی میں

تدریس کی دعوت کیلئے حضرت مولانا کی خدمت میں شیخ مصطفیٰ السباعی کا مکتوب:

فضیلۃ الشیخ جناب ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی صاحب مشہور عالم ،مجاہدوخطیب، مضمون نگار، قائدورہنما اور ''السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي''، جیسی مقبول ومشہور کتاب کے مصف، نیز رسالہ ''حضارۃ الاسلام'' کے چیف ایڈیٹر تھے۔اسی کے ساتھ شام کی پارلیمنٹ میں اسلامی قائد اوراسلامی مسائل کے نمائندہ تھے، دمشق یونیورسٹی (شام) میں قانون کے استاذ تھے،اوراس یونیورسٹی میں کلیۃ الشریعۃ قائم کرنے کا سہرابھی انھیں کے سر ہے۔ڈاکٹر شیخ مصطفیٰ السباعی صاحب جہادفلسطین میں بھی عملی طور پر شریک رہے ہیں۔حضرت مولانا کی رفعت علمی کے دل سے معترف اورسچے قدردان تھے، یہاں ان کا وہ تاریخی مکتوب نقل کیا جاتا ہے جوانھوں نے ۱۹۵۵ء میں حضرت مولانا کو دمشق یونیورسٹی میں بطوراستاذتشریف

آوری کے لئے لکھا تھا،اورجس سے ان کے دل میں حضرت مولانا کی محبت وعظمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

مکتوب

الی سماحة الشيخ الاستادابی الحسن علی الندوی حفظه الله تعالی

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته.

غالباً آپ کو یہ علم ہوگیا ہوگا کہ دمشق کی سوریہ یونیورسٹی نے شریعت اسلامیہ کا شعبہ کلیۃ الشریعۃ الاسلامیہ قائم کیا ہے، یونیورسٹی کے اس اقدام سے مسلمانوں اورحق وصداقت کے سبھی حامیوں کوخوشی ہوئی ہے۔

کالج کمیٹی نے مجھ سے خواہش ظاہر کی ہے اور وہ آپ کی منظوری کی امیدوار بھی ہے کہ میں آپ کو دوسال یاایک سال کے لئے جیسا آپ پسند فرمائیں آپ کو یہاں درس دینے کی دعوت دوں تا کہ طلباء آپ کے علم اوراسلام کے پیغام کی گہری فہم وبصیرت سے فائدہ اٹھائیں۔

مجھے توقع ہے کہ آپ میری اس گذارش کوشرف قبولیت بخشیں گے،آپ تنخواہ یا دیگر سہولتوں کے سلسلہ میں جوبھی شرائط یااپنی پسند پیش فرمائیں گے سب منظور ہوں گی۔مجھے توقع ہے کہ آپ کی طرف سے جلد ہی وہ جواب ملے گا جواس گرانقدر آرزو وتمنا کو عملی جامہ پہنانے کی نوید جاں فزالائے گا۔

مصطفیٰ السباعی

عمید کلیۃ الشریعہ دمشق　　　۲۲رشوال ۱۳۷۴ھ-۱۲رجون ۱۹۵۵ء

دمشق یونیورسٹی (شام) میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تشریف لیجانا

ایک تاریخی علمی اعزاز

شیخ مصطفیٰ السباعی کا مذکورہ خط جس کے ہر لفظ سے عقیدت ومحبت بلکہ فدائیت کا اظہار ہوتا ہے حقیقت میں بہت بڑی پیش کش تھی جس کی اس دور (۱۹۵۵ء) میں کوئی ہندوستانی عالم آسانی سے تمنا بھی نہیں کرسکتا تھا، لیکن حضرت مولانا کے دل پر چونکہ اسم اعظم نقش ہو چکا تھا اسلئے آپ نے اس خط کا جواب اپنی عادت کے مطابق ہی دیا، یعنی

ہم خاک نشینوں کو نہ مسند پہ بٹھاؤ
یہ عشق کی توہین ہے اعزاز نہیں ہے

آپ نے شیخ مصطفیٰ السباعی کی معرفت یونیورسٹی کی پیش کش کا جو جواب دیا اس میں اس ''علمی اعزاز'' اور فضل خداوندی کا احترام واعتراف بھی تھا، لیکن ساتھ ہی بڑی تنخواہ آرام وآسائش اور دنیا کے ظاہری اعزاز سے استغناء اور بیزاری کا برملا اظہار بھی، چنانچہ حضرت نے ہندوستان چھوڑ کر شام میں رہنے اور ندوۃ العلماء کی رضا کارانہ خدمامت سے سبکدوش ہوکر ''دمشق یونیورسٹی'' کی باقاعدہ ملازمت سے تو بڑی صفائی کے ساتھ معذرت کردی البتہ اس پر آمادگی ظاہر فرمادی کہ یونیورسٹی میں مختصر وقت کے لئے تشریف لیجائیں اور کسی موضوع پر منظم طریقہ پر لکچر دیں۔

یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے اس پیش کش کو غنیمت جان کر منظور کرلیا، اور شام کے صدر جمہوریہ محترم شکری القوتلی اور وزیر تعلیم مامون الکزبری نے حضرت مولانا کے استاذ زائر (Visiting Professer) ہونے کے کاغذات پر دستخط کردیئے اور آپ شام تشریف لے گئے، چنانچہ ۴/اپریل ۱۹۵۶ء چہار شنبہ ۴/بجے شام دمشق یونیورسٹی کے مرکزی ہال میں حضرت مولانا کا پہلا لکچر ہوا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اوپر گیلری میں خواتین وطالبات تھیں، لکچر کا موضوع تھا ''**التجدید والمجددون فی تاریخ الفکر الاسلامی**''

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادی کی محبت وشفقت:

حضرت مولانا؛ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے پہلی ملاقات اور اس میں ان کی محبت ومدارات کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

نکلتے جاڑے تھے، ہم لوگ ایک یکہ پر مئو سے کوپا گنج گئے اور وہاں سے فتح پور کا رخ کیا، میرے ساتھ ایک رفیق سفر مولوی اشرف علی لکھنوی تھے، دوپہر کا کھانا ہو چکا تھا اور لوگ قیلولہ کے لئے لیٹ چکے تھے کہ ہم لوگ فتح پور پہنچے، مولانا کو اسی وقت خبر ہوگئی، میرے نام سے غائبانہ طریقہ پر واقف تھے، اسی وقت بالا خانہ سے نیچے تشریف لے آئے اور نہایت شفقت کے ساتھ مجھے اوپر لے گئے، دیر تک از راہ شفقت میرا ہاتھ پکڑ کر دباتے رہے، اور یہ مولانا کی خاص ادا تھی، پھر

اسی وقت کھانا گرم کروایا، دسترخوان بچھوایا، مجھے اس طرح کھلایا جیسے مائیں پاس بیٹھ کر بچوں کو کھلاتی ہیں، کبھی کبھی لقمہ بنا کر میرے منھ میں دیتے، مجھے حیرت تھی کہ میری بے کمالی اور اپنی بلند مقامی کے باوجود پہلی ہی ملاقات میں ایسی غیر معمولی شفقت کیوں؟

ایک بار جون ۱۹۶۴ء میں جب حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ الہ آباد میں رونق افروز تھے، حضرت مولانا اپنے سفر الہ آباد کا احوال سناتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ: ”ہم نے غلطی سے مولانا کو اپنی آمد اور پہنچنے کی اطلاع دیدی، غلطی اسلئے کہ جب ۲۰/جون کو صبح الہ آباد کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو معلوم ہوا کہ مولانا خود اسٹیشن پر تشریف لائے ہیں، گاڑی ذرا تاخیر سے پہنچی تھی، مولانا نے ملتے ہی فرمایا کہ اس خیال سے کہ وہ وقت چائے اور ناشتہ کا ہوگا میں چائے اور ناشتہ اسٹیشن پر لایا ہوں کہ تاخیر نہ ہو، لیکن اب تو وقت زیادہ ہو چکا ہے اسلئے اب گھر ہی پر ناشتہ ہو جائیگا، میں اس لطف وکرم اور اہتمام کو دیکھ کر پانی پانی ہو گیا اور اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا کہ پہنچنے کے وقت کی اطلاع کیوں دی۔“

حضرت مولانا وصی اللہ صاحبؒ پر کبھی کبھی ایک حال سا طاری ہوتا تھا اور ایسے وقت پر عموماً وہ پاس بیٹھے ہوئے آدمی کا سر پکڑ کر ہلاتے، اور کوئی اہم بات فرماتے تھے، ایسے ہی ایک موقعہ پر اپنے معتمد خاص حضرت صوفی عبدالرب صاحب ایم۔اے، کو مخاطب فرما کر (ان کا سر ہلاتے ہوئے) ایک خاص کیفیت کے ساتھ فرمایا: ”سب کے دل دیکھ لئے، سب کے دل دیکھ لئے، لیکن جیسا صاف دل علی میاں کا دیکھا ایسا کسی کا نہیں دیکھا۔“

مکتوب گرامی حضرت مولانا وصی اللہ صاحبؒ بنام حضرت مولاناؒ

حبیبی ومحبی سلمہٗ اللہ تعالیٰ　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکرمت نامہ نے شرف صدور بخشا، باعثِ از دیاد محبت وخلوص ہوا جو حضرات اہل علم میرے پاس آمد ورفت فرماتے ہیں ان میں غالباً سب سے زیادہ قلب کا رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے، ارقام فرمایا ہے کہ جس اہم مبارک موضوع کی طرح توجہ دلائی ہے، وہ میری اصلاح وتعلیم کے لئے بہت مفید تھی، ہم لوگوں نے اس موضوع ومضمون کو بالکل فراموش ونظرانداز کر دیا ہے، اس کو سن کر بے ساختہ یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

لگ چلا تھا دل قفس میں پھر پریشاں کر دیا
ہم صفیرو تم نے پھر ذکر گلستاں کر دیا

اب میں جناب سے اجازت چاہتا ہوں کچھ عرض کرنے کی بعد آنے اجازت نامہ کے قدرے تفصیل سے عرض کروں گا، والسلام۔

وصی اللہ عفی عنہ

مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی نوراللہ مرقدہٗ کا مکتوب گرامی

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوریؒ کے حضرت مولانا سے محبت و عقیدت کے بیسیوں واقعات ہیں اور اس تعلق وانسیت کو دیکھنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں، ہم یہاں صرف ایک خط نقل کرنے پر اکتفاء کریں گے، سادگی

تواضع اور خالصۃً لوجہ اللہ محبت وتعلق کا یہ شاہکار خط پڑھنے والے خود محسوس کرلیں گے کہ بے پناہ محبت واحترام کے بیکراں جذبات سے لبریز اکیلا مکتوب ہزار واقعات کا ترجمان اور ضخیم کتابوں سے مستغنی کردینے والا ہے۔

محترم ومعظم سراپا لطف وکرم جناب حضرت مولانا صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خدا کرے مزاج بخیر ہو اور سب خیریت ہو، حضرت کی واپسی پر ایک دستی خط بھیجا تھا پھر خیال ہوا کہ میرا دستی عریضہ شاید نہیں ملا تو میں نے ایک تار روانہ کیا کہ حضرت کی بخیریت واپسی سے دلی مسرت ہوئی، اس کے بعد ایک جوابی لفافہ روانہ کیا، اب تک جواب کا برابر انتظار تھا اور ہے، حضرت کی خیریت معلوم نہیں ہوئی دل بہت مضطرب ومتفکر ومغموم ہے، اگر مجھ سے کوئی غلطی یا خلاف بات ہوئی ہو تو حضرت سے بہت عاجزی سے معافی کا طالب ہوں، شاید میرا تار یا لفافہ حضرت کو نہ ملا ہو دل بے چین ہے، عزیزم سلطان الہدیٰ سلمہٗ کو اسی غرض سے بھیج رہا ہوں کہ حضرت کی خیریت اور کیفیت معلوم ہوجائے تاکہ مجھے اطمینان ہو، اس ماہ مبارک میں حضرت کے لئے برابر دعاء کرتا ہوں اور خود بھی دعاء کا طالب ہوں، الحمدللہ طبیعت ماہ مبارک میں پہلے سے بہتر ہے، حضرت جب سفر میں تشریف لے گئے تھے برابر حضرت کے لئے دعاء کرتا رہا، حضرت سے جو دلی تعلق اور محبت ہے حضرت خود جانتے ہیں خدا کرے کوئی بات نہ ہو اور حضرت مجھ سے خوش ہوں، دل وجان سے دعا کرتا ہوں کہ حضرت کی طبیعت بالکل اچھی ہو۔

فقط والسلام　　　　دعاء گو: محمد احمد

شاہ فیصل ایوارڈ

اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کا خصوصی تار

شاہ فیصل ایوارڈ جو عالم اسلام میں تقریباً وہ حیثیت رکھتا ہے جو عمومی طور پر نوبل پرائز کی ہے، سعودی عرب کے اولوالعزم ولی صفت فرماں روا شاہ فیصل شہید کی طرف منسوب ہے، جس سے عالم اسلام کی ممتاز ترین شخصیت کو نوازا جاتا ہے، حضرت مولانا کو ۱۹۸۰ء میں یہ ایوارڈ ملا جس کا احوال خود حضرت کے قلم سے یوں درج ہے:

میں اپنی قیام گاہ (دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی) کے بالاخانہ پر بیٹھا ہوا اپنے معمول کے مطابق تحریری وتصنیفی کام کررہا تھا کہ عزیزی محمد رابع سلمہ لکھنؤ سے آئے اور انہوں نے اطلاع دی کہ آپ کیلئے فیصل ایوارڈ کا اعلان ہوا ہے، اور اطلاع ومبارکباد کے یہ تار آئے ہیں، ان میں ایوارڈ کی کمیٹی کے صدر امیر خالد فیصل بن عبدالعزیز کی طرف سے اطلاع کا تار اور ریاض آکر اس کو وصول کرنے کی دعوت تھی، مبارکباد کے تاروں میں غالباً سب سے پہلا تار حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کا تھا، ان کو جب ریڈیو کے حوالہ سے مدینہ طیبہ میں ایک صاحب کے ذریعہ اس کی اطلاع ملی تو فرمایا کہ ''علی میاں کو فوراً مبارکباد کا تار دیدو

کہ ان سے اندیشہ ہے کہ وہ اس کے قبول کرنے سے معذرت نہ کردیں، وہ میرے اس تار سے میرا ایماء سمجھ لیں گے۔"

فیصل ایوارڈ کا طریقہ کار یہ ہے کہ کمیٹی کی طرف سے عالم اسلام کے مختلف مرکزوں، اہم شخصیتوں، اداروں اور تنظیموں سے رائے مانگی جاتی ہے کہ آپ کے نزدیک اس ایوارڈ کا کون مستحق ہے؟ پھر جس کے حق میں زیادہ رائیں آتی ہیں اس کے حق میں فیصلہ کیا جاتا ہے۔

حکومت سعودیہ کی طرف سے ایوارڈ کی رقم قبول کرنے سے معذرت

ایوارڈ کی رقم دو لاکھ ریال ہوتی ہے جو نقد ایک طلائی تمغہ اور ایک سند کے ساتھ جس میں انعام پانے والے کی امتیازی خدمات کا اظہار ہوتا ہے جلسہ میں پیش کیا جاتا ہے جس میں بادشاہ، ولی عہد سلطنت، وزراء واعیان وعلماء شریک ہوتے ہیں، ۲۴؍صفر ۱۴۰۰ھ (۱۴؍جنوری ۱۹۸۰ء) تا ۲۶؍صفر ۱۴۰۰ھ (۱۶؍جنوری ۱۹۸۰ء) انتخاب کی کمیٹیوں کے اجلاس ہوئے اور انعام پانے والوں کے ناموں کا فیصلہ ہوا، میرے نام وزیر تعلیم عالی معالی الشیخ حسن عبداللہ آل الشیخ کا خصوصی و پرزور تار آیا کہ

آپ میری خاطر اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں، لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود جانے کے بجائے عزیزی ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کو اپنا قائم مقام بنادوں اور وہ میری طرف سے تمغہ وایوارڈ وصول کرلیں، میں نے اس موقع پر کمیٹی کے صدر کے نام خط لکھا، جس میں شکریہ کے بعد لکھا کہ بہتر تو یہ تھا کہ دین کی خدمت کرنے والوں کو ان کا انعام دنیا سے جانے کے بعد ملے، لیکن میری لاعلمی میں اس کا اعلان ہوا، اب میرے لئے ملک فیصل مرحوم (جن سے اس انعام کا انتساب ہے) کی عظیم اسلامی خدمات کے اعتراف واحترام میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس کو قبول کرلوں اور دعا کروں کہ انعام جس بات کی علامت ہے اور اس کے جو مضمرات ہیں وہ پورے کئے جائیں، میں خود حاضر نہیں ہوسکتا، برادرم ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کو اپنا معتمد نمائندہ بناتا ہوں وہ اس کو قبول کرلیں گے اور میری طرف سے سلام و شکریہ پہنچائیں گے، پھر میں نے لکھا کہ یہ ایوارڈ دو پہلوؤں کا حامل ہے، ایک اس کی معنوی قیمت یعنی اعزاز واعتراف، اس کو میں شرمندگی کے ساتھ قبول کرتا ہوں، دوسرا اس کا مالی پہلو یعنی وہ رقم جو اس کے ساتھ ملے گی اس کے لئے میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ میں اس کو اپنی صوابدید کے مطابق اسلام کے مفاد اور دینی خدمات کے میدان میں صرف کروں۔

چنانچہ ۱۲؍فروری ۱۹۸۰ء کو حضرت مولانا کی نیابت فرماتے ہوئے جناب مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی نے حکومت سعودیہ کی طرف سے شاہی اجلاس میں تمغہ، سند اور ایوارڈ وصول فرمایا، ساتھ ہی اجلاس میں حضرت کا خط پڑھ کر سنایا اور اعلان کیا کہ:

’’ایوارڈ میں ملی دو لاکھ ریال کی رقم سے نصف رقم افغان پناہ گزینوں کیلئے، ایک ربع جماعت تحفیظ القرآن کیلئے، جس کے شیخ صالح القزاز (سابق سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی) نگراں ہیں اور دوسرا ربع مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کیلئے ہے۔‘‘

اس طرح حضرت مولاناؒ نے یہ رقم خود حکومت سعودیہ کے ذریعہ ہی مذکورہ تین جگہوں پر تقسیم کرادی۔

شیخ علی الطنطاوی کے تاثرات اور ایک اہم مکتوب

شیخ علی الطنطاوی (مکہ مکرمہ) عہد حاضر میں بلاد عربیہ کے مشہور و مایہ ناز صاحب قلم ہیں ۱۳۲۷ھ میں دمشق (شام) میں پیدا ہوئے، شام یونیورسٹی سے ’’لاء‘‘ کیا اور دمشق میں ہائی کورٹ کے مشیر ہوئے، شام کے ہنگامی حالات کے بعد حجاز مقدس منتقل ہوگئے، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، اس وقت مکہ مکرمہ میں قیام پذیر ہیں، حضرت مولانا سے ان کو والہانہ محبت وعقیدت ہے اور حضرت کے علمی، فکری اور ادبی رفعت و برتری کے جس طرح دل سے معترف اور مداح ہیں اس کا ہلکا سا اندازہ ان کی مندرجہ ذیل تحریروں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

مکتوب گرامی

سیدی الاخ الحبیب فی اللہ الاستاذ الکبیر ابا الحسن

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک دن میں ریڈیو والوں کو اپنی گفتگو براڈ کاسٹ کرا رہا تھا، براڈ کاسٹ کرنے والے نے مجھ سے سوال کیا کہ کونسی جگہ آپ کو زیادہ پسند ہے اور کس جگہ سے آپ کی خوش گوارترین یادیں وابستہ ہیں؟

اس کا خیال تھا کہ میں جواب میں اپنے شہر دمشق کا نام لوں گا، لیکن جب میں نے لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کا نام لیا تو وہ حیران رہ گیا، تعجب سے پوچھا، لکھنؤ کہاں ہے؟ میں نے جواب دیا یہ ابوالحسن علی ندوی کا شہر ہے، اس میں شبہ نہیں کہ عالم عربی میں لکھنؤ سے زیادہ آپ مشہور ہیں، لکھنؤ کا تعارف تو آپ کی ذات سے ہوتا ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی ہمت، نشاط اور توفیق میں مزید اضافہ فرمائے۔

والسلام

علی الطنطاوی

شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ کے خطوط

محدث جلیل شیخ عبدالفتاح ابوغدہ ، استاد حدیث محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض (سعودی عرب) اصلاً حلب (شام) کے رہنے والے ہیں، وسعت نظر، علم حدیث وفقہ میں رسوخ وپختگی، علم اسماء الرجال اور سند میں (جو اخیر زمانہ میں کمزور پڑ گیا ہے) یادگار سلف ہیں، علماء حق کے اخلاق وآداب، تواضع وبلندنفسی کا بہترین نمونہ ہیں جامع ازہر (مصر) سے فارغ ہیں ، (افسوس کہ ۸؍شوال ۱۴۱۷ھ ۱۶؍فروری ۱۹۹۷ء بروز یکشنبہ انتقال فرماگئے ،) اناللہ وانا الیہ راجعون۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شیخ عبدالفتاح کا جن چار شخصیتوں کے لئے روزانہ دعاء کرنے کا معمول تھا، ان میں ایک ان کے استاذ اور ایک حضرت مولانا بھی شامل تھے۔

ہندوستان کے علماء اور یہاں کے مدارس ومراکز سے شیخ کو ہمیشہ خصوصی تعلق وانسیت رہی، وہ اکثر ہندوستان تشریف لاتے رہتے تھے، دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کئی کئی بار تشریف لا چکے ہیں ، حضرت مولانا سے بڑا والہانہ تعلق رکھتے تھے جس کا کچھ اندازہ ان کے خطوط سے بھی ہوسکتا ہے۔ یہاں پر ہم شیخ کے دومکتوب نقل کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں۔

مکتوب (۱)

الیٰ سید الاجل العلامة الداعية الموهوب المحبوب مولانا الشيخ ابی الحسن علی الحسنی الندوی ، اطال الله بقاه فی عافية و سرور و نعمة و حبور امتاعا للاسلام والمسلمين بفضائله وجمائله و ازدياداً و تزوداً من آثاره و مآثره (آمين) من محبه و ملتمس دعواته و راجيها عبد الفتاح ابو غدة.

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ آپ، آپ کے تمام احباب اور اہل تعلق بخیر وعافیت ہوں گے یحییٰ بن سعید ہم سے حدیث بیان فرماتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موتیوں کی بارش ہورہی ہے، واللہ! آپ کی باتیں بھی ہمارے لئے ایسی ہی ہیں، شکر اس خدا کا ہے جس نے آپ کو یہ نعمت دی اور اس پر قادر بنایا، اس کام کے لئے آپ کو منتخب کردیا، اس کی قوت بخشی اور آپ کی شخصیت میں ہماری تاریخ کے روشن وشاندار علمی صفحات دکھائے ، عالی مرتبہ علماء سلف کی یادتازہ کی، آپ الحمدللہ ان اسلاف کرام کو یاددلانے کا بہترین نمونہ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول کی محبت پیدافرمادی تھی اور اللہ کی محبت کے سبب انھیں لوگوں میں محبوب بنادیا تھا، آپ کا اس اعلیٰ نمونہ کا ہونا کوئی انوکھی بات نہیں کہ بڑے اور گھنے سایہ دار درخت کی شاخیں تازہ ، ہری بھری اور شاداب ہی ہوا کرتی ہیں ، وہ ہروقت اور ہرجگہ اپنی عطر بیزی سے معطّر کرتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ

آپ کی عمر دراز فرمائے اور آپ کا وجود بابرکت عرصۂ دراز تک قائم رکھے۔

خصوصی اوقات کی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔خدا حافظ

محبکم عبد الفتاح ابو غده ، الرياض

مکتوب (۲)

الیٰ سيد الاجل مولانا العلامة الداعية الموهوب المحبوب سماحة الشيخ ابو الحسن على الندوى حفظه الله تعالیٰ و رعاه وامتع به العباد و البلاد ، واولاده من محبه عبدالفتاح بن محمد ابوغدة.

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں جناب والا کی خدمت میں ادیب ومجاہد امیر اسامہ بن منقذ شیرازی کی کتاب ''الاعتبار'' کا مصور نسخہ اس توقع میں پیش کر رہا ہوں کہ آپ اس کا مطالعہ فرمائیں گے اور پھر اس پر مقدمہ تحریر فرمائیں گے۔

............اللہ تعالیٰ نے آپ کو قلم کی طاقت زور تحریر اور اخلاص کی دولت سے نوازا ہے، آپ کی باتیں نوجوانان ملت اسلامیہ کے دلوں کی کنجی، ان کے ارادوں اور ہمتوں کی بیداری اور کامیاب مہم جوئی کا وہ پیغام ثابت ہوتی ہیں جس سے امت مسلمہ کا پہلا قافلہ بہرہ ور تھا............میرے محترم! آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو دولت عطا کی ہے اپنے خلوص دل، عقل روشن اور عملی کردار کے حامل ہونے کے سبب آپ ان معانی کو بیان کرنے کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

محبکم عبد الفتاح ابو غده ، الرياض

آوازِ دل

یعنی فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کے دل کی گہرائیوں سے چھلکنے والے وہ پاکیزہ جذبات جو ایک عرصہ پہلے ایک طویل خط کی شکل میں اور پھر مدت کے بعد خطاب عام کی صورت میں مجمع عام میں ظاہر ہوئے تھے، پہلے مکتوب پیش کرتے ہیں:

تاثرات علامہ الشیخ یوسف القرضاوی دوحہ قطر

ہم فضیلۃ الشیخ علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی (مدیر کلیۃ الشرعیہ الاسلامیہ قطر یونیورسٹی) کا وہ خط نقل کرتے ہیں جو انہوں نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الندویؒ کو شاہ فیصل ایوارڈ ملنے کی مبارک باد کے طور پر ۱۹۸۰ء میں تحریر فرمایا تھا، محبت وعقیدت کے پاکیزہ جذبات سے لبریز یہ خط خاصا طویل ہے لیکن یہاں ہم اس کے اہم حصوں کا ہی ترجمہ بطور نمونہ پیش کرنے کو کافی سمجھتے ہیں۔اس سے قبل مناسب ہوگا کہ شیخ یوسف القرضاوی کا مختصر تعارف بھی کرادیا جائے۔

شیخ یوسف القرضاوی عرب کے مشہور محقق عالم وداعی اور نامور مصنف ہیں، فقہ الزکاۃ اور بہت سی معروف کتابیں ان کی تصنیف ہیں، اصلاً مصری ہیں اور جامع ازہر سے فارغ ہیں، وہیں سے ڈاکٹریٹ کیا، عربی کے باکمال خطیب ہیں موجودہ عرب علماء میں ان کو خاص احترام حاصل ہے، ان کی اسلامی خدمات کے اعتراف میں شاہ فیصل ایوارڈ بھی ان کو مل چکا ہے، اس وقت قطر یونیورسٹی میں کلیۃ الشریعۃ کے مہتمم ہیں، تصنیف وتالیف اور دعوت وارشاد کا کام بھی برابر جاری ہے۔

اب ملاحظہ فرمائیے شیخ یوسف القرضاوی کا خط اور اندازہ کیجئے عشق الٰہی کی معجزنمائی کا کہ نغمۂ ہندی کی حجازی لے پر عرب کا ایک بہترین عالم اور دانشور کس طرح جھوم رہا ہے۔

مکتوب

سماحۃ الاستاذ الداعیۃ الاسلامی الکبیر السید ابی الحسن الندوی

حفظہ اللہ ومد فی عمرہ فی خدمۃ الاسلام، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خدمت اسلام کے صلہ میں فیصل ایوارڈ ملنے پر اپنی طرف سے اور یہاں قطر یونیورسٹی ''کلیۃ الشریعۃ'' کے علماء اور اساتذہ کی طرف سے آپ کو پرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہوں، اگر چہ میرے نزدیک آپ جیسے حضرات کو یہ ایوارڈ ملنے سے خود ایوارڈ کی قدر بڑھتی ہے، یہ بات میں بلا کسی مداہنت ومجاملت کے عرض کرر ہا ہوں، میں آپ کو اچھے اور حکیمانہ انداز میں دعوت دین کا کام کرنے والے ایسے داعی کی حیثیت سے تیس سال سے جانتا ہوں جو کلمۂ اسلام کو بلند کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکا ہے، جس کی تقریر وتحریر کو قبول عام حاصل ہے۔ اور ہر میدان میں مثبت وتعمیری کام ہی اس کے پیش نظر ہوتا ہے............ میں نے محسوس کیا اور ہر وہ شخص جو آپ کی شخصیت سے واقف ہے محسوس کرتا ہے، میں بلا کسی مداہنت کے عرض کرر ہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیسے کیسے فضائل اور خوبیوں سے نوازا ہے، انبیاء کرام کے وارثوں اور نائبین رسولؐ اور دین کے لئے تجدیدی کام کرنے والوں کی یہی خصوصیات ہوا کرتی ہے، یہ خوبیاں اور فضائل

آپ کے فکر سلیم، گفتگو کی تاثیر دعوت کی گرمجوشی، عمل کی درستگی اور آپ کے خلوص و سچائی میں جھلکتی ہیں آپ کا اعتدال وتوازن اسلامی حلقوں میں معروف وزبان زد عام ہے۔ انہیں صفات اور خوبیوں نے آپ کی باتوں کی تاثیر کو دوبالا کیا ہے اور پڑھے لوگوں کو آپ کی کتابوں کا پیاسا بنا دیا ہے، آپ کی شخصیت کو مسلمانوں میں مختلف قسم کے طریق کار اور نقطۂ نظر رکھنے والی جماعتوں اور مکاتیب فکر میں قبولیت عام حاصل ہے حتیٰ کہ جو شخص آپ کی رائے اور نظریہ سے اختلاف رکھتا ہے، یا آپ کے فکر سے متفق نہیں ہے وہ بھی آپ کی قدردانی پر مجبور ہے، آپ کا مداح اور آپ کی وسعت قلبی اور خوبیوں کا معترف ہوتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے جو آپ کو حاصل ہے اس میں شک نہیں کہ ہم نے اپنے بزرگ مولانا ابوالحسن کو مسلم دنیا کے لئے ایک اعلیٰ مثال پایا، تجدیدی انداز رکھنے والے داعی، علماء ربانیین کی رقت ونرمی کے حامل، سلفیوں جیسا عقیدۂ توحید، سنت کی پابندی، جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح معلومات وثقافت، علم وفہم اور مذاق عمل میں کتاب وسنت کے چشمۂ صافی سے بھرپور فیض لینے والے عربی فارسی اور اردو ادب میں باکمال، علوم اسلامیہ کے ذخیرہ سے اچھی طرح سیراب............

مولانا المعظم! آپ کی ملاقات سے قبل آپ کی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کے ذریعہ ہم آپ سے متعارف ہوئے، پھر ۱۹۵۱ء میں مصر میں آپ کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس وقت میں جامع ازہر میں ''کلیۃ اصول الدین'' کا طالب علم تھا، مجھے آپ کی ذات میں اس عالم باعمل اور مخلص معلم کا اسوہ نظر آیا جو اللہ کے نزدیک قدر ومنزلت کا مستحق ہے، حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کے اس مقولہ کے مطابق کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور اللہ تمہارے لئے کافی ہے اور اس کی مرضی کے خلاف میں کسی کی تعریف نہیں کرسکتا، میں اس محلّہ یا تنگ گلی کو برابر یاد کرتا رہتا ہوں، جو ''حی الازہر'' شارع موسکی سے نکلتی ہے اور وہ سادہ اور معمولی کمرہ جس میں آپ اپنے رفقاء سفر کے ساتھ فروکش تھے اور نہایت سادہ اور ہر تکلف سے بے نیاز ہو کر رہتے تھے برابر یاد آتا ہے حالانکہ بہت سے حضرات نے آپ کے اعزاز واکرام میں شاندار ہوٹلوں یا کم ازکم کسی قدر آرامدہ ہوٹل میں قیام پذیر ہونے کی پیش کش کی تھی لیکن آپ نے انکار فرما دیا تھا اور نادار طالب علموں کی سی زندگی گذارنے کو ترجیح دی تھی، اگر میں دعوت اسلامی کے نوجوانوں سے آپ کی مفید ترین داعیانہ ملاقاتوں اور انہی میں کے ایک فرد کی طرح ان کے ساتھ رات گذارنے کو بھلانا چاہوں تو بھلا نہیں سکتا، آپ ان نوجوانوں کو اپنا فکر اور دردِ دل پیش کرتے اور وہ علم و واقفیت عطا کرتے جو عقلوں کو جلا بخشتی وہ ایمانی حرارت دیتے جو دلوں کو گرما دیتی، نوجوان آنجناب سے علم نافع عمل صالح اور تابندہ روح حاصل کرتے، وہ آپ کی ذات میں مسلمان کی شان وآن مومن کی صداقت مجاہد کا صبر وثبات، زہد واستغناء کی طاقت علم کا وقار اور اس داعی کی روح پاتے، جس نے اپنی نماز وعبادت سب اللہ رب العالمین کے لئے کردیا ہو۔

(تعمیر حیات ۱۰ر جنوری ۱۹۸۰ء)

اخوکم الفقیر الی رحمة الله

یوسف القرضاوی ۱ر۲ر۱۴۰۰ھ

اس کے بعد ۱۹۹۵ء میں حضرت مولانا قطر کی وزارت اوقاف کی خصوصی دعوت پر دوحہ قطر تشریف لے گئے، اور وہاں پر ''**قيمة الامة الاسلامية بين الامم ودورها في العالم**'' کے موضوع پر لیکچر دیا، یہ لیکچر اسی نام سے قطر کی وزارت اوقاف سے کتابی شکل میں شائع بھی ہوگیا ہے۔ حضرت کے فوراً بعد شیخ یوسف القرضاوی نے حضرت مولانا کی شخصیت سے متعلق ایک تعارفی تقریر فرمائی، تقریر کیا دراصل ساغر دل سے چھلکتی ہوئی شراب طہور ہے جو جذبات کی طغیانی، احساسات کی فراوانی اور محبت کی سرشاری کے باوجود خالص عالمانہ محققانہ اور معتدلانہ طرز خطابت کا بہترین نمونہ ہے جو حضرات وہاں اس وقت موجود تھے انہوں نے خود مجھے بتایا کہ شیخ قرضاوی کی تقریر کا پہلے سے کوئی پروگرام نہیں تھا لیکن حضرت مولانا کی تقریر پوری ہوتے ہی وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھے اور حضرت مولانا کے برابر میں بیٹھ کر تقریر شروع کردی، ہر آدمی محسوس کررہا تھا کہ وہ خود نہیں اٹھے بلکہ اس عظیم شخصیت سے محبت کی مقناطیسی کشش نے ان کو کھینچ لیا ہے وہ خود کچھ نہیں کہہ رہے بلکہ رب دوجہاں ان سے کہلوا رہا ہے، لوگ محویت کے عالم میں گوش برآواز تھے، کہ ''یوسف مصر'' کی زبان سے انہوں نے ایسی تعریف کبھی کسی کی نہیں سنی تھی۔

یعنی پندرہ سال قبل ۱۹۸۰ء میں جن پاکیزہ جذبات کا اظہار خط کے ذریعہ (گویا سرگوشیوں میں) کیا گیا تھا، آج ان بے پناہ جذبات نے ایک منہ زور سیلاب بن کر خطاب کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اور چونکہ حدود شریعت نے ان کو حد اعتدال میں رکھا ہوا تھا اس لئے وہ جذبات کسی بے مہار سیلاب کے بجائے ایک

قدرتی آبشار کی مانند قلب وروح کو سیراب کررہے تھے، بہر حال شیخ نے اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کس انداز میں کیا اور حقائق کی پردہ کشائی کن الفاظ سے فرمائی اس کے لئے ہم ان کی تقریر کے بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

بعد حمد وصلوٰۃ..........

شیخ ابوالحسن ایک اسلامی شخصیت ہیں وہ سرتاپا اسلام کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، کیونکہ اسلام ان کے رگ وریشے میں سرایت کر گیا، ان کی ابتداء اور انتہاء اسلام ہے، اسلام ہی کی طرف ان کا دوڑنا اور گھومنا ہے، اسلام ہی کے لئے ان کا کام کرنا ہے اسی کو وہ تھامے ہوئے ہیں، وہ اسلام ہی سے اپنے دل ودماغ کے لئے غذا حاصل کرتے ہیں اور اس کو پھیلانے میں لگے ہیں، ان کی محبت اور ناراضگی سب اسلام ہی کی خاطر ہے، اسلام ہی کی خاطر تصنیف وتالیف اور درس وتدریس میں مشغول ہیں، اور اسی مقصد سے سفر واقامت اختیار کرتے ہیں، وہ اسلام ہی کے لئے ملتے اور الگ ہوتے ہیں، اسلام ہی ان کے دن کی مشغولیت اور رات کا آرام ہے، اسلام ہی ان کے سفر کا توشہ اور حالت اقامت میں ان کا مونس ہے غرض کہ ان کا وجود اسلام سے ہے اور اسلام ہی کے لئے ہے۔

شیخ ابوالحسن صحیح معنی میں محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں بایں طور کہ انہوں نے اٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے اور پوری زندگی گذارنے کے لئے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طریق کو اپنایا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو اسوہ اور نمونہ بنایا ہے، زہد وتقویٰ، خشیت وعبادت اور دنیوی زیب وزینت سے بعد اختیار کرنے اور ہر چیز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اپنا چراغ راہ بنالیا ہے، آپ اس دور

میں سلف صالحین کا نمونہ اور ان کی یادگار ہیں، وہ ان تمام چیزوں سے بے پرواہ ہیں جن کی ہم جیسے لوگ فکر کرتے ہیں یعنی مال ودولت اور زیب وزینت وغیرہ۔ ان کو دیکھنے سے حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ وغیرہ کی زندگیوں کی یاد تازہ ہوتی ہے بلاشبہ شیخ ابوالحسن ایک عالمی شخصیت ہیں اور اس بات کو ہر وہ شخص جانتا اور مانتا ہے جو شیخ علام کی سرگرمیوں سے واقف ہو، شیخ اپنی پیدائش وپرداخت اور تعلیم کے اعتبار سے اگرچہ ہندوستانی ہیں لیکن (دعوت وارشاد اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے) ان کی فکر اور انکا عملی میدان پورا عالم ہے، شیخ کی جدوجہد اور ان کی عملی سرگرمیاں پورے عالم میں پھیلی ہوئی ہیں، اسی لئے شیخ کا نام عرب ملکوں میں بھی مثل ہندوستان کے مشہور ومعروف ہے اور اسی لئے شیخ ابوالحسن کا بہت سے عالمی اداروں کے بانیوں اور بنیادی رکنوں میں شمار ہوتا ہے ایک طرف عالم اسلام کی سب سے بڑی تنظیم رابطہ عالم اسلامی کے وہ رکن رکین اور رابطہ ادب اسلامی کی مسند صدارت پر جلوہ افروز ہیں تو دوسری طرف آکسفورڈ یونیورسٹی میں تحقیقات اسلامیہ کا قیام شیخ ہی کی سعی پیہم اور جدوجہد کا نتیجہ ہے، وہ المجلس الاعلیٰ للمساجد اور فقہ اکیڈمی، (سعودی عرب) کے ممبر ہیں، ان کے علاوہ اردن، دمشق (شام) اور انگلینڈ وغیرہ کے اعلیٰ ترین اداروں کے ممبر ہیں، ....شیخ ابوالحسن میرے محبوب ہیں، بیشک مجھے ان سے محبت ہے اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ یہ محبت محض للہ فی اللہ ہو، شیخ اپنے زہد وتقویٰ اور اخلاص وبزرگی کی بنا پر میرے محبوب ہیں، شیخ کے یقین کامل اور اللہ پر حقیقی توکل اور امت کی فکر میں ان کی تڑپ اور اپنے آپ کو گھلا دینے نے مجھے ان کا گرویدہ بنالیا ہے، شیخ کے اعتدال ومیانہ روی کی وجہ سے

میں ان کو چاہتا ہوں، شیخ سے میری محبت کی وجہ ان کی فکر مستقیم ہے جو خرافات سے پاک ہے اور ان کا وہ دل ہے جو بغض وکینہ سے آئینہ کی طرح صاف ہے، اور ان کے وہ عقائد ہیں جو کفر وشرک کی خرابیوں سے منزہ ہیں اور ان کی وہ عبادتیں جن میں بدعت وخرافات کا کوئی شائبہ نہیں میں ان سے محبت کرتا ہوں اس لئے کہ انکی زبان صریح وکنایہ ہر طرح کی طعن وتشنیع سے بالکل پاک صاف ہے، وہ میرے محبوب ہیں اسلئے کہ وہ فروعی مسائل میں پڑنے کے بجائے اصلی اور بڑے کاموں میں مشغول ہیں، ان کی نگاہ صورتوں کے بجائے حقائق پر رہتی ہے، اور مبنیٰ کی بجائے معنیٰ پر غور کرتے ہیں، وہ ملت کے اہم ترین مسائل کو سرسری طور پر نہیں لیتے بلکہ پوری گہرائی اور تعمق سے ان کا مطالعہ کرتے ہیں، مجھے ان کے اخلاق کریمانہ، اوصاف محمودہ اور ان کی رقت طبعی کی بنا پر ان سے محبت ہے، میں ان کی محبت سے اللہ کے قرب کا امیدوار ہوں، اور دعاء کرتا ہوں کہ حشر میں بھی مجھے ان کا ساتھ نصیب ہو۔

﴿مع الذین انعم اللہ علیهم من النبیین والصدیقین
والشهداء والصالحین وحسن اولئک رفیقاً﴾

علماء کرام کی شخصیات پر اختلاف کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن تمام لوگ شیخ ابوالحسن پر متفق ہیں، حتیٰ کہ وہ لوگ بھی ان سے اتفاق کرتے ہیں جو ان کے مسلک کے نہیں ہیں اور نہ ان کے طریقہ پر ہیں، لیکن وہ شیخ کو اپنے جلسوں میں بلانے پر مجبور ہیں، یہ سب شیخ کی ان خصوصیات وکمالات کی وجہ سے ہے جس کا امتیاز کم ہی علماء کو حاصل ہوتا ہے۔

شیخ الازہر فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کی عالمانہ شہادت واعتراف

شیخ ابوالحسن الندوی..........آپ نے اپنی زندگی خدا تعالیٰ کے لئے وقف کر رکھی ہے اور اپنے شب وروز ایک مخلص ومتقی مسلمان کی طرح گذار رہے ہیں، آپ نے پاکیزہ اسلوب وکردار اور عمدہ اسلامی لٹریچر کے ذریعہ اسلام کی آواز کو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلایا ہے، نیز اپنے دور دراز ممالک کے اسفار کے ذریعہ آپ نے اسلام کی اشاعت وتبلیغ کی، لوگوں کو خطاب کیا، اور ان کی رہ نمائی اور رہبری کی، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بہترین صلہ عطا فرمائے آمین۔

مکتوب شیخ محمد محمود الصوّاف:

شیخ محمد محمود الصوّاف (عراق) مجاہد ومؤلف، عالم وخطیب، مصر کے جامع ازہر سے فارغ التحصیل ہیں، مشہور اسلامی تحریک ''اخوان المسلمین'' کے تحت ہتھیار سنبھال کر فلسطین کے لئے جہاد میں بھی شریک رہے، بعد میں سعودی عرب چلے گئے اور وہاں شاہ فیصلؒ کا اعتماد حاصل کر کے سعودی وزارت تعلیم کے مشیر اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے ممبر منتخب ہوئے۔

عالم عرب کے لئے ان کے قلبی احساسات اور حضرت مولانا کے لئے ان کے دل میں محبت واحترام اور فخر واشتیاق کے مچلتے ہوئے بیکراں جذبات کا ہلکا سا عکس ان کے اس خط میں بھی نظر آ رہا ہے۔

مکتوب

سیدی سماحة الاخ السجل العلامه المجاهد السید ابوالحسن علی الحسنی الندوی المحترم !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

وتحیة من عندالله مبارکة طیبة، ابعثها الیٰ انفسکم الکبیرة الطیبة مصحوبة بالشوق والاجلال والتقدیر والاحترام،

آپ کے گراں قدر ہدیہ سے مشرف ہوا، آپ کی اس عنایت پر شکر گذار ہوں دل سے آپ کی صحت وسلامتی اور درازئ عمر کی دعاء نکلی تاکہ لوگ اس روحانی غذا سے فیضیاب ہوتے رہیں، جو آپ نے عربی خوانوں کو پیش کی ہے، کاش مصر سنتا اور کاش کہ عالمِ عربی جس سے آپ بہت زیادہ خوش گمان ہیں وہ بھی سنتا، آپ نے اس سے جو کچھ کہا ہے اس کو وہ سمجھتا اور یاد رکھتا............لیکن افسوس کہ عالمِ عربی کو اس کے سربراہوں اور حکام نے ضائع کردیا ہے، اور اسے غلط راستہ پر ڈال دیا ہے، ہم اس وقت آپ کی عراق تشریف آوری کے مشتاق ومنتظر ایک ایک لمحہ گن رہے ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس روحانی فیضان سے نوازا ہے اس سے سیراب ہوں۔

ہماری پرزور گذارش ہے کہ آپ سرزمین دجلہ وفرات پر اپنی تشریف آوری کے وقت

سے مطلع کریں تاکہ ہم آپ کے استقبال اور شرف ملاقات کیلئے حاضر رہیں جس کا دل بیقرارانہ مشتاق ہے۔　　(تعمیر حیات ۲۵/مئی ۱۹۹۰ء)

والسلام　　محمد محمود الصوّاف

۱۲/شعبان ۱۳۷۰ھ ۱۷/مئی ۱۹۵۱ء

☆......**ف** : ان مشاہیر زمانہ اور اکابر ملت کے یہ مکتوبات یقیناً مولاناؒ کی عظمت وولایت پر شہداء فی الارض کا مصداق ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان ہدایات پر عمل کی توفیق مرحمت فرمائے جو حضرت مولاناؒ کیلئے اجر وثواب کا سبب ہوگا۔ واللہ الموفق

☆☆☆

انتخاب

از رسالہ

''یورپ، امریکہ اور اسرائیل، ایک اظہار حقیقت، انکشاف اور تنبیہ''

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبۂ دعوت و تربیت کے زیرنگرانی قائم ''المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی'' کے نئے تعلیمی سال کے افتتاحی تقریب میں حضرت مولاناؒ نے یورپ، امریکہ اور اسرائیل کی حقیقت کا اظہار وانکشاف فرمایا، طلبہ وعلماء کو بلکہ تمام حساس مسلمانوں کو اس کے رد کی طرف ترغیب وتنبیہ فرمائی، جو نہایت بصیرت افروز ہے، جو درج ذیل ہے:

(مرتب)

اہم تنبیہ وایقاظ

اس وقت کا سب سے بڑا فتنہ، چیلنج اور خطرہ یہ ہے کہ پورے مغرب اور عیسائی دنیا اور اس کے ساتھ خاص طور پر یہودی عنصر کی (جو ان مغربی ممالک کی شانہ بشانہ ہے) کوشش ہے کہ تمام اسلامی ممالک میں دین کی حمیت ختم ہوجائے، دین سے انتساب پر جو فخر ہے وہ ختم ہوجائے، دین کا جو سرچشمہ ہے (یعنی ایمان) ختم ہوجائے اور اس کے اندر اسکے متبادل طریقہ پر احساس کہتری (INFERIORITY COMPLEX) پیدا ہو۔

ہماری دارالمصنفین میں استشراق اور مستشرقین کے بارہ میں جو مجلس مذاکرہ (SEMINAR) ہوئی تھی، اس میں کہا تھا کہ مغربی طاقتوں نے اپنی ذہانت سے بالکل صحیح سمجھا کہ محض فوجی برتری واقتدار اور محض سیاسی تنظیم واستحکام اور نئے اور مؤثر اسلحہ وطریق جنگ کافی نہیں، کسی ملک کو مستقل طور پر غلام رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ وہاں کا تعلیم یافتہ اور مثقف طبقہ (INTELLECTUAL CLASS) قوت

حاکمہ سے ذہنی طور پر مرعوب ہو، اس کیلئے انہوں نے مستشرقین (ORIENTALIST) کو تیار کیا، بہت کم لوگوں نے اس راز کو سمجھا ہے کہ مستشرقین محض اپنے علمی ذوق کی بنا پر تحقیق وتصنیف کا کام نہیں کرتے، علمی ذوق تو محدود ہوتا ہے لیکن استشراق کے پیچھے سیاسی واستعماری مقاصد اورسرپرستی کام کرتی ہے، یہ اس زمانہ کا بڑا خطرہ ہے اور اس خطرہ کا جو مرکز ہے اس کو اور اس کے ہتھیار اور ہتھیار استعمال کرنے والوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

مستشرقین کا یورپ اورامریکہ میں ایک پورا لشکر تھا اور اس کو ہر طرح کی پشت پناہی حاصل تھی، انہوں نے اپنی پوری ذہانت صرف کردی، ایسی کتابوں کے لکھنے میں جس میں صاف صاف اسلام پر حملہ نہ کیا جائے، ان کی ذہانت اور سمجھنے کی بات تھی کہ اسلام پر حملہ اگر ہوگا تو ایک مقابل طاقت پیدا ہوجائیگی، اس میں ایسا ہو کہ لوگ پڑھ کر دلائل کی روشنی میں (جو چالاکی کے ساتھ کتاب میں شامل کئے گئے ہیں) کتاب الٰہی کے بارہ میں، حدیث کے بارہ میں، علم فقہ کے بارہ میں احساس کہتری کا شکار ہوں، جو شخص یہ کتابیں پڑھ لے گا وہ سمجھے گا کہ ہم تو بہت نیچی سطح پر زندگی گذار رہے تھے، ہمارے علماء نے، ہمارے مربیوں نے اور ہمارے مصنفین

نے ان کمزوریوں کا اظہار نہیں کیا، واقعہ یہ ہے کہ بہت تاخیر سے حدیث کی تدوین شروع ہوئی، بہت تاخیر سے اسلامی قانون بنایا گیا، یہ سب ان سبھوں نے دکھایا ہے، حالانکہ اس تاخیر میں بھی حکمتیں تھیں، حدیث کی تدوین جب شروع ہوئی تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تائید الٰہی شامل تھی، بلکہ وہ ایک معجزہ تھا، معجزۂ آسمانی تھا کہ بخارا اور ترکستان کے ایسے ذہین ترین اور قوی الحافظہ افراد نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا جن کی مثال دور دور اور دیر دیر تک تاریخ میں نہیں ملتی، اس کی شہادت کیلئے صرف ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے، امام بخاریؒ کے تذکرہ میں آتا ہے:

''امام بخاریؒ جب بغداد آئے تو علمائے بغداد نے ان کے امتحان کا یہ طریقہ تجویز کیا کہ سو حدیثوں کی سند اور ان کے متن (مضمون حدیث) کو الٹ دیا، ایک حدیث کی سند دوسرے متن کے ساتھ اور ایک حدیث کا متن دوسری سند کے ساتھ لگادیا، اور دس دس حدیثوں کو ایک ایک شخص کے حوالہ کیا کہ وہ ان سے سوال کرے، امام بخاریؒ جب مجلس میں آئے تو ایک ایک شخص نے دس دس حدیثیں سنائیں اور ان کی رائے دریافت کی، وہ سنتے اور فرماتے کہ میں ان حدیثوں سے واقف نہیں، اہل علم اس راز کو سمجھے اور ناواقف

اشخاص ان کی لاعلمی پر مسکرائے، جب سب نے اپنے حصہ کی حدیثیں سنالیں تو امام بخاریؒ نے باری باری ایک ایک کی طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ آپ نے جو دس حدیثیں سنائی تھیں ان کا متن یہ ہے اور ان کی سند یہ ہے، پھر دوسرے تیسرے کی طرف توجہ کی یہاں تک کہ سب کی احادیث کی تصحیح کر دی اور جس سند کا جو متن تھا اور جس متن کی جو حدیث تھی وہ بیان کی، لوگ ان کی وسعت نظر، حاضر دماغی اور حافظہ پر انگشت بدنداں رہ گئے۔''

اسی طرح جب فقہ کی تدوین شروع ہوئی تو خدا نے ائمہ اربعہ اور ان کے بلند مقام نادرۂ روزگار خلفاء اور تلامذہ اور مجتہدین کی شکل میں ایسے افراد پیدا کئے اور ان کو توفیق دی جن کی مثال دنیا کی قانون سازی اور مسائل حیات کے حل کرنے کی کوششوں میں نہیں ملتی۔

اسی طرح جب یونانی فلسفہ، اسلامی مملکت بالخصوص عراق اور دارالخلافہ بغداد میں سامنے آیا اور اس نے ذہین اور صاحب فکر طبقہ پر اثر ڈالا، اور اپنی علمی برتری اور باریک بینی کا سکہ جمایا اور اس سے ایک سطحی الفکر طبقہ کے عقائد میں تزلزل پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے امام ابوالحسن اشعری، امام ابومنصور ماتریدی، امام غزالی، اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کو

پیدا کیا جنہوں نے اس کے اثرات اور مرعوبیت کو زائل کر دیا۔

اسی طرح غلط عقائد، جاہلی رسوم و عادات، شرک و بدعات اور رسوم قبیحہ کو دور کرنے کیلئے اور دین صحیح اور عقائد صحیحہ اور سنت وشریعت کے احیاء وترویج کیلئے اللہ تعالیٰ نے ہر دور اور ہر ملک میں مصلحین ومجددین اور ایسے ائمہ دین اور داعیان مخلصین پیدا کئے جنہوں نے **دعوۃ الی الجاھلیۃ الاولیٰ** اور دین کے مسخ وتحریف کے خطرہ کو دور کر دیا اور دین صحیح کو سکہ رائج الوقت کی طرح عام کر دیا۔

مستشرقین اور ان کی ''تحقیقات'' دعاوی اور مباحث سے مغربی استعمار **(WESTERN IMPERIALISM)** نے جو کام لیا اور وہ ان کیلئے مفید ثابت ہوا، اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب سے مغربی استعمار مشرقی ممالک سے بے دخل ہوا یا بعض جگہ کمزور ہو گیا، اس مدت سے مستشرقین کا کام بھی ڈھیلا پڑ گیا، یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے، نہ صحافت کو انحطاط ہوا ہے اور نہ ریڈیو کو، اور جو طریقے ہیں خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے، ان میں صرف انحطاط ہی نہیں بلکہ اضافہ ہوا، لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ مستشرقین کا کام بالکل ہلکا پڑ گیا ہے، کبھی کوئی کتاب آجاتی ہے، اس میں وہ طاقت

نہیں ہوتی، وہ قوت استدلال نہیں ہوتا جو پہلے ہوتا تھا، مستشرقین کا وجود محض عالم اسلامی کے علمی، مذہبی طبقہ کے اعتماد کو کمزور و متزلزل کرنے کیلئے اور ان کے اندر اپنے دین کے بارہ میں، دین کی تاریخ کے بارہ میں، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں اور قرآن مجید کے بارہ میں، اور پھر فقہ وعلم کلام کے بارہ میں اعتماد کو متزلزل کر دینا تھا۔

اس وقت کا سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ہمارا جو نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہے اس کے اندر احساس کہتری پیدا ہو رہا ہے، وہ جو کتابیں پڑھتے ہیں فرنچ میں، انگریزی میں، یہاں تو اس کا رواج کم ہے، بعض دوسرے ملکوں میں خاص طور پر فرانس کے مقبوضات میں (مغربی، شمالی افریقہ کا علاقہ یہ فرانس کے ماتحت رہا ہے، مراکش اور الجزائر بھی فرانس کے ماتحت رہے ہیں، یہاں تک کہ لیبیا، طرابلس تک فرانس کے ماتحت رہا ہے) تو یہاں فرنچ لٹریچر اور دوسرے ملکوں میں انگلش لٹریچر پھیلا ہوا ہے، اور اس میں یہ سب اثرات تھے۔

سب سے زیادہ قابل تشویش اور حزن وفکر کی بات یہ ہے کہ ممالک عربیہ اس وقت امریکہ اور اسرائیل کا نشانہ ہیں اور ان کا یہ حملہ بہت حد تک کامیاب ہے، وہاں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ (جو قیادت کے منصب پر عام طور سے فائز ہوتا

ہے) احساس کہتری میں مبتلا ہو گیا ہے، وہ اسلام کے مستقبل سے گویا مایوس ہوتا جا رہا ہے خاص کر الجزائر اور مصر پیش پیش ہیں، وہاں کی قیادتیں اور حکومتیں دینی دعوت اور تحریک سے بہت زیادہ خائف ہیں، وہاں اصل ٹکراؤ دینی نشأۃ ثانیہ کی تحریک و دعوت سے ہے، حکومتوں اور دین پسند اور اسلام پسند طبقوں کے درمیان محاذ قائم ہے، حالانکہ الجزائر، طرابلس، الغرب، مصر؛ یہ وہ ملک ہیں جن میں تحریک آزادی کی قیادت علماء نے کی، لیکن آج یہ ممالک سب سے زیادہ خطرہ دین کے داعیوں اور اسلامی قائدین اور تحریکوں کو سمجھتے ہیں، مصر میں شیخ حسن البنا کو خطرہ سمجھا گیا اور وہ شہید ہوئے، عبدالناصر کا زمانہ آیا تو سید قطب کو شہید کیا گیا، اور کتنی جانیں شہید ہوئیں، مصر والجزائر کی حکومتیں خاص طور پر دین کے جذبہ کے بیدار ہونے، دینی حمیت کو اور یہ کہنے کو کہ ''یہ اسلامی شریعت کے خلاف ہے'' ''یہ حکومت کیوں کر رہی ہے'' اس کو اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں، ان کو خطرہ اب نہ اسرائیل سے ہے اور نہ کسی غیر مسلم طاقت سے ہے، اب اگر خطرہ ہے تو صرف دینی عنصر سے ہے، یہ بڑا المیہ ہے، ایسا المیہ جہاں جامع ازہر ہے، جہاں افریقہ کے جگر پارے افریقہ اور اسلامی ممالک کے لخت جگر ہزاروں کی تعداد میں

پڑھتے ہیں اور عالم اسلام میں جامع ازہر کو سب سے بڑا دینی وعلمی ادارہ اور جامعہ سمجھا جاتا ہے۔

اس وقت کا جو چیلنج ہے اور تشویشناک حقیقت ہے وہ یہ کہ ہمارے عرب ممالک اسلامی دعوت سے خائف ہیں، کوئی طاقت ور تحریک نہیں ہے اور کشش رکھنے والی جماعت اور داعیوں سے یہ ممالک محروم ہیں۔

عرب ممالک جن سے ہم کو ایمان کی دولت ملی، قرآن کی دولت ملی اور انسانیت کی حقیقت ملی، اور جو ہمارے لئے ہدایت کا سبب بنے، جن کا ساری دنیا پر وہ احسان ہے جو کسی بڑی سے بڑی فرماں روا قوم، کسی بڑی سے بڑی عالی مرتبہ تہذیب، کسی بڑے سے بڑے کلچر وثقافت کا وہ احسان نہیں جو عربوں کا احسان ہے، ان ہی کی وجہ سے ہم صاحب ایمان ہیں، حساس وفرض شناس انسان ہیں، ان عربوں میں اس وقت دعوت کی آواز نہ صرف یہ کہ دب گئی ہے، پست ہوگئی ہے بلکہ گم ہوگئی ہے، اور تحریک اخوان المسلمین کے بعد سے معلوم ہوتا ہے کہ سناٹا چھا گیا ہے، یہاں جو مظالم ہوئے اس کی بنا پر وہاں جو لوگ اس کے اہل تھے وہ لوگ ملک چھوڑ چھوڑ کر چلے گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مصر میں ایک ایسا دور گذرا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ نہیں آتا تھا کہ مسلمان دنیا

میں اثر انداز ہوسکتے ہیں، چنانچہ جب ہماری کتاب ’’**ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین**‘‘ قاہرہ سے شائع ہوئی (جس پر ڈاکٹر احمد امین نے ایک کمزور مقدمہ لکھا تھا، پھر دوسرا طاقتور مقدمہ سید قطب شہید نے لکھا تھا اور ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ کا مقدمہ بھی تھا) جب ہم مصر گئے تو ایک اخبار نے لکھا کہ کیا مسلمان بھی دنیا پر اثر ڈال سکتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کے عروج وزوال سے دنیا پر اثر پڑسکتا ہے؟ کیا نام رکھا ہے اس کتاب کا؟ اس نے انگلی اٹھائی اور تعجب کیا، حالانکہ میں نے اقبالؔ کے شعر سے کام لیا ہے اور بالکل یہ شعر اس کا جواب ہے جو انہوں نے ابلیس کی طرف سے نقل کیا ہے۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

مسلمان اس پوزیشن میں کہاں ہیں، اس تعداد میں کہاں ہیں کہ دنیا پر اثر انداز ہوسکیں؟ یہ ہے ممالک عربیہ کا اس وقت کا سب سے بڑا مرض، بڑا خطرہ کہ اسلام کے مستقبل سے وہ مایوس ہوتے جارہے ہیں، ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اسلام ہی دنیا کیلئے ذریعۂ نجات ہے، مذہبی طور پر، اخلاقی طور پر، دنیوی طور پر بھی، معاشرتی طور پر بھی اور

سیاسی طور پر بھی، یہ وہ کام ہے جو اس وقت قدر و قیمت کے لحاظ سے، اور اہمیت کے لحاظ سے اہم ترین اور مؤثر ترین کام ہے۔

آپ اپنے اندر وہ قابلیت پیدا کریں کہ آپ عربوں کو متأثر کرسکیں، اس کے لئے ضرورت ہے کہ آپ کی زبان و تحریر میں وہ اثر ہو اور وہ شگفتگی، جاذبیت و ادبیت ہو کہ عرب کہیں کہ کیا خوب لکھا ہے، چنانچہ الحمدللہ یہاں سے ندوۃ العلماء کی ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' سے وہ لٹریچر عرب ممالک میں جاتا ہے جسے عرب بھی جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں اور سناتے ہیں، ہم نے یہ دیکھا کہ مولوی عبداللہ عباس ندوی صاحب کے مکان پر مکہ معظّمہ میں ہم بیٹھے ہوئے تھے، استاد عبدالحکیم عابدین ایک رسالہ پڑھنے لگے، ہم کو ضرورت پڑی ہم نے کہا کہ ہم ابھی آتے ہیں، واپس آئے تو دیکھا کہ وہ پڑھ رہے ہیں اور رو رہے ہیں، یہ امام حسن البناء کے بہنوئی تھے اور بڑے خطیب وتعلیم یافتہ، جب ہم آئے تو ہمارا نام لے کر کہا کہ یہ کس کی لکھی ہوئی کتاب ہے؟ ہم نے کہا کہ ہمارے برادرزادہ محمد الحسنی کی، تو انہوں نے کہا کہ ان کو میرا سلام کہنا، یہ کتاب ''الاسلام بین لا ونعم'' تھی۔

آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی یہاں کے وسائل کے

اعتبار سے یہ عظیم کارنامہ ہوگا کہ آپ عربوں میں دین کی دعوت کو پہنچانے کی صلاحیت پیدا کریں، اللہ تعالیٰ نے اس کے اسباب مہیا فرمائے ہیں، ایک ہدف ونشانہ بنائیں کہ ہم اپنے اندر وہ قابلیت وصلاحیت پیدا کریں جس سے ہم عربوں کو دین پر زیادہ جمنے کی دعوت دے سکیں، ہماری کتابوں میں سے '' **الی الاسلام من جدید ، أجاهلية بعد الاسلام أيها العرب، الی الرأية المحمدية أيها العرب** '' یہ سب کتابیں وہ ہیں جو عربوں کو چونکا دینے والی اور جھنجھوڑنے والی ہیں، وہ کہیں گے کہ ایک عجمی، ایک ہندی الثقافۃ ہمیں خطاب کررہا ہے، اس کے اندر اسلام کا اتنا اعتماد ہے جو اعتماد ہمارے اندر اب نہیں رہا ہے، اللہ تعالیٰ اگر نفع پہنچادے تو اس سے بڑھ کر تقرب الی اللہ کا کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کے ذریعہ سے اس امت کے افراد میں دین پر اعتماد پیدا ہو، جن کے ذریعہ سے یہ نعمت اور یہ دولت ساری دنیا میں پھیلی، ہمارے مدارس عربیہ کے فضلاء میں یہ جذبہ دوسروں سے زیادہ ہونا چاہئے کہ ہم جن کی زبان کے ذریعہ سے دین کو سمجھ رہے ہیں، جن سے ہم کو یہ دولت علم ملی ہے اور مل رہی ہے ان کا حق ہے کہ ہم اس کو پھر ان کے پاس لے جائیں ان کے اندر اس کا احساس پیدا ہو اور ان کے اندر یہ

غیریت پیدا ہو، وہ استاد ہیں ہم شاگرد، وہ پیر ہیں ہم مرید، اور وہ ہمارے ہادی ہیں ہم مہتدی، تو اس لئے ’’معہد الدعوۃ‘‘ قائم ہے جو بڑے نیک شگون کی بات ہے اور مبارک باد دینے کے لائق ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے عزیزوں اور رفقائے کار کو جزائے خیر دے۔

اپنے اس عہد میں، اپنے اس ملک میں، اپنے اس ماحول میں آپ یہ کیجئے کہ تعلیم یافتہ طبقہ کو خاص طور پر اور عام مسلمانوں کو عام طور پر سامنے رکھ کر اس حقیقت کو ذہن نشین کریں کہ زمانہ کتنا ہی بدل گیا ہے لیکن دین ابدی ہے، اور آج بھی وہ دین صحیح وکامل اور زندہ ہے، اور دین ہی اس زمانہ کی رہبری کرسکتا ہے اور اس دین کے ذریعہ ہی سے ہم اس زمانہ میں کامیاب ہوسکتے ہیں، فتح یاب ہوسکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت کے مستحق ہوسکتے ہیں۔

یہ تو کام آپ کا ہر جگہ ہے، مقامی طور پر بھی ہے، تعلیم یافتہ طبقہ میں خاص طور پر جو پہلے انگریزی تہذیب سے متأثر ہورہا تھا اور اس کا شکار بن رہا تھا، اب ہندو تہذیب سے متأثر ہونے لگا ہے اور خطرہ ہے کہ وہ ہندو دیومالا اور تہذیب سے متأثر ہو، اس کو بھی آپ ذہن میں رکھیں، عربی زبان کی تعلیم حاصل کرنے سے یہ فائدہ ذہن میں نہ رکھیں کہ ہم بلاد عربیہ

میں جائیں گے اور کہیں جگہ مل گئی تو نوکری کرلیں گے، نہیں تو مؤذن بن جائیں گے، امام بن جائیں گے، یہ قیمت نہیں ہے آپ کی اور نہ یہ مولانا سید محمد علی مونگیری صاحب رحمۃ اللہ علیہ ومولانا سید ظہور الاسلام فتح پوری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ اور دارالعلوم کا منصوبہ بنانے والوں اور اس کو ترقی دینے والوں میں علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ اور ان کے اہل اللہ وعارف باللہ رفقاء و معاونین کے مقاصد، محنتوں اور قربانیوں کی ہے، اس کی رسید وشکریہ یہ ہے کہ آپ داعی بنیں، مخالف اسلام تہذیبوں سے مسلمانوں کی مرعوبیت دور کریں جو مغربی مصنفین کی کتابیں پڑھنے سے پیدا ہورہی ہے، اور دوسری طرف آپ عربوں سے ’’**بضاعتنا ردّت الینا**‘‘ کہلوائیں۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

وصلی اللہ تبارک و تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وآلہ و أصحابہ .

☆☆☆

انتخابات

از

ارکان اربعه

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولاناؒ نے اسلام کے چار بنیادی ارکان وفرائض کی حقیقتوں اور حکمتوں سے بحث فرمائی ہے جس کا ذکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث: ”**بنی الاسلام علیٰ خمس شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا عبده ورسوله واقام الصلوة ایتاء الزكوة و الحج وصوم رمضان**“ میں مذکور ہے۔

یقیناً یہ حضرت مولاناؒ کی لاجواب، معرکۃ الآراء کتاب ہے جسے حضرت مولاناؒ نے غایت تحقیق وتدقیق اور نہایت باطنی کیف وحال میں ڈوب کر تصنیف فرمائی ہے اور اکابر کی کتابوں سے ایسے ایسے اقتباسات نقل فرمائے ہیں جن کا پڑھنا انشاء اللہ ضرور حرارت ایمان کے ازدیاد کا باعث ہوگا۔

کتاب مذکور کے متعلق حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی زیدمجدہ نے اپنی کتاب ”میر کارواں“ (جو صاحب تذکرہ کی سوانح ہے) میں بطور تبصرہ یوں ارقام فرمایا ہے:

”ارکان اربعہ کے مصنف نے ان عبادتوں کو فطرت انسانی کا تقاضہ اور بشریت کا زیور قرار دیا ہے،

انسان کی خصوصیت اوراس کی فطرت کا مطالبہ بتایا ہے کہ اس کے بغیر انسان کا وجود ایک لاشہ رہ جاتا ہے اس کے اندر انسانی خصائل مفقود ہوجاتے ہیں، روح انسانیت عبادتوں کے بغیر ماہیٔ بے آب کے مانند تڑپتی رہتی ہے، جبکہ اسلامی عبادات روح کی غذا اور مزاج شریعت کی دوا ہے، دوسرے مذاہب میں عبادات نامعلوم خوف سے نجات کا اور دنیاوی منافع کے حصول کا ذریعہ ہیں۔''

اس کے اخیر میں یوں تحریر فرمارہے ہیں:

''جو حضرات حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے طرز بیان اور اسلوب بحث سے مانوس ہیں، خاص طور پر ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے اسلوب وبیان سے، ان کو محسوس ہوگا کہ کتاب حجۃ اللہ البالغۃ کا مبارک تتمہ ہے اوراس کے رنگ میں ڈوب کر حکمتوں کے موتی مصنف نے یکجا کردیئے ہیں۔'' (میر کارواں: ص/۵۱۸)

(مرتب)

مقدمہ

''ارکان اربعہ''

الحمد لله وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

اس کتاب میں اسلام کے چار بنیادی رکن نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کی حکمتوں سے بحث کی گئی ہے، اسمیں ان کی صحیح شرعی حیثیت، قانونی پہلو، دینی نظام اور انفرادی واجتماعی زندگی میں ان کے مقام، اوران کے ان مقاصد اوراسرار کی تشریح کی گئی ہے، جو قرآن وحدیث سے ثابت ہیں، اور جن کو قرون اولیٰ کے مسلمانوں، دین کے حقیقت شناسوں اور تاریخ اسلام کے ممتاز اور معتبر علماء دین اور راسخین فی العلم نے عجمی تکلف وخیال آرائی، فلسفیانہ موشگافی اور شخصی انتہاپسندی اور مبالغہ آرائی کے بغیر اس کے اصل سرچشمہ سے ٹھیک ٹھیک اخذ کیا تھا، وہ نہ درآمد کئے ہوئے افکار وخیالات اور نہ اپنے زمانہ کے جدید رجحانات سے متأثر ہوئے تھے، نہ ان ارکان کی حقیقتوں اور حکمتوں، ان کے مقاصد واسرار اوران کے اصول و طریقۂ کار کو اپنے اپنے زمانہ کے سیاسی فلسفوں اور معاشی واجتماعی نظاموں کے پیمانہ سے ناپ رہے تھے۔

مصنف نے اس کتاب کی تالیف میں قرآن مجید کا از سرنو مطالعہ کیا، حدیث کے صحیح اور معتبر مآخذ کا دوبارہ جائزہ لیا، اوران ارکان کے موضوع، نیز ان کی تشریح وتفصیل اوران کے مقاصد واسرار کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر ایک نظر

ڈالی، اسے اس سلسلہ میں سب سے بڑی مدد ان ائمۂ اسلام کی تحریروں اور تحقیقات سے ملی جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے فہم صحیح کا حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، اور وہ افراط و تفریط اور تکلف ومبالغہ آرائی سے محفوظ رہ کر اس کی گہرائیوں تک پہنچ گئے تھے، اور جنہوں نے مقاصد شریعت، رموز کتاب اور اسرار واحکام کے بیان اور تشریح میں وہی طریقہ اختیار کیا جو شریعت کو مطلوب ہے اور جو ان اولین مسلمانوں کا شیوہ تھا جو اس کے براہ راست مخاطب تھے، اور جن کی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا۔

یہ لوگ دین کی گہری بصیرت، صحیح فہم، عمیق علم، مکمل عمل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بہ قدم اتباع اور علم وعمل کے میدان میں جہد مسلسل کے جامع تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے ہدایت کے تمام راستے کھول دیئے اور دشوار چیزوں کو آسان بنا دیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ٥
(العنكبوت ٦٩)

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے ضرور دکھائیں گے اور بیشک اللہ خلوص والوں کے ساتھ ہے۔

ایک طرف ان عبادات کی روح ان کے سارے وجود میں جاری وساری تھی، اور وہ اس رنگ میں پوری طرح رنگ چکے تھے، دوسری طرف وہ ان علوم کے قلب وجگر میں اتر گئے تھے، اور اس میں بھی ان کو مرتبۂ کمال حاصل تھا، جن کے بغیر ان اسرار ورموز تک رسائی ناممکن تھی، انہوں نے صدق واخلاص سے اس پر

عمل کیا تھا، اور اعلیٰ درجہ کی بصیرت، ذہانت گہرائی اور دقت نظر کے ساتھ اس کی روح وحقیقت کو سمجھا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان عبادات کے مضامین ومعانی، اسرار ورموز اور حقائق ومضمرات بے ساختہ ان کی زبان سے ادا ہوئے۔

مصنف کو اس سلسلہ میں سب سے زیادہ فائدہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مایۂ ناز کتاب ”حجۃ اللہ البالغہ“ سے ہوا جو اپنے موضوع پر بے نظیر اور منفرد کتاب ہے، شاہ صاحب نے ان چاروں ارکان سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کا جوہر اور عطر اس کتاب میں آ گیا ہے۔

یہ کتاب ایک طویل مطالعہ کا نچوڑ اور مسلسل غور وفکر کا نتیجہ ہے اور اس سے کم از کم ایک مہتم بالشان اور اہم موضوع پر غور وخوض فکر ونظر کا نیا دروازہ کھلتا ہے۔

”والحمد لله الذی بعزته و جلاله تتم الصالحات“

ابوالحسن علی ندوی

دائرۂ شاہ علم اللہؒ
رائے بریلی

نماز

وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ

نماز کی حقیقت

اور اس کے فوائد واسرار

رب اور بندہ کا تعلق

نماز کی حقیقت اور اس کی اہمیت وضرورت کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے، اور اس کا صحیح لطف بھی وہی اٹھا سکتا ہے جو اس عجیب وغریب، بلند ولطیف اور ناقابل قیاس تعلق سے پوری طرح آگاہ ہو، جو رب اور بندہ کے درمیان قائم ہے، یہ ایک ایسا تعلق ہے جس کی نظیر کسی اور جگہ نہیں مل سکتی، اس کو اس کائنات کی کسی دو ہستیوں کے باہمی تعلق یا محض صانع ومصنوع، حاکم ومحکوم، قوی وضعیف، مفلس ومحتاج اور سائل ومعطی کے تعلق پر بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا، اسلئے کہ یہ تعلق ان تمام رشتوں سے زیادہ لطیف اور بلند اور ان سب سے زیادہ گہرا مستحکم، جامع اور وسیع ہے۔

تعلقات صفات کے تابع ہیں

رب اور بندہ کے اس تعلق کو سمجھنے کیلئے خدا کی صفات سے واقفیت بھی ضروری ہے، اس لئے کہ تعلقات ہمیشہ صفات کے تابع ہوتے ہیں، صفات ہی سے ان کی نمود ہے، اگر ہم کو کسی دو ہستیوں یا دو شخصیتوں کے صفات کا علم نہیں ہے اور ہم حسن سلوک اور احسان مندی کے اس رشتہ سے واقف نہیں ہیں، جو ان دونوں کے درمیان قائم ہے تو ہم ان تعلقات کی صحیح نوعیت کبھی نہیں سمجھ سکتے، وہ تمام تعلقات جن کو ہم زندگی میں برتتے ہیں جن سے قانون کی تشکیل ہوتی ہے، اور جو کسی تہذیب ومعاشرہ کو وجود میں لاتے ہیں، وہ سب درحقیقت ان ہی صفات کے تابع ہیں جس کی کارفرمائی انسانی معاشرہ پر ہم کو نظر آرہی ہے۔

شریعت اسلامی اور قرآن مجید میں صفات واسماء کی اہمیت کی وجہ

یہی وجہ ہے کہ تمام آسمانی صحیفوں اور تمام مذہبوں اور شریعتوں نے سب سے پہلے سب سے زیادہ زور صفات پر دیا ہے، اور اس کے بعد تعلقات، عبادات و طاعات اور فرائض و معاملات کی تفصیل بیان کی ہے، تمام آسمانی مذاہب میں اعمال وعبادات اور احکام وقوانین سے پہلے عقیدہ کی تصحیح کی گئی ہے، اور اپنے زمانہ میں ہر نبی نے سب سے پہلے علم صحیح، معرفت صحیحہ، اور اللہ تعالیٰ کے صحیح اوصاف اور اس کی تقدیس وتنزیہہ کی تعلیم دی ہے، اور ان کی کوششوں، ان کی دعوت وتبلیغ اور ان کی جد و جہد کا سب سے بڑا مرکزی نقطہ یہی رہا ہے، قرآن مجید جو ان تمام

صحیفوں کا نگراں اور محافظ ہے، اور خدا کی آخری اور ابدی کتاب ہے، اس بات کی گواہی کیلئے کافی ہے، ارو یہ موضوع بار بار اور طرز بدل بدل کر اس میں بیان کیا گیا ہے، بلکہ یہی اس معجزانہ کتاب کا بنیادی موضوع ہے، چنانچہ اس مختصر سورۂ اخلاص کو (جس میں چند آیتوں کے اندر توحید وتنزیہہ کے جامع ترین الفاظ آگئے ہیں) قرآن مجید کا ایک تہائی حصہ بتایا گیا ہے۔

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی صفات کریمہ، اسماء حسنیٰ، اس کے افعال وتصرفات اس کی قوت وقدرت، اس کی صنعت وخلاقی، اس کے لطف ورحمت، اس کی محبت و رأفت، اس کے جودوکرم، اس کے عفوودرگذر، اس کے عطاومنع، اس کے نفع وضرر، اس کے علم ومعرفت، اس کے قرب ومعیت، اس کے احاطۂ قدرت اور اس کے قبول ونوازش کو اس طرح بیان کیا ہے کہ جمال وجلال، کمال ونوال اور حسن واحسان کی آخری مثال بندہ کے سامنے آجاتی ہے۔

وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (سورۂ روم:۲۷)	اور آسمان اور زمین میں اسی کی شان (سب سے) اعلیٰ ہے اور وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔
لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (سورۂ شوریٰ:۱۱)	کوئی چیز اس کے مثل نہیں اور وہی ہر بات کا سننے والا ہے (ہر چیز کا) دیکھنے والا ہے۔

انسان مجموعۂ اضداد ہے

ان آسمانی صحیفوں میں ایسے نصوص واشارات بھی ملتے ہیں (اور علم وتجربہ سے ان کی تصدیق ہوتی ہے) جن میں اس عجیب وغریب مخلوق کی فطرت ونفسیات بیان کی گئی ہے، اور اس کے خمیر میں متضاد کیفیات وصفات کی جو عجیب وغریب آمیزش ہے، اس سے پردہ اٹھایا گیا ہے، اس سے زیادہ عجیب وغریب اور اس سے زیادہ مجموعۂ اضداد مخلوق اور کوئی نہیں ہے، وہ کمزور ہے، لیکن قوت وطاقت کا پرستار ہے، محتاج ہے لیکن مال ودولت کا عاشق ہے، فانی ہے لیکن حیات ابدی کا خواہاں ہے، امراض وخطرات سے دوچار ہے، لیکن صحت وعافیت کا طلب گار ہے، کم ہمت بھی ہے اور عالی حوصلہ بھی، اس کی حاجتیں بے شمار، اس کی تمنائیں غیر محدود، اس کے احساسات حباب سے زیادہ نازک اور اس کے جذبات ہر لحہ تغیر پذیر، نہ اس کی پیاس بجھتی ہے، نہ کسی چیز سے اس کو سیری ہوتی ہے، ہر قدیم چیز سے دل برداشتہ اور ہر جدید کا دلدادہ، جو چیز میسر ہے اس سے روگرداں اور جو چیز معدوم ومفقود ہے اس کی جستجو میں سرگرداں، اس کی خواہشات کی تعداد اس کی سانسوں سے زیادہ، اور اس کی ضرورتوں کی فہرست اس کی عمر سے زیادہ طویل ہے، اور یہ محدود دنیا اس کی آرزوؤں کی تکمیل کیلئے ناکافی ہے۔

لیکن اسی عجیب وغریب تضاد میں اس کی عالی ہمتی وحوصلہ مندی، سیماب وشی وبے قراری اور اسی ''شوقِ جنوں'' اور ''ذوق طلب'' میں اس کی عزت وسربلندی اور خلافت الٰہی سے سرفرازی کا راز پنہاں ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے اس کو وہ

بارِامانت اٹھانے پرآمادہ کیا جسکی معذرت آسمان، زمین، پہاڑ سب کر چکے تھے۔

فابین أن یحملنها و أشفقن منها وحملها الانسان انهٔ کان ظلوماً جهولاً (سورۂ احزاب ۷۲)	سو ان سب نے انکار کیا اس سے کہ اسے اٹھائیں اور وہ اس سے ڈرے اور اسے انسان نے اپنے ذمہ لے لیا، بیشک وہ بڑا ظالم ہے بڑا جاہل ہے۔

فطری انس ومحبت:

انسان کا خمیر عشق ومحبت کے ساتھ اٹھا ہے، حواس خمسہ کے ساتھ ساتھ جن سے وہ اپنی مادی زندگی میں فائدہ اٹھاتا ہے، اس کو ایک حاسّہ اور بھی عطا کیا گیا ہے، جس کو ہم عشق ومحبت یا انس والفت کا حاسہ کہہ سکتے ہیں، یہ حاسّہ طاقتور بھی ہو سکتا ہے اور کمزور بھی آشکارا بھی ہوسکتا ہے اور مستور بھی، لیکن اس سے محرومی صرف اس بات کی علامت ہے کہ انسان یا تو اپنی استعداد کھو چکا ہے، یا اپنی فطرت سے منحرف ہوکر جمادات میں داخل ہوگیا ہے، وہ وفا شعار بھی ہے اور زود رنج بھی، اس کے جذبات متلاطم اور اس کے احساسات نازک ہیں، وہ جمال وکمال کی طرف اس طرح بے ساختہ کھنچتا ہے کہ دنیا کی کوئی مخلوق اس طرح نہیں کھنچتی، وہ اپنے محبوب ومطلوب پر اپنی جان، اپنی محبت، اپنا خلوص، اپنے جذبات اور اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار رہتا ہے، عشاق واہلِ محبت کے سچے واقعات اسی فطرتِ انسانی کے آئینہ دار، اہلِ معرفت اہلِ درد کی پوری تاریخ اسی جذبہ کا اظہار،

اور دنیا کا سارا جذباتی ووجدانی لٹریچر، اور غزل کا سارا سرمایہ (جس سے کسی ملک کا ادب بھی محروم نہیں) اسی ''سوز دروں'' کا مرہون منت اور اسی ''ذوقِ جنوں'' کا احسان مند ہے۔

خدااورانسان کے تعلق کی صحیح اور معقول شکل:

سب سے پہلے ہم کو اپنے پروردگار کے ان تمام صفات کو جن کو ہم قوت و قدرت، علم واحاطہ، رحم وکرم، جود وعطا، قبول واستجابت، اور قرب ومعیت سے تعبیر کرتے ہیں، نیز قرآن مجید نے اس کے جو صفاتِ عالیہ اور اسماء حسنیٰ بیان کئے ہیں اور ان کی جو بلیغ ومعجزانہ تفصیل وتشریح کی ہے، اس کو ذہن میں تازہ کرنا چاہئے پھر انسان کے ان صفات کو مستحضر کرنا چاہئے جس کا خلاصہ ضعف وعجز اور فقر وافلاس کے دولفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے، پھر اس کی ہمت کی بلندی اور بلند پروازی پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہئے جو کسی اور مخلوق میں ودیعت نہیں کی گئی، مادّیت وروحانیت کے دونوں شعبوں میں اس کی نہ مٹنے والی بھوک اور نہ بجھنے والی پیاس کو دیکھنا چاہئے، جس میں اس نے حیوانات کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے، اس کی ضرورتوں خواہشوں، فرمائشوں اور آرزوؤں کی نہ ختم ہونے والی فہرست کو دیکھنا چاہئے جس کی کثرت وتنوع اور نازک خیالی اور دقیقہ رسی میں اس کا کوئی شریک نہیں، پھر اس کی اس محبت و وارفتگی جذبۂ سرافگندگی اور شان تسلیم ورضا اور اندازِ وفا کو دیکھنا چاہئے، جو اس کے رگ رگ میں پیوست ہے۔

ان سب کھلی ہوئی حقیقتوں کے بعد کیا ایک انسان کو اس کی احتیاج نہیں کہ

وہ اپنے اُس پروردگار کے حضور میں مسلسل طاعت وعبادت، مسلسل رکوع وسجود اور مسلسل دعاومناجات کی حالت میں رہے جو جواد مطلق اور مالک الملک ہے اور جو اس کی ہر ضرورت (خواہ وہ زبان قال سے بیان کی گئی ہو یا زبانِ حال سے) پوری کرتا ہے۔

و اٰتٰکم مِنْ کُلِّ مَاسَأَلْتُمُوْہُ وَ اِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَاتُحْصُوْهَا.	اور تم کو ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو انہیں شمار کرنہ پاؤ گے۔
(سورۂ ابرہیم-۳۴)	

جو ایسے ایسے نازک ومستور احساسات، بھولے بسرے خیالات اور قدیم وفراموش شدہ آرزوؤں اور تمناؤں سے واقف ہے جن کو انسان نے خود فراموش کر دیا ہے یا مایوس ہوکر ان سے دستبردار ہوگیا ہے، ایسے ایسے نازک خیالات جن میں بسا اوقات دل کو عقل کی شرکت بھی گوارا نہیں ہوتی ہے۔

واعلموا ان اللہ یحول بین المرء وقلبه	اور جانے رہو کہ اللہ آڑ بن جاتا ہے درمیان انسان اور اس کے قلب کے۔
(سورۂ انفال-۲۴)	
یعلم خائنة الاعین و ما تخفی الصدور	(اللہ) جانتا ہے آنکھوں کی چوری کو اور جو کچھ سینہ میں چھپا ہوا ہے، اس کو بھی۔
(سورۂ مومن-۱۹)	

و ان تجهر بالقول فانهٗ یعلم السر و اخفیٰ	اور اگر تو پکار کر بات کہے تو وہ چپکے سے کہی ہوئی بات اور اس سے زیادہ چھپی ہوئی بات کو جانتا ہے،
(سورہ طٰہٰ-۷)	

جو ہر قریب سے زیادہ قریب، ہر سننے والے سے زیادہ سننے والا اور جواب دینے والا ہے:

و اذا سألک عبادی عنی فانی قریب اُجیب دعوة الدَّاعِ اِذَا دَعَان فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلهم یرشدون.	اور جب آپ سے میرے بندے میرے باب میں دریافت کریں تو میں تو قریب ہی ہوں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے پس لوگوں کو چاہئے کہ میرے احکام کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں عجب نہیں کہ ہدایت پا جائیں۔
(سورۂ البقرہ-۱۸۶)	
ولقد خلقنا الانسان و نعلم ما توسوس بهٖ نفسهٗ ونحن اقرب الیه من حبل الورید.	اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم (خوب) جانتے ہیں ان وسوسوں (تک) کو جو اس کے جی میں آتے ہیں، ہم تو اس کی رگ گردن سے بھی بڑھ کر اس کے قریب ہیں۔
(سورۂ قٓ-۱۶)	

و نحن اقرب اليه منكم ولكن لا تبصرون (سورۂ واقعہ۔۱۵)	اور ہم تم سے بھی زیادہ قریب اس شخص کے ہوتے ہیں البتہ تم نہیں سمجھتے۔

جس کو گڑ گڑا کر سوال کرنے والا اور رُو رُو کر دامن تھامنے والا اور ہر جگہ سے کٹ کر اس کے در پر پڑا رہنے والا مستغنی و بے نیاز انسان سے زیادہ محبوب ہے:

وقال ربكم اُدعونی استجب لكم ، ان الذين يستكبرون عن عبادتی سيدخلون جهنم داخرين (سورۂ امومن-۶۰)	اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ مجھے پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا ، جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔
اُدعوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً و خفية ، انهٗ لا يُحِبُّ الْمُعْتَدين (سورۂ اعراف-۵۵)	اپنے پرودگار سے دعا کر و عاجزی کے ساتھ اور چپکے چپکے بیشک وہ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے " انه من لم يسأل الله يغضب عليه" (جو اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتا ہے)

پوری کائنات محو عبادت اور سر بسجود ہے:

جب سے یہ کائنات وجود میں آئی اس وقت سے سورج روشنی و زندگی اور

حرارت کا منبع ہے، اور اپنا فرض بے کم و کاست اور بے چوں و چرا انجام دے رہا ہے، چاند اپنی آب و تاب اور اپنی رفتار کے ذریعہ مہینوں اور سالوں کا تعین کرتا ہے، پہاڑ ہزاروں سال سے اپنی اپنی ڈیوٹی پر کھڑے ہیں، درخت اپنی اپنی جگہ ایستادہ اور خدا کی عبادت میں مشغول ہیں، اور اپنے سایہ اور پھل سے لوگوں کو فائدہ پہنچا رہے ہیں، ہوا اس انسان کے لئے (جو کائنات کا سردار اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہے) حیات کا پیغام لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے، بادل پانی بھر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہیں، اور زمین کو نئی زندگی بخشتے ہیں، اس کی وجہ سے چشمے جاری ہوتے ہیں، انسان کی پیاس دور ہوتی ہے فصلیں تیار ہوتی ہیں، اور زمین اپنا خزانہ اگل دیتی ہے، چوپائے اپنی ٹانگوں پر چلتے پھرتے دوڑتے بھاگتے اور گویا رکوع کی تصویر نظر آتے ہیں، انسان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہیں بوجھ اٹھاتے ہیں، ان کے ذریعہ لوگ سردی سے بچاؤ کا سامان اور اپنے کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں، بہت سے جانور پیٹ کے بل چلتے ہیں، اور ان سے بھی انسان کو مختلف فوائد حاصل ہوتے ہیں، یہ تمام مخلوقات جو نہ دل رکھتے ہیں نہ عقل، ہر وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت میں مشغول ہیں، نہ ان کے یہاں نافرمانی ہے، نہ بغاوت، نہ سرکشی، نہ اکتاہٹ، نہ یہ اسٹرائک کرتے ہیں، نہ کبھی چھٹی لیتے ہیں، گویا ہر وقت اور ہر حالت میں وہ سر بسجود ہیں۔

اس کے بعد مصنفؒ نے اس مضمون کے مناسب آیات ثبت فرمائی ہیں جو قابل مطالعہ ہیں اس کے بعد یوں رقمطراز ہیں :

یہ مخلوقات اپنے اشکال کے اختلاف و تنوع اور طرز عبادت کے فرق کے

باوجود ایک ایسی نماز اور ایک ایسی حمد وتسبیح میں مشغول ہیں جو ان کے فرض منصبی اور ان کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور جس کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے، جس کی چشم بصیرت اللہ تعالیٰ نے کھول دی ہو اور یہ مادی حجاب اٹھا لئے ہوں۔

تسبح لهٗ السمٰوٰت السبع والارض ومن فيهن وان من شيءٍ الا يسبح بحمدهٖ ولكن لا تفقهون تسبيحهم انهٗ كان حليماً غفوراً . (سورۂ بنی اسرائیل-۴۴)	اسی کی پاکی بیان کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی بھی ان میں موجود ہیں اور کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اس کی پاکی نہ بیان کرتی ہو، البتہ تم ہی ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو، بیشک وہ بڑا حلیم ہے بڑا مغفرت والا ہے۔
الم تران الله يسبح لهٗ من في السمٰوٰت والارض والطير صٰفّٰتٍ كُلٌّ قد علم صلاتهٗ وتسبيحه والله عليمٌ بما يفعلون. (سورۂ نور -۴۱)	کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ کی تسبیح کرتے رہتے ہیں جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرند بھی جو پر پھیلائے ہوئے ہیں ہر ایک کو معلوم ہے اپنی اپنی دعا اور اپنی تسبیح اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ لوگ کرتے رہتے ہیں۔

اس کائنات میں انسان کا مقام اور دوسری مخلوقات سے اس کے امتیاز کا راز:

انسان اپنی ان مذکورہ بالا خصوصیات، اپنی برتری وشرف، اپنی عقل اور اپنے قلب کی وجہ سے دوسری مخلوقات کی بہ نسبت اس بات کا زیادہ حقدار تھا کہ مسلسل حالتِ عبادت میں رہتا اور اپنا ہر لمحہ رکوع وسجود، حمد وتسبیح اور ذکر الٰہی میں گزارتا، اور کسی وقت بھی اس کی زبان اس کے ذکر سے غافل نہ ہوتی، جو عطیات ربانی اس کے ساتھ مخصوص ہیں، اور جن انعامات کا مستحق اس کو بنایا گیا ہے، جو بیشمار نعمتیں اس پر مینہ کی طرح برستی رہتی ہیں، ان سب کا تقاضا بلا شبہ یہی تھا کہ وہ عبادت کو ایک لمحہ کے لئے بھی ترک نہ کرتا اور نماز سے پلک جھپکنے کے برابر غافل نہ ہوتا اور ان فرشتوں کی طرح ہو جاتا جن کے متعلق قرآن مجید کا بیان ہے:

ولهٗ من في السمٰوٰت والارض ، ومن عندهٗ لا يستكبرون عن عبادتهٖ ولا يستحسرون ، ويسبحون الليل و النهار لا يفترون . (سورۂ انبیاء-۱۹-۲۰)	اور اسی کی ملک ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو اس کے نزدیک ہیں وہ اس کی عبادت سے عار نہیں کرتے اور نہ وہ تھکتے ہیں، رات دن تسبیح کرتے رہتے ہیں موقوف نہیں کرتے۔

لیکن چونکہ اس کو اس زمین پر اللہ کا خلیفہ بننا تھا، اور نہایت نازک منصب پر فائز ہونا تھا، اس لئے اس میں خواہشات بھی رکھی گئی ہیں، اور کچھ ضرورتیں بھی اس کے ساتھ وابستہ کردی گئی ہیں، اس میں جذبات بھی ہیں اور سوز محبت بھی، احساس الم بھی اور شعور مسرت بھی، ذوق جستجو اور شوقِ علم بھی، وہ زمین کے خزینوں اور دفینوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی پوری صلاحیت وقابلیت رکھتا ہے تعلیم اسماء کی جو خصوصیت وامتیاز اس کو حاصل ہے، وہ دراصل اس کی فطری استعداد کا رمز اور خلافتِ ارضی کا مظہر ہے۔

و اذ قال ربک للملئکة انی جاعلٌ فی الارض خلیفةً قالو ا اتجعل فیها من یفسد فیهاو یسفک الدمآء. ونحن نسبح بحمدک و نقدس لک قال انیٓ اعلم مالا تعلمون ، وعلم اٰدم الاسمآء کلها ثم عرضهم علی الملئکة فقال انبئونی باسمآ ء هٰؤلآء ان کنتم صٰدقین

اور (وہ وقت یاد کرو) جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں زمین پر اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں وہ بولے کیا تو اس میں ایسے کو نائب بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا در آں حالیکہ ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور تیری پاکی پکارتے ہیں (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور اللہ نے آدمؑ کو نام سکھلا دیئے کل کے کل، پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا، پھر فرمایا بتلاؤ تو ان کے نام اگر تم سچے ہو،

قالوا سبحٰنک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم . قال یاٰادم انبئهم باسمائهم فلما انبأ هم باسمآئهم قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السمٰوٰت والارض و اعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون

(سورۂ بقرہ ٣٠/٣٣)

وہ بولے تو پاک ذات ہے ہمیں تو کچھ علم نہیں مگر ہاں وہی جو تو نے ہمیں علم دے دیا، بیشک تو ہی ہے بڑا علم والا، حکمت والا (اللہ نے) فرمایا اے آدم بتلا دو انہیں ان کے نام، پھر جب انہوں نے انہیں ان کے نام بتلا دیئے تو فرمایا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا ہوں اور جو کہ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ سب جانتا ہوں۔

هو الذی خلق لکم مافی الارض جمیعاً .

(سورہ بقرہ-٢٩)

وہ وہی (خدا) ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب۔

قل من حرّم زینة الله التی اخرج لعبادهٖ والطیبٰت من الرزق .

(سورہ اعراف-٣٢)

آپ کہئے اللہ کی زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لئے بنائی ہے کس نے حرام کر دیا ہے اور کھانے کی پاکیزہ چیزوں کو؟

اس اہم اور نازک منصب کی ذمہ داریوں کو نباہنے اور اس خاص مقصد کی تکمیل کیلئے جس کے لئے اس کی تخلیق کی گئی، اس کو اجرام فلکی، پہاڑوں، نباتات جمادات اور حیوانات کی طرح مسلسل قیام، مسلسل رکوع، مسلسل سجود اور مسلسل تسبیح و ذکر کا پابند نہیں کیا گیا، اور اگر وہ کبھی اس کی کوشش کریگا تو اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی حیثیت سے اپنی ناکامی کا ثبوت فراہم کریگا اور ان فرشتوں کے اعتراض کو حق بجانب ثابت کرے جنہوں نے اسکے بجائے اس بنا پر اپنی خدمات پیش کی تھیں اور اپنے کو خلافت کا مستحق سمجھتا تھا کہ وہ ہمیشہ تسبیح وتحمید اور ذکر وعبادت میں مشغول رہتے ہیں﴿ **ونحن نسبح بحمدک و نقدس لک**﴾

موزوں طریقۂ عبادت:

ان تمام باتوں کے پیش نظر انسان کے لئے ایک ایسے طرز عبادت یا نظامِ عبادت کی ضرورت تھی، جو اس کی فطرت، اس کے فرائض منصبی، اس کائنات میں اس کے مرتبہ ومقام اور اس ذمہ داری اور فریضہ کے ساتھ ہم آہنگ ہو جو خلافت الٰہی کی صورت میں اس کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے، ایک طرف عبادت اس کے لئے ضروری بھی تھی، اس لئے کہ اس کی فطرت کا تقاضا اس کے وجود کا منشا، اس کے ضمیر کی آواز، اس کی شرافت واحسان مندی کا اظہار، انسانیت کی ضرورت اور قلب وروح کی غذا ہے، دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ یہ عبادت اس کے قد و قامت اور شخصیت کے مطابق اور اس کی نازک اور اہم حیثیت اور اس کائنات میں اس کے منفرد مقام کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور اس لباس کی طرح ہو جو اس کے

قد وقامت پر پوری طرح راس آئے اور زیب دے نہ تنگ ہو نہ ڈھیلا، نہ کم ہو نہ زیادہ۔

اس کی شخصیت کا لباس:

نماز درحقیقت یہی لباس ہے جو ٹھیک ٹھیک اس کے وجود پر پورا اتر رہا ہے، اور جس میں کسی قسم کی کوئی کمی بیشی نظر نہیں آتی۔

الایعلم من خلق وهو اللطیف الخبیر. (سورۂ ملک-۱۴)	کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی) باریک بیں اور (پورا) باخبر ہے۔
اِنَّا کُلَّ شَیءٍ خلقناہ بقدر (سورۂ القمر ۴۹)	ہم نے ہر چیز کو (ایک خاص) انداز سے پیدا کیا ہے۔

نماز کی مقدار وتعداد میں تخفیف کا راز اور اس کے نفسیاتی فوائد اور اثرات:

حکمت الٰہی اور شریعت ربانی نے اس کے لئے جو طریقہ اختیار کیا وہ ایک بلند منتہا کی طرف تدریج وتسہیل کے ساتھ بڑھنے کی معجزانہ مثال ہے۔ معراج میں پچاس نمازیں فرض کی گئیں پھر اس کو کم کر کے پانچ نمازوں تک لے آیا گیا۔

اور یہ اس لئے کیا گیا تاکہ انسان کے ہمیشہ یہ پیش نظر رہے کہ اصل نماز

پچاس ہی مقرر کی گئی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کا اہل سمجھا تھا کہ وہ اپنے وقت قوت اور دل ودماغ کا اتنا بڑا حصہ اس کی عبادت میں صرف کرے، جو شخص اس بات کو مستحضر اور پیش نظر رکھے گا، وہ ان پانچ نمازوں کو کبھی زیادہ نہ سمجھے گا، بلکہ یہ محسوس کرے گا کہ وہ تو اس سے زیادہ کا اہل سمجھا گیا تھا اور اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے یہ تخفیف نہ کی ہوتی تو وہ اسی پر عمل کرتا اور بے چوں وچرا حکم بجالاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ لطف وکرم کا معاملہ فرمایا اور ان پانچ نمازوں کو پچاس کے مساوی بنادیا لیکن یہ پہلا حکم انسان کی عالی ہمتی اور بلند نظری پر مہمیز کا کام دینے کے لئے اب بھی کافی ہے۔

قرآن میں اس کی ایک نظیر:

ہمیں قرآن مجید سے بھی اس خیال کی تصدیق حاصل ہوتی ہے، پہلے مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ تھا کہ وہ اپنے سے دس گنا دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم رہیں، پھر ان کے لئے بہت آسانی اور تخفیف کردی گئی اور صرف اس کا مطالبہ رہا کہ اپنے سے دوگنے دشمن کے مقابلہ پر ان کو ثابت قدم اور غالب رہنا چاہئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

یا ایھا النبی حرض المؤمنین علی القتال . ان یکن منکم عشرون صٰبرون یغلبوا مائتین ،

اے نبی مومنین کو قتال پر آمادہ کیجئے، اگر تم میں سے بیس آدمی بھی ثابت قدم ہوں گے تو دوسو پر غالب آجائیں گے، اور اگر تم

و ان یکن منکم مائة یغلبوآ الفاً من الذین کفرو بانھم قومٌ لا یفقھون . الئٰن خفف اللہ عنکم و علم ان فیکم ضعفاً . فان یکن منکم مائة صابرة یغلبوا مائتین وان یکن منکم الفٌ یغلبوآ الفین باذن اللہ ، واللہ مع الصابرین .

(سورۂ انفال-٦٥،٦٦)

میں سے سو ہوں گے تو ایک ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے، اس لئے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے، اب اللہ نے تم پر تخفیف کردی اور معلوم کرلیا کہ تم میں جوش کی کمی ہے سو (اب) اگر تم میں سے سو ثابت قدم ہوں تو دوسو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ہزار ہوں تو دو ہزار پر غالب رہیں گے اللہ کے حکم سے، اور اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔

لیکن اس تخفیف کے باوجود یہ پہلا حکم مسلمانوں کے اندر جوش عمل اور جذبۂ قربانی پیدا کرنے میں بہت معاون ثابت ہوا اور ان کو ہمیشہ جان سے کھیلنے اور خطرات مول لینے پر آمادہ کرتا رہا، یہ آیت جو منسوخ ہونے کے باوجود تلاوت کی جاتی ہے، اس میں شاید یہی حکمت ومصلحت ہے کہ اس کے ذریعہ مسلمانوں میں ایک نئی شجاعت اور نیا جوش عمل پیدا ہوسکے اور یہی سچے مسلمانوں اور سربکف مجاہدوں کا شیوہ اور اصل معیار ہے۔

☆☆☆

روحانی غذائیں اوردوائیں اوران کی خوراک واوقات:

یہ پانچوں نمازیں ان ہی متعین اوقات میں ادا کرنا ضروری ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں۔

ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتاً (سورۃ النساء-۱۰۳)	بیشک نماز تو ایمان والوں پر پابندیِ وقت کے ساتھ فرض ہے۔

قرآن مجید میں اس کے اوقات کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔

ان پانچ نمازوں کیلئے رکعتیں بھی متعین ہیں، جن کی پابندی ضروری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد صحابہ کرامؓ نے زندگی بھر اور ہر موقع پر اس کی پابندی کی، یہاں تک کہ جہاد وقتال کے موقع پر بھی اس میں کوئی تبدیلی گوارانہیں کی اوراس عمل اور عبادت میں اس قدر تواتر، تسلسل اور اجماع رہا جس کی نظیر دنیا کی کسی ملت اور تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی، امت اسلامیہ نسل درنسل اس کو حفاظت کے ساتھ منتقل کرتی رہی اور نازک سے نازک ساعت، سخت سے سخت آزمائش اور تاریک سے تاریک دور میں بھی وہ ایک دن کیلئے ملتوی نہیں کی گئی۔

یہ پانچ وقت کی نمازیں اپنے اوقات اور رکعتوں کے ساتھ دراصل روحانی غذائیں اور صحت کے انجکشن ہیں، جو انسانوں کے خالق مالک الملک اور حکیم وعلیم نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کئے ہیں، وہ حکیم وعلیم جو صرف نفوس کا طبیب ہی نہیں بلکہ ان کا خالق وصانع بھی ہے، اس لئے اس کی حکمت وآئین کے سامنے

بے چوں وچرا سر تسلیم خم کردینا چاہئے پھر اس پر مضبوطی سے ثابت قدم رہنا چاہئے اسی تعداد ومقدار کے ساتھ ان نمازوں کو ادا کرنا چاہئے جو خدا نے مقرر کردی ہیں، اورانہیں اوقات میں ان کو ادا کرنا چاہئے جو اللہ کی طرف سے ان کے لئے معین ہیں، ان اوقات کے اسرار اوران میں اللہ تعالیٰ کی جو تجلیات، ان کے اندر رحمتوں کی جو بارش اوران میں جو نورانیت اور روحانی ترقی کا سامان پایا جاتا ہے، اس کا علم وادراک اللہ اوراس کے رسول کے سوا کسی کو نہیں۔

ان اوقات کے تعین کے وسیع مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ان اوقات میں مشرکین اپنے معبودانِ باطل (آفتاب، ستارہ، پتھر اور آگ وغیرہ) کی عبادت کیا کرتے تھے، اس لئے ان میں خدائے واحد کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔

جب انسان ڈاکٹروں اور طبیبوں کے مشورہ اوران کے مقرر کردہ اوزان وخوراک کی پابندی ضروری سمجھتا ہے، حالانکہ وہ ان ہی کے سطح کے لوگ اوران ہی کی طرح گوشت وپوست کے انسان ہیں، ان کے تجربے محدود اور اندازے تخمینی ہیں، تو پھر خدائے حکیم وعلیم کے حکم کے بارے میں ہمارا کیا رویہ ہونا چاہئے جس کی شان یہ ہے کہ:

الذی اعطیٰ کُلَّ شیءٍ خلقهٗ ثمَّ هدیٰ (سورۂ طٰہٰ ۵۰)	جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ عطا کی، پھر اس کی رہنمائی کی۔
الایعلم من خلق وهو اللطیف الخبیر (سورۂ ملک ۱۴)	کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی) باریک بیں اور (پورا) باخبر ہے۔

نمازوں کے اوقات اور ان کے تسلسل کی حکمت:

ان نمازوں کی تکرار اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ان کے تسلسل میں بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے، اس میں نفس انسانی کے لئے مکمل اور صالح غذا کا سامان ہے، اور ماسویٰ اللہ سے غفلت اور قلب وروح پر مادّیت کے حملوں سے بچاؤ کا پورا انتظام ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’امت کی سیاست اور اس کی زندگی کا نظام اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک ہر تھوڑی مدت اور وقفہ کے بعد اس کی نگہداشت نہ کی جاتی رہے، یہاں تک کہ نماز کے لئے اس کا انتظار اور اس کے لئے بہت پہلے سے تیاری نماز ہی کے رنگ اور نماز ہی کے نور کا ایک حصہ ہے اور اسی کے حکم میں آتا ہے، اور اس طرح اکثر اوقات اس کے دائرہ میں آجاتے ہیں، ہم کو اس کا تجربہ ہے کہ جو تہجد کی نماز کی نیت کے ساتھ سوئے گا وہ کم از کم بہائم کی نیند نہ سو سکے گا، اسی طرح کسی کو اگر نماز یا کسی ورد کی فکر دامنگیر ہوگی وہ بہیمیت میں پڑنے سے باز رہے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد ’’من تعارّ من اللیل‘‘ الحدیث۔ کا مقصود منشا بھی یہی ہے‘‘

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

رجالٌ لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله (سورۂ نور-۳۷)

ایسے لوگ جنہیں نہ تجارت غفلت میں ڈالتی ہے نہ (خرید و) فروخت اللہ کی یاد سے۔

اسلام میں نماز کی اہمیت:

یہ احکام الٰہی کی وہ حکمتیں ہیں جن کے سامنے ہم کو سر تسلیم خم کر دینا چاہئے، ہمارا ایمان ہونا چاہئے کہ نماز بندوں پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فریضہ ہے، دین کا ستون ہے، مسلمانوں اور کافروں کے درمیان وجہ امتیاز ہے۔

نجات کی شرط ہے، ایمان کی محافظ ہے، اور اس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت و تقویٰ کی بنیادی شرائط کے طور پر بیان کیا ہے، ارشاد ہے:

الٓمّٓ ذٰلک الکتاب لاریب فیه . هدًى للمتقين ، الذين يؤمنون بالغيب ويقيمون الصلوٰة ومما رزقنٰهم ينفقون. (بقرہ:۱/۳)

الٓمّٓ، یہ کتاب (کہ) کوئی شبہ اس میں نہیں، ہدایت ہے (اللہ سے) ڈر رکھنے والوں کے لئے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

قد افلح من تزکیٰ وذکر اسم ربه فصلیٰ (سورۂ الاعلیٰ-۱۴-۱۵)

بامراد ہوا وہ جو پاک ہوا اور اپنے پروردگار کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا۔

اخلاق ذمیمہ رکھنے والوں سے نماز کی حفاظت کرنے والوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے ارشاد ہے:

الا المصلین الذین هم علیٰ صلاتهم دآئمون
(سورۃ المعارج-۲۲-۲۳)

ہاں البتہ وہ نمازی (اس حکم میں داخل نہیں) جو اپنی نمازوں میں برابر لگے رہتے ہیں۔

کامیاب مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

والذین هم علیٰ صلوتهم یحافظون
(سورہ مومنون-۹)

اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرنے والے ہیں۔

اہل جہنم کے ذکر میں ارشاد ہے:

ما سلککم فی سقر قالوا لم نک من المصلّین
(سورۂ مدثر-۴۲-۴۳)

تمہیں کون سی چیز دوزخ میں لائی ؟ وہ کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔

منافقین کے بیان میں ہے:

ان المنٰفقین یخٰدعون الله وهو خادعهم ، واذا قاموآ الی الصلوٰة قاموا کسالیٰ یرآءون الناس ولا یذکرون الله الا قلیلاً
(سورۃ النساء۱۴۲)

بیشک منافقین تو اللہ سے چال چل رہے ہیں، حالانکہ اللہ انہی کی چالوں کو ان پر الٹ رہا ہے، اور یہ لوگ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں

(صرف) لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کی یاد کچھ یوں ہی سی کرتے ہیں۔

یہ ہر آزاد اور غلام، امیر غریب، بیمار اور تندرست، مسافر اور مقیم پر ہمیشہ کے لئے اور ہر حال میں فرض ہے، کسی بالغ انسان کو کسی حال میں اس سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا، بخلاف روزہ، حج اور زکوٰۃ کے جو مختلف شرائط وصفات کے ساتھ وابستہ ہیں، اور ان کے متعین اور محدود اوقات ہیں، نماز میدان جنگ میں بھی فرض ہے، اور صلوٰۃ خوف کے نام سے موسوم ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

واذاضربتم فی الارض فلیس علیکم جناحٌ ان تقصروا من الصلوٰة ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا ، ان الکٰفرین کانوا لکم عدوّاً مبینا . و اذا کنت فیهم فاقمت لهم الصلوٰة فلتقم طائفة منهم معک ولیأخذوآ اسلحتهم فاذا سجدوا فلیکونوا من وّرائکم ولتأت طآئفة اخریٰ لم یصلوا فلیصلوا معک

اور جب تم زمین پر سفر کرو تو اس باب میں کوئی مضائقہ نہیں کہ نماز میں کمی کر دیا کرو، اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر لوگ تمہیں ستائیں گے، بیشک کافر تو تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہی ہیں، اور جب آپ ان کے درمیان ہوں اور ان کے لئے نماز قائم کریں تو چاہئے کہ ان میں کا ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور وہ لوگ اپنے ہتھیار لئے رہیں پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو اب چاہئے کہ وہ تم لوگوں کے

ولیأخذوا حذرهم واسلحتهم ودّالذین کفرو لو تغفلون عن اسلحتکم وامتعتکم فیمیلون علیکم میلةً واحدة ، ولاجناح علیکم ان کان بکم اذیً من مطرٍاو کنتم مرضیٓ ان تضعوا اسلحتکم ، وخذوا حذرکم ، ان الله اعدّ للکفرین عذاباً مهیناً فاذا قضیتم الصلوة .. فاذکروا الله قیاماً و قعوداً وعلیٰ جنوبکم فاذا اطمأننتم فاقیموا الصلوٰة ان الصلوٰة کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتاً

(سورۂ نساء۱۰۱/۱۰۳)

پیچھے ہوجائیں اوردوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آجائیں اور وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھ لیں اور یہ لوگ بھی اپنے بچاو کا سامان اوراپنے ہتھیار (ساتھ) لئے رہیں کافروں کی تو خواہش یہی ہے کہ تم اپنے ہتھیاروں اوراپنے سامان سے (ذرا) غافل ہو جاؤ تو یہ لوگ تمہارے اوپر یکبارگی ہی ٹوٹ پڑیں اور تمہارے لئے اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ اگر تمہیں بارش سے تکلیف ہورہی ہو یا تم بیمار ہوتو اپنے ہتھیار اتار رکھو اور اپنے بچاؤ کا سامان لئے رہو ، بیشک اللہ نے کافروں کے لئے ایک رسوا کرنے والا عذاب تیار کررکھا ہے پھر جب تم (اس) نماز کوادا کر چکوتو اللہ کی یاد میں لگ جانا کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اور پھر جب تمہیں اطمینان حاصل ہوجائے تو نماز کی

اقامت کرو، بیشک نماز تو ایمان والوں پر پابندی وقت کے ساتھ فرض ہے۔

حافظوا علیٰ الصلوٰت والصلوٰة الوسطیٰ وقوموا للہ قٰنتین ، فان خفتم فرجالاً اورکباناً فاذآامنتم فاذکرو الله کما علمکم مالم تکونوا تعلمون .

(سورۂ بقرہ:۲۳۸/۲۳۹)

سبھی نمازوں کی پابندی رکھو اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی اور اللہ کے سامنے عاجزوں (کی طرح) کھڑے رہا کرو، لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہوتو تم پیدل ہی (پڑھ لیا کرو) یا سواری پر، پھر جب تم امن میں آجاؤ تو اللہ کو یاد کیا کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ہے جس کو تم جانتے (بھی) نہ تھے۔

نماز کے دوام کی ضرورت اوراس کے ترک کے خطرات:

یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو کسی نبی اور رسول سے بھی ساقط نہیں ہوتا چہ جائیکہ کسی ولی اور عارف مجاہد سے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿واعبد ربک حتیٰ یأتیک الیقین﴾ اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہئے یہاں تک کہ آپ کو امر یقین پیش آجائے) اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ مشاہدہ اور یقین کی منزل پر پہنچنے کے بعد یا اسلام کے راستہ میں مختلف خدمات انجام دینے یا اپنے کارناموں اور اپنے مقام کی وجہ سے یہ فریضہ اس سے ساقط ہوگیا تو وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے،اورزبردست خطرہ کو دعوت دیتا ہے۔

کسی خدمت وجہاد کی وجہ سے نماز سے غافل کی مثال:

اپنے کسی کارنامہ، کسی خدمت یا کسی کیفیت اور حال پر اعتماد کر کے نماز چھوڑ دینے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کشتی کا کوئی عالم وفاضل سوار اپنے علم و فضل کے زعم میں کسی تختہ یا کیل کو یہ کہہ کر توڑنے یا نکال دینے کے درپے ہوجائے کہ اس کی اس کشتی میں کیا ضرورت ہے، اور ایک تختہ یا کیل نہ ہونے کی وجہ سے کیا نقصان ہوگا اس کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے، وہ اس کو بلا ضرورت اور غیر مفید قرار دے کر زبردستی تختہ یا کیل کو توڑ دے اور بالآخر اس کی اس بوالفضولی کی بدولت کشتی مع مسافروں کے غرق دریا ہوجائے۔

نماز کی پابندی اور حفاظت کا راز اور اس کے تارک کی سزا:

نماز میں ایمان اور دین کی حفاظت، اللہ تعالیٰ سے تعلق دائرہ اسلام میں رہنے اور جماعت مومنین میں شمولیت کی حفاظت وسلامتی کا راز پوشیدہ ہے یہ کیوں ہے؟ اس کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے، ایک بڑے عارف ومحقق بزرگ (مخدوم شیخ شرف الدین یحیٰ منیریؒ) نے اس نکتہ کی تشریح کے لئے ایک بڑی سبق آموز اور عارفانہ حکایت بیان کی ہے۔

''اس کو ایسا سمجھو کہ ایک شخص نے ایک پہاڑ کی چوٹی پر محل تعمیر کیا، وہاں انواع واقسام کی نعمتیں جمع کیں، جب اس کا اخیر وقت ہوا تو اس نے لڑکے کو وصیت کی کہ اس محل میں جو ترمیم وتصرف چاہنا کرنا لیکن ایک خوشبودار گھاس کا

ایک حصہ جو میں چھوڑ کر جا رہا ہوں وہ چاہے خشک ہوجائے اس کو باہر نہ کرنا، جب پہاڑ کی چوٹی پر بہار آئی تو پہاڑ اور میدان سرسبز ہوگئے بہت سی تازہ اور خوشبودار گھاس پیدا ہوگئی جو اس پرانی گھاس سے زیادہ تروتازہ تھی، اس میں سے بہت سی گھاس اور پھول اس محل میں آئے جن کی خوشبو نے سارے محل کو معطر کر دیا، اور ان کے سامنے اس پرانی سوکھی ہوئی گھاس کی خوشبو دب گئی، لڑکے نے سوچا کہ میرے والد نے یہ پرانی گھاس اس محل میں اس لئے رکھی تھی کہ اس کی خوشبو پھیلے اور یہ جگہ اس سے معطر ہو، اب یہ سوکھی گھاس کس کام آئیگی، اس نے حکم دیا کہ اس گھاس کو باہر پھینک دیا جائے، جس وقت محل اس گھاس سے خالی ہوگیا، ایک کالے سانپ نے سوراخ سے سر نکالا اور لڑکے کو ڈس لیا اور اس کا کام تمام ہوگیا۔

سبب اس کا یہ تھا کہ اس گھاس کے دو فائدے تھے، ایک یہ کہ وہ خوشبو دے اور دوسرے اس میں یہ خاصیت تھی کہ وہ جہاں ہوتی ہے، سانپ اس کے قریب نہیں جا سکتا، گویا وہ سانپ کا تریاق تھی، یہ خاصیت کسی کو معلوم نہیں تھی، لڑکے کو اپنی ذہانت پر ناز تھا، وہ سمجھا کہ جو اس کے معلومات کے دائرہ میں نہ ہو گویا کہ قدرت خداوندی کے خزانہ میں موجود نہیں ہے، اس کو اس آیت کا مفہوم نہیں معلوم تھا ﴿وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً﴾ وہ اپنی ذہانت کے غرّہ میں مارا گیا۔

تارک الصلوٰۃ کی بھی یہی مثال ہے، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ نماز سے مستغنی ہے، اور ان مقاصد کو حاصل کر چکا ہے، جن کے لئے نماز کا حکم ہے، یا اسلام اور مسلمانوں کی کسی بڑی خدمت یا عبادت و ریاضت یا اپنے جہاد و سرفروشی یا تحریک ودعوت میں اپنے انہماک ومشغولیت پر بھروسہ کر کے نماز کو حقیر یا بے ضرورت سمجھتا

ہے اوراس سے غفلت برتتا ہے تو وہ تباہی کے دہانہ پر کھڑا ہے، اوراس کے سارے اعمال اور ساری خدمات نہ صرف رائیگاں بلکہ وبالِ جان ہیں، اوراس کی مثال اس بکری یا بھیڑ کی ہے جو اپنے گلہ اور چرواہے سے علیحدہ ہوکر دور جائے اور بالآخر بھیڑیئے کا لقمۂ تر بن جائے۔

نمازمومن کے حق میں ایسی ہے جیسے مچھلی کے لئے پانی:

نماز دراصل اس فطرت انسانی اور تقاضہ بشری کی تسکین اور تکمیل ہے جس کو ہم ضعف واحتیاج، مجبوری ودرماندگی، دعاومناجات، اوراس خدائے بزرگ و برتر کی پناہ میں آجانے اوراس کے در پر سر رکھ کر پڑ رہنے کا جذبہ کہہ سکتے ہیں، جو طاقتور ہے بے نیاز ہے، سخی داتا ہے رحم کرنے والا اور مہربان ہے، حفاظت کرنے والا، عطا کرنے والا، جاننے والا اور خبر رکھنے والا سننے اور دینے والا ہے درحقیقت شکرواحسان مندی، وفاشعاری اور حب الٰہی، عبودیت وتذلل، اور خشوع وتواضع کے اس جذبہ کی تسکین ہے، جو انسان کی سرشت میں ہے، اوراس کی انسانیت کا سب سے بڑا جوہر ہے، اس بارہ مین مومن کی مثال مچھلی کی سی ہے جس کی زندگی پانی کے ساتھ وابستہ ہے، اگراس کو زبردستی پانی سے نکال بھی لیا جائے تب بھی وہ پانی کے لئے بیقرار اور پانی کی محتاج رہے گی اور موقع ملتے ہی بے ساختہ اس پر ٹوٹ پڑے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، آپ نے فرمایا **جعلت قرة عینی فی الصلوٰة** (نسائی) میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے، اسی طرح حضرت بلالؓ سے آپ نے فرمایا کہ یابلال

اقم الصلوٰۃ ارحنا بھا (ابوداؤد کتاب الادب) (اے بلال نماز کی تیاری کرو اوراس کے ذریعہ ہم کو آرام دو۔)

مومن کی جائے پناہ اور جائے امن:

نماز مومن کیلئے اس محبت کرنے والی ماں سے بھی زیادہ پناہ لینے، سر چھپانے اور آرام پانے کی جگہ اوراس کی گود سے بھی زیادہ راحت رساں اور جنت بداماں ہے، جو ایک یتیم، ضعیف وعاجز بےسہارات اور لاڈلے بچے کیلئے ہروقت کھلی رہتی ہے، اور جب بھی بچہ کو کسی قسم کے گزند اور نقصان کا خطرہ ہوتا ہے، کوئی اس کو چھیڑتا اور پریشان کرتا ہے یا اس کو بھوک اور پیاس ستاتی ہے، یا وہ کسی چیز سے سہم جاتا ہے، تو فوراً ماں سے چمٹ جاتا ہے، اوراس کی گود میں بیٹھ کر سمجھ لیتا ہے کہ وہ سب سے محفوظ ہوگیا، اسی طرح نماز بھی مومن کی سب سے بڑی پناہ گاہ اور جائے قرار ہے، یہ وہ مضبوط رسی ہے جو اس کے اوراس کے رب کے درمیان پھیلی ہوئی ہے، وہ چاہے اس رسی کو مضبوطی سے تھام کر اپنی حفاظت کی ضمانت حاصل کرسکتا ہے، یہ اس کی روح کی غذا، درد کا درماں، زخم کا مرہم، بیماری سے شفا اوراس کا سب سے بڑا ہتھیار اور سہارا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا ایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصابرین (سورہ بقرہ ۱۵۳)

اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد چاہو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی خاص مسئلہ کا سامنا ہوتا تھا تو آپ فوراً نماز کی طرف توجہ فرماتے تھے، حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشانی درپیش ہوتی تو فوراً نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے (ابوداؤد) حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ ''جب کبھی رات کو تیز ہوا چلتی آپ مسجد کی طرف رخ فرماتے اور جب تک ہوا تھم نہ جاتی وہیں تشریف رکھتے، اسی طرح جب سورج یا چاند گرہن ہوتا تو نماز میں مشغول ہو جاتے یہاں تک کہ گرہن دور ہو جاتا۔ (رواہ الطبرانی)

ابوداؤد میں نضر سے روایت ہے کہ ''حضرت انسؓ کے زمانہ میں ایک مرتبہ بڑا اندھیرا چھا گیا، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے کہا کہ اے ابوحمزہ (حضرت انسؓ کی کنیت) کیا کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ایسا ہوا کرتا تھا؟ انہوں نے فرمایا کہ توبہ توبہ، اگر کبھی زور کی آندھی بھی آتی تھی، تو ہم بھاگ کر مسجد میں پناہ لیتے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں قیامت نہ آرہی ہو۔''

نماز سے صحابہ کرامؓ کی شیفتگی اور اس کی خاطر ہر قسم کے مرغوبات کی قربانی اس زمانہ کے مشرکین سے پوشیدہ نہ تھی، مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ''ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قبیلے جہینہ کے لوگوں سے جہاد کیا، انہوں نے بہت سخت جنگ کی (حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ) وہ کہتے تھے کہ ''ان کی اس نماز کا وقت آنے والا ہے، جو ان کو ان کی اولاد سے بھی زیادہ محبوب ہے۔''

☆☆☆

نماز میں جسم عقل اور قلب تینوں کی نمائندگی ہے:

نماز صرف جسمانی حرکات یا کسی چوب خشک جیسے نظام کا نام نہیں جس میں نہ روح ہوتی ہے، نہ زندگی، نہ وہ کوئی ایسا فوجی ڈسپلن ہے جس میں ارادہ واختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا، وہ ایک ایسا عمل ہے جس میں جسم عقل اور قلب سب شریک ہیں، اور اس میں ان تینوں چیزوں کی حکیمانہ ومنصفانہ نمائندگی موجود ہے، جسم کے حصہ میں قیام اور رکوع وسجود آیا ہے، زبان کے حصہ میں تلاوت وتسبیح آئی ہے، عقل کے حصہ میں تفکر وتدبر آیا ہے، قلب کے حصہ میں خشوع وانابت اور رقت وکیفیت آئی ہے اور قرآن مجید میں ان تینوں کا ذکر موجود ہے، جسم کے اعمال کی طرف ان آیتوں میں اشارہ ہے:

وقوموا للّٰہ قٰنتین	اور اللہ کے سامنے عاجزوں کی
(سورہ بقرہ-۲۳۸)	طرح کھڑے رہا کرو۔
یآایھا الذین اٰمنوا ارکعوا	اے ایمان والو رکوع کیا کرو
واسجدوا واعبدوا	اور سجدہ کیا کرو اور اپنے
ربکم وافعلوا الخیر	پروردگار کی عبادت کرتے رہو
لعلکم تفلحون	اور نیکی کرتے رہو تاکہ کچھ
(سورہ حج-۷۷)	فلاح پاجاؤ۔

اور قلب کے اعمال کی طرف ان آیات میں اشارہ ہے:

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تقربوا الصلوٰۃ . و انتم سکریٰ حتیٰ تعلموا ماتقولون.	اے ایمان والو ! نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم نشے میں ہو یہاں تک کہ جو کچھ (منہ سے) کہتے ہو اسے سمجھنے لگو۔
(سورۂ نساء:۴۳)	
قد افلح المؤمنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون	یقیناً (وہ) مومنین فلاح پا گئے جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں۔
(سورہ مومنون ۱-۲)	
تتجافیٰ جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفاً و طمعاً ومما رزقنٰھم ینفقون .	ان کے پہلو خوابگاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں اور اپنے پروردگار کو وہ پکارتے رہتے ہیں خوف سے اور امید سے اور جو کچھ ہم نے دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔
(سورۂ سجدہ-۱۶)	

صرف ایک چیز کی نمائندگی پر اصرار جہل اور گمراہی ہے:

انسان جسم، عقل اور دل تینوں چیزوں کا مجموعہ ہے اور اسی لحاظ سے نماز میں جو اس دین کا سب سے بڑا مظہر ہے، انسانی فطرت کے تمام بنیادی شعبوں اور نمایاں پہلوؤں کی نمائندگی موجود ہے بعض مقننین مذاہب، اہل عبادت

و ریاضت اور عہد آخر کے یہودیوں نے اس کو محض جسمانی حرکات سمجھا، بعض فلسفہ زدہ اور اشراقی صوفیوں نے اس کو صرف فکر و تدبر اور مراقبہ قرار دیا، بہت سے اہل عیسائی راہبوں اور بعض نام نہاد مسلمان صوفیوں نے اس کو صرف خشوع و انابت، سوز و گداز، گریہ و بکا، دعا و مناجات اور شوق و محبت کی ایک تصویر سمجھا اور تنہا اسی پر قناعت کر کے بیٹھ رہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ یہ تمام طبقے اصل حقیقت سے منحرف اور نماز کے جامع معجزانہ نظام سے ناآشنا تھے۔

مصلحین امت، ماہرین تعلیم وتربیت اور دینی تحریکات کے علمبرداروں کا فرض :

اس امت اور خاص طور پر اس کے علماء اور اہل اصلاح کا فرض ہے کہ وہ اس میراث اور اس قیمتی دولت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، اور تغیر و انقلاب اور مادیت کے تیز و تند تھپیڑوں کے باوجود اس روشنی کو کسی قیمت پر نہ بجھنے دیں، اس لئے کہ اس خسارہ کی تلافی، احکام فقہ کے بڑے سے بڑے ذخیرہ، اسرار شریعت کے علم، سحر بیانی اور زور قلم، کسی چیز سے نہیں ہوسکتی، تجدید و احیاء اور اصلاح و انقلاب کی کوشش اور تحریک اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے، جب امت کے عوام اور علماء میں عشق و محبت اور ایمان و یقین کی اس چنگاری کو دوبارہ بھڑکایا جائے اور دعوت و تربیت، جہاد و مجاہدہ اور اس حقیقی پرسوز اور خشوع و خضوع والی نماز کی کچھ جھلکیاں امت میں پھر پیدا ہوں جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی

خصوصیت اور طاقت تھی، اور جس نے ان کو دشمن کے سامنے بہادری کے ساتھ ثابت قدم رہنے سے پہلے اپنے رب کے سامنے ادب ومحبت اور امید وخوف کے ساتھ کھڑا رہنا سکھا دیا تھا، امام دار الہجرت مالک بن انسؒ نے بالکل صحیح فرمایا ہے:

لن يصلح اٰخر هٰذہ الامة الا ما أصلح أولها.

اس امت کے آخری حصہ کو وہی چیز درست کرسکتی ہے جس نے اس کے پہلے حصہ کو درست کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قد افلح المؤمنون ، الذين هم فی صلاتهم خاشعون (سورہ مومنون ۱-۲)	یقیناً (وہ) مومنین فلاح پاگئے جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں۔

☆☆☆

زکوٰۃ

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ (سورتوبہ-۱۱)	لیکن اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز کے پابند ہوجائیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے بھائی ہوجائیں گے دین میں۔

رب اور بندہ کا تعلق اور اس تعلق کا تقاضا:

رب اور بندہ کے درمیان جو تعلق قائم ہے وہ (جیسا کہ باب اول میں بیان کیا جاچکا ہے) ایسا تعلق ہے جس کے لئے کوئی نظیر، اساس یا پیمانہ ہمارے ان تعلقات میں موجود نہیں جن سے ہم آشنا ہیں، ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک رحیم وکریم اور منعم وفیاض مالک، اور فقیر وذلیل مفلس ومحتاج اور عاجز ودرماندہ انسان کا تعلق ہے، اور اس رب کریم کی صفات کمال، افعالِ قدرت ربوبیت تامہ اور اسی محبت ورأفت اور لطف بے نہایت کا یہ ادنیٰ تقاضا ہے کہ بندہ دل وجان سے اس پر قربان ہوجائے اور نہ صرف مال وزر بلکہ روح و دل ہر چیز اس پر بصد شوق نثار کرنے کیلئے تیار رہے۔

مظاہر ربوبیت اور لطف وعنایت:

اب ہمیں اس کی ربوبیت عامہ رحمت و ہدایت، لطف وعنایت، اور کرم و بخشائش کے مظاہر پر غور کرنا چاہئے یہ اللہ تعالیٰ ہی تو ہے جس نے انسان کو یہ متناسب وموزوں لباس وجود عطا کیا اور اس کو زمین کے خزانوں اور ذخیروں، اور اس کے وسیلوں اور سرچشموں سے فائدہ اٹھانے کی طاقت بخشی اور اس غرض سے اس کے اندر نہایت لطیف، نازک اور حکیمانہ ومعجزانہ نظام قائم فرمایا، اس کے اندر بحث وجستجو کا ذوق، ان وسائل وذخائر کے استعمال، ان کی تنظیم، تبادلہ، باہمی تعاون اور لین دین کی صلاحیت پیدا فرمائی۔

اللہ تعالیٰ کی یہ صفت ربوبیت وہدایت کائنات کے تمام انواع واجناس اور اصناف وموجودات میں جلوہ گر ہے ﴿الذی اعطیٰ کل شیءٍ خلقهٗ ثم ھدیٰ﴾ (س نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ عطا کی پھر اس کی رہنمائی کی) لیکن انسان کو (جو اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بھی ہے) اس کا سب سے بڑا حصہ ملا ہے اور وہی اس کا سب سے بڑا مظہر اور مرکز تجلی ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ آدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا.
(سورہ اسراء-۷۰)

اور ہم نے بنی آدم کو عزت دی ہے اور ہم نے انہیں خشکی اور دریا دونوں) میں سوار کیا اور ہم نے ان کو نفیس چیزیں عطا کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی ہے۔

اس نے اس کے لئے زمین کو ہموار اور فضا کو سازگار بنایا اور زمین کی مخفی طاقتوں، پوشیدہ خزانوں، آبی ذخیروں اور خام معدنیات سے فائدہ اٹھانے کا جذبہ، شوق اور استعداد پیدا کی۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ
(سورۂ ملک:۱۵)

وہ وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے مسخر کر دیا سو تم اس کے راستوں پر چلو پھرو اور اللہ کی (دی ہوئی) روزی میں سے کھاؤ (پیو)۔

اس لئے انسان کے لئے زندگی کی ان ضروری اشیا کو جو (شہری ودیہاتی، ترقی یافتہ اور پسماندہ) ہر قوم کے لئے زندگی کا آسرا اور سرچشمہ ہیں اور جن کے بغیر زندگی کا وجود نا قابلِ تصور ہے، یعنی غلہ پانی اور آگ کو نہ صرف مسخر کیا بلکہ عام وارزاں بنا دیا۔

اَفَرَاَيْتُمْ مَا تَحْرُثُوْنَ، ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ، اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ، بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ، اَفَرَاَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ

اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جو کچھ تم بوتے ہو اسے تم اگاتے ہو یا (اس کے) اگانے والے ہم ہیں اگر ہم چاہیں تو اس (پیدا وار) کو چورا چورا کر دیں پھر تم حیرت کرنے لگو، (اب کی تو) ہم پر تاوان پڑ گیا بلکہ

تَشْرَبُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ
مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ
الْمُنْزِلُوْنَ . لَوْنَشَآءُ
جَعَلْنٰهُ اُجَاجاً فَلَوْلاَ
تَشْكُرُوْنَ ، اَفَرَئَيْتُمُ النَّارَ
الَّتِىْ تُوْرُوْنَ ، ءَاَنْتُمْ
اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ
الْمُنْشِئُوْنَ ، نَحْنُ جَعَلْنٰهَا
تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعاً لِّلْمُقْوِيْنَ .
(سورۂ واقعہ -۶۳ تا ۷۳)

ہم (بالکل ہی) محروم رہ گئے ، اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اس کو بادل سے تم برساتے ہو یا (اس کے) برسانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں اس کو کڑوا کر ڈالیں ، تو تم شکر کیوں نہیں کرتے ، اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ جس آگ کو تم سلگاتے ہو اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے
یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ ہم نے اس کو یاددہانی کی چیز اور مسافروں کے نفع کی چیز بنایا ہے۔

فطرت انسانی کا خاصہ اور زندگی وتمدن پر اس کا اثر:

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جمادات وحیوانات کے برعکس ذوق جمال حسن ونفاست وقوت نمو اور تنوع وترقی کا ایک ایسا جذبہ رکھا ہے جس کے دم سے زندگی کی یہ رونق قائم اور اس کا خون رواں اور گرم ہے، اور اس دنیا کی ساری تعمیر و ترقی ، تنوع وجدت پسندی اور ایجادات وانکشافات دراصل اسی جذبہ کے مرہون منت ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كُلًّا نُمِدُّ هٰؤُلآءِ وَ هٰؤُلآءِ
مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ
عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْراً.
اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ
عَلٰى بَعْضٍ ، وَلَلْاٰخِرَةُ
اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ
تَفْضِيْلاً (سورہ اسراء ۲۰/۲۱)

ہم ہر ایک کو بڑھ بڑھ کر دیتے ہیں ان میں سے بھی اور ان میں سے بھی آپ کے پروردگار کی بخشش میں سے ، اور آپ کے پروردگار کی بخشش (کسی پر) بند نہیں تو دیکھ ہم نے ان میں سے ایک کو
دوسرے پر کیسی فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت یقیناً بہت بڑی ہے درجات کے اعتبار سے بھی اور بہت بڑی ہے فضیلت کے اعتبار سے بھی۔

اس نے اس کے اندر ایک دوسرے سے تعاون کرنے ، حقوق کا خیال رکھنے، ملک کے امن وسلامتی کو برقرار رکھنے، اکل حلال اور مشترکہ منافع کے حصول کے لئے مہم جوئی وخطر پسندی کا جذبہ اور شوق پیدا کیا ، انسانیت کا کوئی طبقہ اور تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں جو اس جذبہ سے خالی اور اس صلاحیت سے محروم رہا ہو۔

لایلٰف قریشٍ، الٰفهم
رحلة الشتآء والصيف ،
فليعبدوا رب هٰذا
البيت، الذىٓ اطعمهم
من جوعٍ وآمنهم من
خوفٍ.
(سورۂ قریش)

قریش کو خوگر ہونے کی بنا پر ، اپنے جاڑے اور گرمی کے سفر کے خوگر ہونے کی بنا پر چاہئے تھا کہ اس خانہ (کعبہ) کے مالک کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک میں کھانے کو دیا ، اور انہیں خوف سے امن دیا۔

کوئی چیز انسان کی حقیقی مِلک نہیں:

ان مسلّمہ حقائق اور فطری صورت حال کا (جس میں انسان کا عجز وافلاس اور اس کا ضعف و بے حقیقتی اپنی آخری شکل میں کھل کر ظاہر ہو رہی ہے اور جس میں خدا کی ربوبیت کاملہ بھی پوری طرح جلوہ گر ہے) نیز عقل، منطق اور ذوق سلیم کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ اس کے بعد کوئی چیز انسان کی ملک نہ سمجھ جائے کوئی چیز اس کی طرف منسوب نہ کی جائے، اور مختصر الفاظ میں اس سے وہ معاملہ کیا جائے جو اس شیر خوار اور چھوٹے بچہ سے کیا جاتا ہے جو اپنے والدین کی گود میں پلتا اور ان کی انگلی پکڑ کر چلتا ہے، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ انسان اس عظیم کائنات میں اور اس بلند و برتر اور قادر مطلق پروردگار کے سامنے اس بچہ سے بھی زیادہ کمزور و ناتواں اور بے حقیقت ہے جو اپنے والدین کے سایۂ عاطفت میں پلتا بڑھتا اور ان کے قدموں میں گھسٹ گھسٹ کر چلتا ہے، خدا کی شان تو اس مجازی مربی و مالک سے کہیں بلند و برتر ہے۔

ولہُ المثل الاعلیٰ فی السمٰوٰت والارض . وھو العزیز الحکیم (سورۂ روم -۲۷)	اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی شان (سب سے) اعلیٰ ہے، اور وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

اس لئے وہ تمام اشیاء جو انسان کی ملکیت سمجھی جاتی ہیں، یا جن املاک کو اس نے اپنے جہل و ناواقفیت کی بنا پر خود اپنی طرف منسوب کر لیا ہے، ان سب کی

اضافت صرف اسی کی طرف کرنی چاہئے جو ان کا پیدا کرنے والا ہے، اور جس نے انسان کو ان چیزوں پر اختیار صرف محدود مقاصد کے لئے محدود وقت تک اور محدود طریقہ پر بخشا ہے۔

اسلام کے اقتصادی نظام کا بنیادی تخیل، ہر چیز خدا کی ملکیت ہے

اس حقیقت کے پیش نظر (جو سارے حقائق پر محیط اور دنیا کے تمام دینی، اخلاقی اور معاشی نظاموں میں جاری وساری ہے) قرآن مجید نے تمام انسانی معاملات کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دیا ہے، اور انسان کو صرف ایک چیز کا ذمہ دار بنایا ہے، اور وہ چیز ہے منصب خلافت۔

وہ مسلمانوں سے کبھی اس انداز سے مخاطب ہوتا ہے۔

و اٰتوھم مِن مَّالِ اللّٰہِ الَّذِی اٰتکم (سورۂ نور -۳۳)	اور اللہ کے اس مال میں سے بھی انہیں دو جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے۔

اور کبھی اس طرح:

و انفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ (سورہ حدید-۷)	اور جس مال میں سے اس نے تم کو دوسروں کا جانشین بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

آیت بالا میں اس کا اعلان صاف طریقہ پر موجود ہے کہ ان تمام اشیاء کا حقیقی مالک اور حقیقی وارث اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے انسان اگر چند پیسے اس کی راہ

میں خرچ کر دیتا ہے تو اس کو اس پر فخر وناز کا کوئی حق نہیں۔

وما لكم ان لا تنفقوا فى سبيل الله ولله ميراث السمٰوٰت والارض .
(سورۂ حدید -۱۰)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہو درانحالیکہ آسمان اور زمین سب آخر میں اللہ ہی کے رہ جائیں گے۔

اس صورت حال کا تقاضہ بلکہ قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ملکیت سے دستبردار ہو جائے اور اس کو اپنی زمین وجائیداد میں ادنیٰ تصرف کا حق باقی نہ رہے اور وہ بالکل مقید پابند اور معطل ہو جائے۔

عہد آخر میں اسلامی معاشرہ کی مابہ الامتیاز خصوصیت:

اسلامی سوسائٹی اپنے نقائص اور کمزوریوں اور متعدد بیماریوں کے باوجود جس کا مقابلہ مصلحین امت برابر کرتے رہے ہیں، اب بھی ہمدردی وغمخواری اور صدقہ وخیرات کے کاموں میں دوسری کسی سوسائٹی سے ممتاز اور فائق ہے، باہمی ہمدردی اور اعانت وغمخواری کا جذبہ اسلامی تعلیمات کے بدولت اس کے رگ وریشہ میں سرایت کر گیا ہے، وہ مادّہ اور معدہ کی پرستش سے بہ نسبت دوسرے معاشروں کے سب سے زیادہ آزاد ہے، اس کے علاوہ اس میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو مادہ پرستی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے رہتے ہیں، اور اس کو دین اسلام کی اخلاقی قدروں کے دائرۂ اثر میں لانا چاہتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں

تجارتی رقابت، انفرادی اور شخصی انانیت، اور دولت پرستی کا تناسب ان سوسائٹیوں کے بہ نسبت جو اس زندگی کے بعد کسی اور زندگی کی قائل نہیں اور عیش وآرام کے سوا اپنی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رکھتیں اور خیالی معاشی معیاروں کے پیچھے دیوانہ وار سرپٹ دوڑ رہی ہیں، بہت کم ہے۔

یہ اسلامی معاشرہ کی موجودہ خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اس کا ایک خاص امتیاز ہے، اس کے سامنے اجتماعی انصاف اور اعلیٰ انسانی قدروں کے اختیار کے مواقع دنیا کی ہر سوسائٹی سے زیادہ ہیں، اور اس کا اصل سبب کسی نہ کسی درجہ میں اسلامی زندگی کا احترام اور اس ایمانی رشتہ کا وجود ہے، جس نے اس کے تمام اجزا کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔

رضا کارانہ اور فطری جذبۂ ہمدردی یا جبری اور محدود نظریۂ مساوات؟

موجودہ زمانہ میں جو معاشی اور ترقی پسندانہ تحریکیں پیدا ہوئی ہیں ان کی قدر مشترک یہ ہے کہ وہ انسان اور انسانیت پر کوئی بھروسہ نہیں رکھتیں، ان تحریکوں کے داعیوں اور حامیوں نے جبری اور محدود طرز کی مساوات کو انسان کے فطری اندرونی اور رضا کارانہ جذبۂ ہمدردی وخیر خواہی پر ترجیح دی ہے، اور اس اہم حقیقت کو فراموش کر دیا ہے کہ صرف مال ہی انسان کی ضرورت نہیں، اور تنہا مال میں شرکت یا مساوات اس کے دل اور احساسات وجذبات کے خلا کو پر نہیں کر سکتی اور نہ اس کے ہر زخم پر مرہم رکھ سکتی ہے، زندگی میں عام جذبۂ ہمدردی کی اس کو ذرائع آمدنی اور ذرائع پیداوار میں شرکت سے کہیں زیادہ ضرورت ہے بعض اوقات ایک قطرۂ اشک جو کسی دُکھے ہوئے دل کا غماز ہوتا ہے، وہ کام کر جاتا ہے

جوزرو جواہر اور لعل و گہر سے بھی نہیں ہوتا، ہر انسان کو اپنے بھائی کے تعاون کی ضرورت پڑتی ہے، اور وہ بھی اس کے تعاون کے محتاج ہوتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کی تکلیفوں اور دکھوں میں ہاتھ بٹاتے ہیں، اس کو لطافتِ حس کی بھی ضرورت ہے اور نزاکتِ خیال کی بھی، دل کی گرمی، گرمجوشی، اور خندہ پیشانی کی بھی خوش خلقی اور خوش دلی اور بشاشت وانبساط کی بھی، اس کو پیش نظر رکھا جائے تو نظر آئے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت و تعلیم ہمدردی وغمخواری کی تمام قسموں اور اس کے باریک سے باریک اور نازک سے نازک گوشوں پر حاوی ہے، اور اس میں انسانی احساسات کی سب سے سچی اور اچھی تصویر پیش کی گئی ہے، خیر خواہی اور نیکی کے کاموں اور صدقہ کی قسموں کا ذکر کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تعدل بین الاثنین صدقة و تعین الرجل فی دابته فتحمله علیها او ترفع لهٗ علیها متاعه صدقة والکلمة الطیبة صدقة و بکل خطوة تمشیها الیٰ الصلوٰة صدقة و تمیط الاذیٰ عن الطریق صدقة
(صحیحین)

دو آدمیوں کے درمیان انصاف کرو تو یہ صدقہ ہے کسی کو سہارا دے کر سواری پر بٹھاؤ تو یہ بھی صدقہ ہے کسی کا سامان اٹھا کر اوپر رکھ دو یہ بھی صدقہ ہے اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے، نماز کی طرف ایک قدم اٹھانا بھی صدقہ ہے اور راستہ سے کوئی خراب اور تکلیف دینے والی چیز (اینٹ پتھر کانٹے وغیرہ) ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ''مصیبت زدہ حاجت مند کی مدد کرے، دریافت کیا گیا کہ اگر ایسا نہ کرسکے، فرمایا کہ اچھائی اور نیکی کا حکم دے، صحابہ کرام نے پوچھا کہ اگر یہ بھی نہ کر سکے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا برائی سے باز رہے یہ بھی صدقہ ہے۔ (صحیحین)

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ''اگر تم کسی کام کرنے والے کی مدد کرو یا کسی پھوہڑ (جس کو اس کام کا سلیقہ نہ ہو) کا کام بنا دو تو یہ بھی صدقہ ہے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر اتنا کمزور ہو کہ اس طرح کے بعض کام نہ کرسکے، ارشاد ہوا، اپنے شر سے لوگوں کو بچاؤ تو یہ تمہارے نفس پر تمہارا صدقہ ہوگا۔ (صحیحین)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ''اپنے بھائی سے مسکراتے ہوئے ملنا بھی صدقہ ہے، اچھائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے، بھٹکے ہوئے آدمی کی رہنمائی کرنا اور راستہ بتانا بھی صدقہ ہے، جسے کم نظر آتا ہو اس کو اپنی نظر سے فائدہ پہنچانا بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، کانٹا، ہڈّی ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی بھر دینا بھی صدقہ ہے۔ (صحیحین)

انسان کی فطری ہمدردی پر جس کا سوتا دل کی گہرائیوں سے ابلتا ہے، اور زندگی کی رگوں اور معاشرہ کے تمام گوشوں میں خون کی طرح جوش مارتا ہے، برآمد کی ہوئی مساوات کو (جو طاقت کے بل پر نافذ کی جاتی ہے) ترجیح دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کمیونسٹ اور سوشلسٹ ملکوں میں ایسا معاشرہ پیدا ہوگیا جو انسانی ہمدردی سے نا آشنا اور جذبۂ خیر خواہی سے محروم ہے، اس کے افراد اس طرح کے تاجر بن گئے ہیں، جو باہم دست و گریباں ہیں، نہ کوئی کسی پر بھروسہ کرتا ہے، نہ

دوسرے کی خاطر اپنے حق سے کبھی دست بردار ہوسکتا ہے، ہر شخص ایک دوسرے کے خلاف جاسوسی میں مصروف ہے، اس کے خلاف جھوٹی خبریں اور جعلی دستاویزات تیار کرتا ہے، اس کی مصیبت وابتلا پرخوش ہوتا اور اس کی ترقی وکامیابی پرغمگین ہوتا ہے، غرض کہ پورا ملک ایک ایسا میدان کارزار بن جاتا ہے، جہاں کسی کی جان محفوظ نہیں، یا کچہری وعدالت میں جہاں کسی کی آبرو کی ضمانت نہیں۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں میں احساس ذمہ داری اور اپنے فرض کے صحیح طور پر بجا آوری کا جذبہ جس میں انسانی شرافت وعظمت کا راز پوشیدہ ہے بالکل مفقود ہوگیا ہے، وہ ہر پابندی وذمہ داری اور احساس فرض سے آزاد ہوکر بالکل چھٹے ہوئے آوارہ جانوروں کے مشابہ ہوگئے ہیں جن کو سوائے چرنے، جگہ جگہ منہ مارنے اور مسلسل کھاتے رہنے کے اور کوئی کام نہیں، ہر قسم کی ذمہ داری حکومتوں اور ان کی انتظامی مشنری اور ملک کے تعزیری قوانین پر ڈال دی گئی ہے، معاشرہ کے ساتھ ایک ایسے نابالغ بچہ کی طرح معاملہ کیا جاتا ہے جو عقل وتمیز سے بالکل محروم ہے، حکومت ہی سب کچھ لیتی دیتی ہے، اور ہر شخص کی ضرورت پوری کرتی ہے، اس لئے ہمدردی اور رحم دلی، سخاوت وایثار اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون قدرتی طور پر بے معنی الفاظ بن گئے ہیں، ہر شخص کے حقوق کی ضمانت اور ضروریات زندگی کی کفالت حکومت اپنے ذمہ رکھتی ہے، اور لوگ گونگے بہرے مشینی پرزوں کی طرح اس کے اشارہ پر چلتے ہیں، اس لئے قدرتی طور پر ان میں سے کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اس کے برخلاف قدرتی، فطری اور قلب انسانی کے اندر سے ابھرنے والی

ہمدردی اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا سکون واطمینان، باطنی سعادت، باہمی اعتماد اور محبت ومودت، امن واطمینان، روح کی لذت، ضمیر کی آسودگی، انسانیت پر ناز اور زندگی کے تابناک پہلو کو دیکھنے کا ولولہ، اپنے فرض و ذمہ داری کا مکمل احساس اسلام کے اولین معاشرہ میں اپنی تمام گہرائیوں، بلندیوں اور رعنائیوں کے ساتھ موجود تھا، اور زندگی کے ہر شعبہ پر اس کی چھاپ تھی، لیکن انقلاب حال صرف اسی زمانہ تک محدود نہیں، جو انسانی معاشرہ جبری اور محدود مساوات کے مقابلہ میں اس جامع وفطری اور رضا کارانہ جذبۂ ہمدردی کو اپنا اصول اور نظامِ زندگی بنالے گا اس کے سب افراد باہم شیر وشکر اور ایک دوسرے کے خیر خواہ اور ہمدرد بن جائیں گے۔ سب ایک دوسرے کا کھلے دل سے اعتراف کریں گے، اور فراخ دلی سے اس کے حق میں شہادت دیں گے، ہر نسل اپنی گذشتہ نسل کے لئے سبقت وفضیلت کی شہادت دے گی، اور اس کے لئے قبولیت ومغفرت کی طلب گار اور دعا جو ہوگی، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے متعلق ارشاد فرماتا ہے:

والذين جآؤا من بعد هم
يقولون ربنا اغفرلنا
ولاخواننا الذين سبقونا
بالايمان ولا تجعل فی
قلوبنا غلاً للذين اٰمنوا
ربنآ انک رؤفٌ رَّحیم
(سورہ حشر -۱۰)

اوران لوگوں کا (بھی حق ہے)
جو ان کے بعد آئے (اور وہ)
یہ دعا کرتے ہیں کہ اے
ہمارے پروردگار ہم کو بخش
دے اور ہمارے بھائیوں کو بھی
جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے
ہیں اور ہمارے دلوں میں

ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ ہونے دے، اے ہمارے پروردگار تو تو بڑا شفیق ہے، بڑا مہربان ہے۔

یہ وہ اسلامی معاشرہ ہے جس کا ہر فرد اپنے بھائی کا آئینہ ہے، جو ہر تہمت اور ہر الزام اور ہر نقص اور عیب سے اس کو بری دیکھنا چاہتا ہے، اور اس کے لئے وہی پسند کرتا ہے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے:

لولآ اذ سمعتموه ظن المومنون والمؤمنات بانفسهم خيراً وقالوا هٰذا افكٌ مبين .
(سورۂ نور-۱۲)

جب تم لوگوں نے یہ (افواہ) سنی تھی تو کیوں نہ سب مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے اپنوں کے حق میں نیک گمان کیا اور (کیوں نہ) کہہ دیا کہ یہ تو صریح طوفان بندی ہے۔

معاشرہ کی اس کیفیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی بلیغ مثال سے بیان فرمایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''مسلمانوں کی مثال اپنی مودت وترحم اور شفقت میں ایک جسم واحد کی ہے اگر ایک عضو کو کوئی شکایت ہو جاتی ہے تو سارا جسم بخار اور بے خوابی کا شکار ہو جاتا ہے''۔ (صحیحین)

یہ ایک ایسا معاشرہ جس کا ہر رکن محافظ، دیانت دار، شریف اور امین اور قابلِ بھروسہ ہے، حدیث میں ہے کہ ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس کی خیانت کرتا ہے، نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے، نہ اس کو رسوا کرتا ہے اور نہ بے یار و مددگار چھوڑتا ہے، مسلمان کی عزت، مال اور خون دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ (ترمذی)

اس کے برعکس بہت سے ملکوں میں زندگی عذاب جان اور جہنم کا نمونہ بن گئی ہے:

كلما دخلت امةٌ لعنت اختها
(سورہ اعراف-۳۸)

جس وقت بھی کوئی (نئی) جماعت دوزخ میں) داخل ہوگی اس کی ہم رنگ دوسری جماعت اس پر لعنت کرے گی

چنانچہ جب کوئی ڈکٹیٹر آتا ہے تو اپنے پیشرو کو لعنت کرتا اور اس پر غدّاری، ملک دشمنی اور خیانت کا الزام لگانا اپنا فرض سمجھتا ہے، جس کو ایک دن کے لئے بھی اقتدار مل جاتا ہے، وہ اپنے دشمنوں، رقیبوں اور مخالفوں سے سخت سے سخت انتقام لینا چاہتا ہے، اور اسکے لئے ہر قسم کی سفاکی، ظلم وتشدد اور خوں ریزی جائز سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

و اذا تولىٰ سعىٰ فى الارض ليفسد فيها ويهلك الحرث والنسل ، والله لا يحب الفساد .
(سورۂ بقرہ -۲۰۵)

اور جب پیٹھ پھیر جاتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں رہتا ہے کہ زمین پر فساد کرے، اور کھیتی اور جانوروں کو تلف کرے درانحالیکہ اللہ فساد کو (بالکل) پسند نہیں کرتا۔

اب اگر کسی کو یہی پر مشقت اور طویل راستہ اور تلخ و ناکام تجربہ پسند ہے تو اس کے لئے قرآن مجید کا یہ ارشاد کافی ہے:

اتستبدلون الذی ھو ادنیٰ بالذی ھو خیر، اھبطوا مصراً فانَّ لکم ما سألتم
(سورۂ بقرہ -۶۱)

تو کیا جو چیز ادنیٰ ہے تم اسے لینا چاہتے ہو اس چیز کے مقابلہ میں جو بہتر ہے (تو خیر) کسی شہر میں اتر پڑو (وہیں) مل جائے گا جو کچھ تم مانگتے ہو۔

☆......**ف** : ماشاء اللہ کیا خوب باتیں فرمائیں جو مولانا کے علم ومعرفت اور قلب ونظر کی وسعت پر دال ہیں اللہ ہم سب کو اس سے حصہ وافر سے نوازے۔ آمین

فجزاھم اللہ خیر الجزا.

روزہ

یا ایھا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون
(سورۂ بقرہ-۱۸۳)

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل ہوئے ہیں، عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ۔

نہ حیوان نہ فرشتے:

انسان، حیوانات اور فرشتوں کی درمیانی مخلوق ہے، اس میں ان دونوں متضاد جنسوں کے طبائع بہت لطیف اور نازک طریقہ پر ودیعت کئے گئے ہیں، وہ ملکوتی صفات اور حیوانی خصوصیات کا عجیب وغریب مجموعہ ہے، جس منصب کے لئے وہ نامزد کیا گیا ہے، اور جن مقاصد کی تکمیل خدا کی طرف سے اس کے سپرد کی گئی ہے، اور اس میں اس کی استعداد اور صلاحیت بھی پیدا کی گئی ہے، اس کے لئے نہ فرشتے موزوں ہیں نہ جانور، یہ خلافت امانت اور عبادت کا منصبِ جلیل ہے جس کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

و اذقال ربک للملٰئکة انی جاعلٌ فی الارض خلیفةً قالوۡٓا اتجعل فیھا

اور (وہ وقت یاد کرو) جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں زمین پر اپنا نائب

مَنْ يُفْسِدُ فيها وَيَسْفِكُ الدِّمآء ، ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك قال انّی اعلم مالاتعلمون
(سورۂ بقرہ-۳۰)

بنانا چاہتا ہوں وہ بولے کیا تو اسمیں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا، درانحالیکہ ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، اور تیری پاکی پکارتے رہتے ہیں؟ (اللہ نے) فرمایا یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

دوسری جگہ آتا ہے:

انا عرضنا الامانة علی السمٰوٰت والارض والجبال فابين ان يحملنها و اشفقن منها و حملها الانسان ، انهٗ كان ظلوماً جهولاً .
(سورۂ احزاب-۷۲)

ہم نے (یہ) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی، سو ان سب نے انکار کیا اس سے کہ اسے اٹھائیں اور وہ اس سے ڈرے، اور اسے انسان نے اپنے ذمہ لے لیا بیشک وہ بڑا ظالم ہے، بڑا جاہل ہے،

وما خلقت الجن والانس الاليعبدون مآاُريد منهم من رزقٍ ومآ اُريد ان يطعمون.
(سورہ ذاریات-۵۶-۵۷)

اور میں نے جنات اور انسان کو پیدا ہی اسی غرض سے کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں، میں ان سے نہ روزی چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کھلایا کریں۔

خلافت کے تقاضے اور اس کے لوازمات:

منصب خلافت نہ صرف اسی ہستی سے جس کی خلافت کا فرض اس کے سپرد کیا جارہا ہے بہت مناسبت چاہتا ہے بلکہ اس جگہ سے بھی اس کو مناسبت ہونی چاہئے جہاں رہ کر اس کو یہ فرض انجام دینا ہے، اس مخلوق سے بھی اس کو پوری مناسبت ہونی چاہئے جن کی ذمہ داری اور نگرانی اور حکومت وتولیت اس کے ذمہ ہے، چنانچہ پہلی چیز سے اس نے اس اخلاق کا پرتو اور ان صفات عالیہ کا عکس قبول کیا جن کو ہم پاکی اور بلندی، بے نیازی اور استغنا، رحم وکرم، ہمدردی وشفقت، صبر وحلم، قوت وقہر، صفائی وپاکیزگی اور امن وسلامتی سے تعبیر کر سکتے ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ اپنی طویل تاریخ کے ہر دور میں اس نے ان اخلاق فاضلہ میں ہمیشہ بڑی لذت اور عزت محسوس کی، اور ان کے حاملین کو عزت کی نگاہ سے دیکھا اور اگر کبھی اس کی ہمت اس سے قاصر رہی اور وہ خود ان صفات سے آراستہ نہ ہوسکا تو اس نے دوسروں کو (جو ان صفات کے حامل تھے) عظمت ومحبت کے ساتھ اپنے سر پر بٹھایا اور ان کو خوش نصیب اور کامیاب وبامراد سمجھا۔

دوسری چیز سے بھی اس نے اسکے خواص وطبائع اخذ کئے، اور اس کے کمزور پہلوؤں میں شرکت محض اس لئے گوارا کی کہ وہ اپنے دکھ درد میں اس کو شریک سمجھ سکے، زمین کے خزانوں دفینوں اور سرچشموں اور دنیا کی نعمتوں اور پاک چیزوں سے فائدہ اٹھا سکے، اور ان کو صحیح محل میں صرف کر سکے، مثال کے طور پر کھانے پینے کی خواہش، جنسی جذبہ، بھوک پیاس، راحت طلبی، جدّت پسندی، صنعت وحرفت

اور ماکولات ومشروبات میں وسعت وتنوع اس کی سرشت میں داخل ہے۔

روح وجسم کی باہمی کشمکش اوران کے متضاد میلانات:

اس لحاظ سے وہ روح اور جسم دونوں کا مجموعہ ہے، روح اس کو اپنے اصل منبع اور سرچشمہ کی طرف کھینچتی ہے، اس کو اس کا منصب، مرکز، مقصد اور فریضہ یاد دلاتی ہے، اس کے سامنے وہ روزن کھولتی ہے، جس سے وہ اس نئے عالم کی وسعت وبلندی اور لطافت وجمال کا مشاہدہ کرسکے، وہ اس کے دل میں اس کا شوق پیدا کرتی ہے اوراس کا حوصلہ بڑھاتی ہے، کثیف اورثقیل مادیت کے خلاف بغاوت پراوراس قفسِ زرّیں سے رہائی پراکساتی ہے، اوران لامحدود وسعتوں میں پرواز پرآمادہ کرتی ہے جو مادیت کی ان پستیوں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتیں، وہ انسان کواس بات کی دعوت دیتی ہے کہ وہ کبھی کبھی (خواہ سال میں ایک ہی مرتبہ ہو) خوردونوش اور عادت وحاجت کے اس بندھے ٹکے نظام سے آزاد ہوکرزندگی کے چند لمحے گزارے، اسباب رزق کی فراوانی کے باوجود بھوک اور پیاس کا مزہ چکھے اوراس میں وہ لذت محسوس کرے جوانواع واقسام کے لذیذ ترین کھانوں میں بھی محسوس نہیں ہوتی، وہ اس مختصر وقفہ کو جوفراغ خاطر، سکون قلب، صفاء نفس، معدہ کی سبکساری ولطافت، روح کی بالیدگی، خواہشات نفسانی سے آزادی، اور زندگی کے خشک، فرسودہ، یکساں اور بے رنگ نظام سے تھوڑے عرصہ کیلئے علیحدگی میں گزارتا ہے، زندگی کی اصل قیمت اورنفس کی تازگی، سبک روحی، اور مسرت وانبساط کا بہترین وقت قرار دیتی ہے، اوراس کیلئے اس طرح بے قرار رہتی ہے

جس طرح کوئی پرندہ دن بھر کے سفر کے بعد شام کواپنے آشیانہ کے لئے بے قرار ہوتا ہے یا مچھلی پانی کے لئے، یہ سب اسی روح کا کرشمہ ہے جو عالم غیب اور عالم قدس سے اس کی طرف منتقل ہوئی ہے۔

ویسئلونک عن الروح قل الروح من امرربی (سورۂ بنی اسرائیل ۸۵)	اورآپ سے یہ روح کی بابت پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے (ہی) ہے۔
ونفخت فیه من روحی (سورۂ حجر ۲۹)	اوراس میں اپنی طرف سے روح پھونک دی۔

دوسری طرف جسم بھی اس کواپنے اصل مرکز کی طرف کھینچتا ہے، یہ مرکز زمین ہے، جواپنے ساتھ ہر قسم کی کثافت اورپستی رکھتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولقد خلقناالانسان من صلصال من حمأٍ مسنون (سورۂ حجر۔۲۶)	اور بالیقین ہم نے انسان کو لس دارگارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

فاستفتهم أهم اَشدُّ خَلقاً ام مَّن خلقنا. اناخلقنٰهم من طين لازب (سورۂ صافات۔۱۱)	تو آپ ان سے پوچھئے کہ خلقت میں یہ لوگ زیادہ مضبوط ہیں یا وہ جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے، ہم نے ان لوگوں کوتو چپکتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا ہے۔

ایک اور جگہ آیا ہے:

خلق الانسان من صلصال کالفخار (سورۂ رحمٰن۔۱۴)	اسی نے انسان کو پیدا کیا (ایسی) مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح بجتی تھی۔

جب روح کی گرفت انسان پر کمزور پڑ جاتی ہے، اور اس کے اثرات کم ہونے لگتے ہیں یا زائل ہوجاتے ہیں، اور زمام اقتدار جسم کے ہاتھ میں آجاتی ہے تو پھر انسان خواہشِ نفس اور لذت پسندی کے دھارے میں بالکل بے قابو ہوکر بہنے لگتا ہے، وہ آوارہ مویشیوں کی طرح ہر جگہ منھ مارتا ہے، اس کو کھانے پینے اور خواہشاتِ نفس پورا کرنے کا جنون ہوجاتا ہے، وہ اس میں بڑے تکلف، اختراع اور باریک بینی سے کام لیتا ہے، اور اپنی ذہانت سے اس میں ایسے نئے راستے پیدا کرتا ہے، جو عقل ودستور، طب وصحت اور قانون وشریعت کی تمام حدود کو توڑ دیتے ہیں، اس کی تمام تر صلاحیت وذہانت کھانوں کو زیادہ سے زیادہ لذیذ، پرتکلف، اور متنوع بنانے میں صرف ہونے لگتی ہے، وہ ہاضم دواؤں اور بھوک کھولنے والے مشروبات ایجاد کرتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ کھانے اور جلد سے جلد ہضم کرنے کا موقع مل سکے، اور یہ سلسلہ بلاکسی وقفہ کے برابر جاری رہے، اس کا نتیجہ یہ ہے وہ اپنی ترقی ودانائی کے باوجود اور علم اور مادّی خوشحالی کی اس بلند ترین سطح پر ہوتے ہوئے بھی کولھو کے بیل اور زمین جوتنے والے جانور کی طرح ہوجاتا ہے، اور اس کا دائرۂ عمل صرف دو چیزوں کے درمیان محدود رہتا ہے، کھانے کے کمرے (ڈائننگ ہال) اور بیت الخلاء وہ ان دونوں کے سوا کسی اور مبدأ ومعاد سے ناواقف، اور اس ''طواف'' کے سوا کسی اور طواف وسعی سے ناآشنا رہتا ہے، کھانے پینے کی خواہش

کے سوا اس میں ہر چیز کی خواہش مرجاتی ہے، اور آرام طلبی اور عیش پرستی کی حس کے سوا ہر حس کند ہوجاتی ہے، اس کی تمام فکریں صرف ایک فکر میں ڈھل جاتی ہیں، وہ صرف اس لئے کماتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ کھا سکے، اور اس لئے کھاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ کما سکے، قرآن مجید نے انسانوں کے اس طبقہ یا ''انسان نما'' جانوروں کے اس ریوڑ کی جو معجزانہ تصویر کھینچی ہے اس سے سچی اور نازک تصویر نہیں ہوسکتی، وہ کہتا ہے:

والذین کفروا یتمتعون ویاکلون کما تاکل الانعام والنار مثوی لھم (سورۂ محمد۔۱۲)	اور جو کافر ہیں وہ عیش کر رہے ہیں اور کھاپی رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے (پیتے) ہیں، آگ ہی ان کا ٹھکانا ہے۔

دراصل یہ جسم کا مزاج اور خاصیت ہے، جو روحانیت اور نبوت کی روشنی سے محروم، ہوائے نفس کا پرستار اور اپنے مرکز اصل کی طرف مائل ہے، اور خود بخود پستی کی طرف بڑھتا اور زمین پر گرتا ہے۔

واتل علیھم نبا الذی اٰتینه اٰیٰتنا فانسلخ منھا فاتبعه الشیطان فکان من الغٰوین ۔ولو شئنا لرفعنٰه بھا ولکنه اخلد الی	اور ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنایئے جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی ہے تھیں، پھر وہ ان سے بالکل نکل گیا سو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا،

الارض واتبع ھوٰہ فمثلہ کمثل الکلب ان تحمل علیہ یلھث اوتترکہ یلھث . ذٰلک مثل القوم الذین کذبوابایتنا فاقصص القصص لعلھم یتفکرون.

(سورۂ اعراف۔۱۷۵۔۱۷۶)

اوروہ گمراہوں میں داخل ہوگیا اوراگرہم چاہتے توہم اس کامرتبہ ان(اپنی نشانیوں) کے ذریعہ سے اونچا کردیتے لیکن وہ زمین کی طرف مائل ہوگیااوراپنی خواہش نفسانی کی پیروی کرنے لگا،سواس کی مثال کتے کی سی ہوگئی کہ اگر تواس پرحملہ کرے(جب بھی) ہانپے،اسے چھوڑے رہے (جب بھی) ہانپے،یہ مثال ہے ان (سب) لوگوں کی جنھوں نے جھٹلایاہماری نشانیوں کو،سوآپ بیان کیجئے(یہ) حالات شاید کہ لوگ سوچیں۔

انسانی زندگی اور مذاہب واخلاق کی تاریخ میں اس کشمکش کے اثرات:

انسان کی مذہبی اوراخلاقی تاریخ دراصل اسی کشمکش کی کہانی ہے،چنانچہ جب کبھی اس کی پہلی طبیعت غالب آئی اور اس کواقتدارحاصل ہواتواس نے رہبانیت کی داغ بیل ڈالی،اورزندگی میں مبالغہ کی حدتک تقشّف،مباحات وطیبات سے انکار،اورنفس پرظلم کاراستہ اختیارکیا،اورجسم کواذیت پہنچانے اورنفس

کوفقروفاقہ میں مبتلاکرنے کوعین سعادت قراردیا،اس نے رات رات بھرجاگنا شروع کیااورآبادیوں کوچھوڑکرجنگلوں کی راہ لی،قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں عیسائی راہبوں کےواقعات جوسب کومعلوم ہیں،دراصل اسی جذبہ کےآئینہ دار ہیں۔

ورھبانیۃن ابتدعوھا ماکتبنھا علیھم الاابتغاء رضوان اللہ فمارعوھا حق رعایتھا.

(سورۂ حدید۔۲۷)

اوررہبانیت کوانھوں نے خود ایجادکرلیاہم نے ان پرواجب نہیں کیاتھا،انھیں نے اللہ کی رضامندی کی خاطر(اسےاختیار کرلیاتھا) سوانھوں نے اس کی رعایت پوری پوری نہ کی۔

اس کانتیجہ یہ ہواکہ انسان کاجسم اورعقل دونوں کمزورہوگئے،خاندانوں کا شیرازہ منتشرہوگیااورانسانی سوسائٹی سخت خطرہ سے دوچار ہوگئی،انسان اس منصبِ خلافت سے کنارہ کش ہوگیاجس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اس پرڈالی تھی،اس نے جدّ وجہداورذمہ داری کے میدان کوچھوڑکرفرشتوں کواپنا آئیڈیل بنالیااوران کامحسوداورمسجود بننے کے بجائےخودان پررشک وحسدکرنے لگا۔

کبھی اس میں حیوانی صفات اورارضی وجسمانی رجحانات کاایساغلبہ ہواکہ وہ عقل وشریعت کی ہربندش اوراخلاق وروحانیت کی ہرگرفت اور بالادستی سے آزادہوکرمادّہ اورمعدہ کے تیزدھارے میں بہنے لگااوراپنی جسمانی ونفسانی خواہشات اورمادی تقاضوں کی تسکین اورتکمیل کے لئے ہرکام کرنے پرتیارہوگیا، اوراس کے لئے اس نے کسی حد،مقداراورنصاب کی رعایت بھی ملحوظ نہ رکھی،اس کا

نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے روح اور دل کی انگیٹھیاں بالکل سرد ہوگئیں، عقل اور ضمیر سکڑتے گئے، اور معدہ نے اتنا طول وعرض اختیار کرلیا کہ بعض وقت پورے پورے خاندان کی غذا اور خوراک ایک انسان کی ہوس ''نائے ونوش'' کے لئے ناکافی ثابت ہونے لگی، اس کے جسم میں ایک ایسا مصنوعی اور خیالی معدہ اور ایک ایسی جوع البقر پیدا ہوگئی جو کھانے کی بڑی سے بڑی مقدار اور غلہ کے وافرا ذخیروں سے بھی نہ بجھتی تھی، اس کے نتیجہ میں قدرتی طور پر ایسے مظالم اور جرائم وجود میں آئے جنھوں نے انسان کو ایک بے رحم اور پھاڑ کھانے والا درندہ بنا دیا، جو نہ صرف بنی نوع انسان بلکہ خود اپنے خاندان کے افراد کو پھاڑ کھاتا اور نگل لیتا ہے تاریخ کی یہ ساری جنگیں اور مہم جوئیاں (جہاد کو مستثنیٰ کر کے جو خالص دینی مقاصد کے لئے کیا جاتا ہے) دراصل اسی شخصی انانیت، یا جماعتی عصبیت، حرص وطمع، توسیع پسندانہ جذبات، اقتدار کی ہوس اور طاقت کے جنون کا مظہر ہیں۔

معدہ کی پرستش اور اس کے مہلک اثرات:

جب یہ حیوانی جبلّت انسان پر غالب آتی ہے۔ اور زندگی کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے، اور انسان کے احساسات وجذبات اور اعصاب اس کی مکمل گرفت میں آجاتی ہیں، اور سارا انسانی نظام ''معدہ'' کے گرد گردش کرنے لگتا ہے، تو پھر انسان اور اس کی خواہشات کی تکمیل کے راستہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی، اس کے نفس پر ہر وہ چیز گراں اور شاق ہوتی ہے، جو اس کی خواہش کی راہ میں مزاحم ہو یا اس کو اس کا انجام یاد دلائے، حساب وکتاب اور جزا وسزا کی

تلقین کرے، بعض اوقات اس کی پوری پوری عمر گزر جاتی ہے، اور پرسکون دل، بیدار دماغ، اور زندہ ضمیر کا کوئی لمحہ اس کو نصیب نہیں ہوتا، عبادت اور ذکر الٰہی سے اس کی طبیعت پر گرانی اور بوجھ محسوس ہوتا ہے، اور اس کو اس میں یا اس طرح کی چیزوں میں قدرتی طور پر کوئی لذت معلوم نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وانہا لکبیرۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِین الّذین یَظُنُّوْنَ انَّھُمْ مُلٰقوا ربھم وانھم الیہ راجعون.

(سورۂ بقرہ۔۴۵۔۴۶)

اور وہ بیشک گراں ہے، مگر خشوع رکھنے والوں پر (نہیں) جنھیں اس کا خیال رہتا ہے کہ انھیں اپنے پروردگار سے ملنا (بھی) ہے اور اس کا کہ انھیں اس کی طرف واپس ہونا ہے۔

واذا قاموا الی الصلوۃ قاموا کسالیٰ یرآؤن الناس ولا یذکرون اللّٰہ الاقلیلا.

(سورۂ نساء۔۱۴۲)

اور یہ لوگ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں (صرف) لوگوں کو دکھاتے ہیں، اور اللہ کی یاد کچھ یوں ہی سی کرتے ہیں۔

انسان کے مقصد زندگی کی تکمیل اور اعلی اخلاقی قدروں کی تشکیل کیلئے نبوت کی چارہ سازی:

نبوت نے تاریخ انسانی کے مختلف وقفوں اور کرۂ ارض کے مختلف حصوں

میں اس انسانیت کی چارہ سازی کی، جو انتہا پسندانہ مادّیت اور حیوانی بغاوت کی زد میں آکر ہلاکت سے قریب ہو چکی تھی، اس نے اخلاق وروحانیت کی لطیف احساسات اور نفس کے مارے اور مادیت کے کچلے ہوئے مفلوج اور نیم جاں دل کو معدہ کی قساوت اور خواہشات کی آلودگی سے پاک وصاف کیا، اور اس کو اس مقصد زندگی کی تکمیل کے لئے نئے سرے سے تیار کیا، جس کو ''عبادت'' کہا جاتا ہے، اس کو اس کمال انسانی سے آراستہ کیا جس کو ''ولایت'' کہا گیا ہے، اور اس منصب اور اس مشن کی تکمیل کے قابل بنایا جس کی خاطر اس کو دنیا میں اتارا گیا ہے، اور جس کو ''خلافت'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ وہ کام ہے جو نہ تنہا فرشتوں والی روحانیت سے انجام پا سکتا تھا نہ بہائم والی مادیت سے، اس کے لئے ہر سال ایسے روزہ کا انتظام کیا گیا جو معدہ پرستانہ مادیت میں کسی قدر تخفیف کر سکے، زندگی کے کھوئے ہوئے نشاط، تازگی اور قوت کو دوبارہ واپس لا سکے، اور اسکے اندر ایمان اور روحانیت کی اتنی مقدار داخل کر سکے جس کے ذریعہ زندگی کے اعتدال اور توازن کو برقرار رکھنا ممکن ہو، نفس کی ترغیبات کا مقابلہ اور پرخوری کے مفاسد کا سد باب ہو سکے، انسان کچھ وقفہ کے لئے اپنے اندر اخلاق الٰہی کا کسی قدر عکس اتار سکے اور اس میں سے کچھ حصہ پا کر سرفراز و سرخرو ہو سکے، ملائکہ اور ملاء اعلیٰ سے اس کو نسبت حاصل ہو، روح اور قلب کی پرفضا وسعتیں اور آسمان وزمین کی سلطنتیں اس کی جولان گاہ ہوں اور اس کو وہ نئی لذت حاصل ہو جو انواع واقسام کے کھانوں یا ہر وقت کھاتے رہنے اور آخری حد تک پیٹ بھر لینے کی لذت سے بہت بلند، لطیف، حقیقی اور دائمی ہے۔

روزہ کے مقاصد اور زندگی پر اس کے اثرات:

امام غزالیؒ نے اپنے مخصوص انداز بیان میں اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اخلاق الٰہیہ میں سے ایک اخلاق کا پرتو اپنے اندر پیدا کرے جس کو ''صمدیت'' کہتے ہیں، وہ امکانی حد تک فرشتوں کی تقلید کرتے ہوئے خواہشات سے دست کش ہو جائے، اسلئے کہ فرشتے بھی خواہشات سے پاک ہیں، اور انسان کا مرتبہ بھی بہائم سے بلند ہے، نیز خواہشات کے مقابلہ کیلئے اس کو عقل وتمیز کی روشنی عطا کی گئی ہے، البتہ وہ فرشتوں سے اس لحاظ سے کم تر ہے کہ خواہشات اکثر اس پر غلبہ پا لیتی ہے، اور اس کو ان سے آزاد ہونے کیلئے سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، چنانچہ جب وہ اپنی خواہشات کی رو میں بہنے لگتا ہے تو اسفل سافلین تک جا پہنچتا ہے، اور جانوروں کے ریوڑ سے جا ملتا ہے اور جب اپنی خواہشات پر غالب آتا ہے تو اعلیٰ علّیین اور فرشتوں کے آفاق تک پہنچ جاتا ہے۔

''علامہ ابن القیمؒ اسی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''روزہ سے مقصود یہ ہے کہ نفس انسانی خواہشات اور عادتوں کے شکنجہ سے آزاد ہو سکے، اس کی شہوانی قوتوں میں اعتدال اور توازن پیدا ہو اور اس کے ذریعہ سے وہ سعادت ابدی کے گوہر مقصود تک رسائی حاصل کر سکے اور حیات ابدی کے حصول کیلئے اپنے نفس کا تزکیہ کر سکے، بھوک اور پیاس سے اس کی ہوس کی تیزی اور شہوت کی حدّت میں تخفیف پیدا ہو اور یہ بات یاد آئے کہ کتنے مسکین ہیں جو

نان شبینہ کے محتاج ہیں، وہ شیطان کے راستوں کو اس پر تنگ کردے، اور اعضاء وجوارح کو ان چیزوں کی طرف مائل ہونے سے روک دے جس میں اس کی دنیا وآخرت دونوں کا نقصان ہے، اس لحاظ سے یہ اہل تقویٰ کی لگام، مجاہدین کی ڈھال، اور ابرار ومقربین کی ریاضت ہے۔

علامہ موصوف روزہ کے اسرار ومقاصد پر نہایت بلاغت کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

’’روزہ جوارح ظاہری اور قوائے باطنی کی حفاظت میں بڑی تاثیر رکھتا ہے، فاسد مادّہ کے جمع ہوجانے سے انسان میں جو خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں، اس سے وہ اس کی حفاظت کرتا ہے، جو چیزیں مانع صحت ہیں ان کو خارج کردیتا ہے، اور اعضاوجوارح میں جو خرابیاں ہوا وہوس کے نتیجہ میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں، وہ اس سے دفع ہوتی ہیں، وہ صحت کے لئے مفید اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرنے میں بہت ممد ومعاون ہے۔

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:

یاایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون. (سورۂ بقرہ۔۱۸۳)	اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل ہوئے ہیں عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الصوم جنة. روزہ ڈھال ہے۔

چنانچہ ایسے شخص کو جو نکاح کا خواہشمند ہو اور استطاعت نہ رکھتا ہو روزہ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے، اور اس کو اس کا تریاق قرار دیا گیا ہے، مقصود یہ ہے کہ روزہ کے مصالح اور فوائد چونکہ عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کی رو سے مسلّم تھے، اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی حفاظت کی خاطر محض اپنی رحمت اور احسان سے مزین کیا ہے۔

اسی سلسلۂ کلام میں آگے ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’چونکہ قلب کی اصلاح اور استقامتِ حال، سلوک الی اللہ اور جمعیت باطنی پر منحصر ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف بالکلیہ توجہ وانابت پر اس کا دارومدار ہے، اسلئے پراگندہ خاطری اس کے حق میں سخت مضر ہے، کھانے پینے کی زائد مقدار لوگوں سے زیادہ میل جول، ضرورت سے زیادہ گفتگو وہ چیزیں ہیں جن سے جمعیت باطنی میں فرق آتا ہے، اور انسان اللہ تعالیٰ سے منقطع ہوکر مختلف راستوں پر بھٹکنے لگتا ہے، بعض وقت محض اسی وجہ سے اس کی راہ کھوٹی ہوتی ہے، ان سب باتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کی مقتضی تھی کہ اپنے بندوں پر روزہ فرض کرے اور اس کے ذریعے کھانوں کی زائد مقدار اور خواہشات کے فضلہ کا ازالہ وتنقیہ ہوسکے جس کی وجہ سے آدمی وصول الی اللہ سے محروم رہتا ہے، وہ اس سے دنیا وآخرت دونوں جگہ فائدہ اٹھا سکے، اور اس کی عارضی اور مستقل کسی مصلحت کو نقصان نہ پہنچے۔‘‘

روزہ کی خصوصیات اور اس کے فضائل واحکام:

اسلام نے روزہ کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ قوانین ومقاصد دونوں کے لحاظ

سے مکمل ہے، فائدہ کا سب سے زیادہ ضامن ہے۔ اوراس میں عزیز وعلیم اور حکیم وخبیر خدا کی حکمت ومشیت پوری طرح جلوہ فگن ہے۔

الا یعلم من خلق	کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے
وھو اللطیف الخبیر.	پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی)
(سورۂ ملک۔۱۴)	باریک بیں اور (پورا) باخبر ہے۔

اس نے پورا مہینہ (اور یہ رمضان کا وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا) مسلسل مہینہ بھر کے روزوں کیلئے مخصوص کیا ہے، جس کے دنوں میں روزہ رکھنے کا حکم ہے، اور راتوں کو کھانے پینے کی اجازت ہے، اس وقت عربوں میں روزہ کا مفہوم یہی تھا، اور اسلام کی عالمی شریعت میں بھی اسی کا اعتبار اور اسی پر عمل ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

''(روزہ میں) دن کا دائرہ طلوع صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک ہے، اس لئے کہ عربوں کا حساب اور ان کے دن کی مقدار اسی بنیاد پر ہے، اور عاشوراء کے روزہ میں ان کے یہاں یہی بات معروف ومسلم تھی، مہینہ کا آغاز رویت ہلال سے ہے، اور رویت ہلال تک ہے، اس لئے کہ عربوں کا حساب شمسی مہینوں پر نہیں چلتا۔

رمضان کو روزہ کے ساتھ مخصوص کیوں کیا گیا؟

اللہ تعالیٰ نے روزے رمضان میں فرض کئے ہیں، اور دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم قرار دیا ہے، اور حقیقت یہ ہے ان دو برکتوں اور

سعادتوں کا اجتماع بڑی حکمت اور اہمیت کا حامل ہے، اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ رمضان ہی وہ مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا اور گم کردہ راہِ انسانیت کو ''صبح صادق'' نصیب ہوئی، اس لئے یہ عین مناسب تھا کہ جس طرح طلوع صبح صادق روزہ کے آغاز کے ساتھ مربوط کردی گئی ہے، اسی طرح اس مہینہ کو بھی جس میں ایک طویل اور تاریک رات کے بعد پوری انسانیت کی صبح ہوئی پورے مہینہ کے روزے کے ساتھ مخصوص کردیا جائے، خاص طور پر اس وقت جب کہ اپنی رحمت وبرکت، روحانیت اور نسبت باطنی کے لحاظ سے بھی یہ مہینہ تمام مہینوں سے افضل تھا اور بجا طور پر اس کا مستحق تھا کہ اس کے دنوں کو روزے سے اور راتوں کو عبادت سے آراستہ کیا جائے۔

روزہ اور قرآن کے درمیان بہت گہرا تعلق اور خصوصی مناسبت ہے، اور اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں تلاوت کا زیادہ سے زیادہ اہتمام فرماتے تھے۔ ابن عباس راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ سخی تھے، لیکن رمضان میں جب جبرئیلؑ آپؐ سے ملنے آتے اس زمانہ میں سخاوت کا معمول اور بڑھ جاتا، جبرئیل رمضان کی ہر رات میں آپ کے پاس آتے اور قرآن مجید کا دور کرتے، اس وقت جب جبرئیل آپ سے ملتے آپ سخاوت، دادودہش اور نیکی کے کاموں میں تیز ہوا سے بھی تیز نظر آتے''

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

اس مہینہ کو قرآن مجید کے ساتھ بہت خاص مناسبت ہے، اور اسی مناسبت کی وجہ سے قرآن مجید اسی مہینہ میں نازل کیا گیا، یہ مہینہ ہر قسم کی خیر وبرکت کا جامع

ہے، آدمی کو سال بھر میں مجموعی طور پر جتنی برکتیں حاصل ہوتی ہیں وہ اس مہینہ کے سامنے اس طرح ہیں جس طرح سمندر کے مقابلہ میں ایک قطرہ، اور اس مہینہ میں جمعیت باطنی کا حصول، پورے سال جمعیت باطنی کیلئے کافی ہوتا ہے، اور اس میں انتشار اور پریشان خاطری بقیہ تمام دنوں بلکہ پورے سال کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے، قابل مبارک باد ہیں وہ لوگ جن سے یہ مہینہ راضی ہو کر گیا اور ناکام و بدنصیب ہیں وہ جو اس کو ناراض کر کے ہر قسم کے خیر و برکت سے محروم ہو گئے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ’’جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، اور شیاطین کو پابہ زنجیر کر دیا جاتا ہے‘‘

اس سلسلہ کی احادیث بکثرت وارد ہوئی ہیں۔

عبادات کا عالمی موسم اور اعمال صالحہ کا جشن عام:

ان تمام چیزوں نے رمضان کو عبادت، ذکر، تلاوت، اور زہد و تقویٰ کا ایک ایسا عالمی موسم اور جشن عام کا زمانہ بنا دیا ہے جس میں مشرق و مغرب کے تمام مسلمان، عالم و جاہل، امیر و فقیر کم ہمت اور عالی حوصلہ ہر قسم اور ہر گروہ کے لوگ ایک دوسرے کے شریک و رفیق اور ہمدم و دمساز نظر آتے ہیں، یہ رمضان ایک ہی وقت میں ہر شہر ہر گاؤں اور ہر دیہات میں ہوتا ہے، امیر کے محل اور غریب کی جھونپڑی دونوں میں اس کا جلوہ نظر آتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ کوئی شخص خودسری

اور خودرائی کرتا ہے، نہ روزے کے لئے دونوں کے انتخاب میں کوئی انتشار اور جھگڑا پیدا ہوتا ہے، ہر وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے دو آنکھیں عطا کی ہیں، عالم اسلام کے وسیع و عریض رقبہ میں ہر جگہ اس کے جلال و جمال کا مشاہدہ خود کر سکتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورے اسلامی معاشرہ پر نورانیت اور سکینت کا ایک وسیع شامیانہ سایہ فگن ہے، جو لوگ روزہ کے معاملہ میں ذرا سست اور کاہل ہیں وہ بھی عامۃ المسلمین سے علیحدگی کے ڈر سے روزہ رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور اگر کسی وجہ سے روزہ نہیں رکھتے تو چھپ کر اور شرم کے ساتھ کھاتے ہیں سوائے ان چند ملحد اور فساق کے جن کو علانیہ بھی اس بے شرمی میں کوئی عار نہیں ہوتا، یا ان بیماروں اور مسافروں کے جو شرعاً معذور ہیں یہ ایک اجتماعی اور عالمی روزہ ہے، جس سے خود بخود ایک ایسی سازگار اور خوشگوار فضا پیدا ہوتی ہے جس میں روزہ آسان معلوم ہوتا ہے دل نرم پڑ جاتے ہیں اور لوگ عبادتوں اور طاعتوں اور ہمدردی و غمخواری کے مختلف کاموں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

حج

واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالًا وعلٰی کلِّ ضامرٍ یاتین من کل فجٍّ عمیق. لیشهدوا منافع لهم ویذکروا اسمَ اللّٰهِ فی ایَّام معلومٰت علی مارزقهم من بهیمة الانعام فکلوا منها واطعموا البائس الفقیر . ثم لیقضوا تَفَثَهُمْ وَلْیُوْفوا نُذُوْرَهم ولیطوفوا بالبیت العتیق.

(سورۂ حج۔۲۷۔۲۸۔۲۹)

اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی تا کہ اپنے فوائد کیلئے آموجود ہوں اور تا کہ ایام معلوم میں اللہ کا نام لیں ان چوپایوں پر جو اللہ نے ان کو عطا کئے ہیں پس تم بھی اس میں سے کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ، پھر لوگوں کو چاہئے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنے واجبات کو پورا کریں اور چاہئے کہ (اس) قدیم گھر کا طواف کریں۔

اسلام توحید کا دین ہے اس میں وساطت ووکالت کی ضرورت نہیں:

اسلام توحید خالص کا دین ہے، وہ خدا اور بندہ کے درمیان کسی وساطت اور ''ایجنسی'' کا قائل نہیں، وہ کسی ایسی محسوس اور مادّی چیز کا روادار نہیں جس کو انسان اپنے فکروخیال میں معبود کی طرح بسا کر اپنی ساری توجہ اور ہمت وقوت اس پر مرکوز کردے اور اس کے دامن سے وابستہ ہوجائے، اس میں نہ تو واسطوں کی گنجائش ہے، نہ مظاہر کی، نہ تصویروں کی نہ بتوں کی نہ یہاں پادری اور پروہت کے قسم کا کوئی طبقہ پایا جاتا ہے، نہ کاہنوں اور مجاوروں کے طرز کی کوئی جماعت، اللہ تعالیٰ کا صاف ارشاد ہے:

واذا سألک عبادی عنی فانی قریب. اجیب دعوة الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی وَلِیُؤمِنوا بی لعلَّهُم یَرشُدون ہ

(سورۂ بقرہ۔۱۸۶)

اور جب آپ سے میرے بندے میرے باب میں دریافت کریں تو میں تو قریب ہی ہوں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے پس (لوگوں کو) چاہئے کہ میرے احکام قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں عجب نہیں کہ ہدایت پا جائیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

فاعبد اللہ مخلصاً له الدِّین الا لِلّٰہ الدین الخالص وَالَّذین اتخذوا من دونہٖ اولیآء مانعبدھم اِلّالِیُقَرِّبُونَا اِلی اللّٰہِ زُلفٰی. ان اللّٰہ یحکم بینھم فیماھم فیہ یختلفون.

(سورۂ زمر۔۲۔۳)

سوآپ خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کی عبادت کرتے رہیئے یاد رکھو عبادت خالص اللہ ہی کے لئے ہے اور جن لوگوں نے اس کے سوا اور شرکاء تجویز کرر کھے ہیں (کہ) ہم توان کی پرستش بس اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا کا مقرب بنادیں، بے شک اللہ ان کے درمیان ان باتوں میں فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے تھے۔

اس کے علاوہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو خیال کی پاکی، فکر کی بلندی، نیت وارادہ کی صفائی ودرستی غیر سے بے تعلقی، اور عمل میں اخلاص کے اس معیار اور فکر وعقیدہ کی اس سطح پر ہے جس سے بہتر معیار اور بلند سطح ناقابل تصور ہے، دنیا کے تمام مذاہب فلسفے، دینی اور عقلی نظام اور پوری انسانیت مل کر بھی آج تک اس جیسی کوئی چیز پیش کرنے سے قاصر رہی اور اس معیار کے قریب بھی اس کی رسائی نہ ہوسکی، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنا جو وصف بیان کیا ہے اس پر کوئی اضافہ ناممکن ہے۔

لیس کمثلہٖ شئی وھو السمیع البصیر.

(سورۂ شوریٰ۔۱۱)

کوئی چیز اس کے مثل نہیں اور وہی (ہر بات کا سننے والا ہے (ہر چیز کا) دیکھنے والا ہے۔

ایک مشہود کی ضرورت جو شوق وتعظیم کا مرکز بن سکے:

لیکن فطرت انسانی، فطرت انسانی ہی ہے، ایک ایسی چیز کی جستجو اور آرزو ہر بشر کی سرشت میں داخل ہے، جس کو وہ اپنی ان مادّی آنکھوں سے دیکھ سکے اس کے ذریعہ اپنے جذبۂ شوق کی تسکین کر سکے، اور قرب ووصال اور تعظیم وتسلیم کے اس شدید تقاضے کی آسودگی کا سامان کر سکے جو ہمیشہ سے اسکے خمیر میں ہے۔

شعائر اللہ اوران کی حکمت:

اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی ظاہری اور محسوس چیزیں مقرر کی ہیں جو اس کی ذات اقدس کے ساتھ کچھ خصوصیت رکھتی ہیں، اسی کی طرف منسوب ہیں اسی کی کہلائی جاتی ہیں، اور ان پر اس کی رحمت کی اس قدر تجلی اور عنایت کی ایسی نظر ہے کہ ان کو دیکھ کر ہی خدا یاد آتا ہے، اس کے علاوہ ان کے ساتھ بہت سے ایسے واقعات ومعاملات اور اعمال واحوال وابستہ ہیں جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں اور اس کے انعامات، اس کا دینِ توحید اور اس کے رسولوں کا جہاد اور صبر یاد دلاتے ہیں، ان چیزوں کا نام اس نے ’’شعائر اللہ‘‘ رکھا، ان کی تعظیم، اپنی تعظیم قرار دی اور ان میں کوتاہی اپنے حق میں کوتاہی کے مرادف بتایا، اور انسانوں کو اس کی اجازت بلکہ دعوت دی کہ اس کے ذریعہ وہ اپنی پوشیدہ ومستور محبت اور مشاہدہ

وقرب کے فطری جذبہ کو تسکین دیں اور اپنی آسودگی کا سامان کریں۔ ارشاد ہے:

ذٰلک ومن یعظم شعائر الله فانها من تقوی القلوب
(سورۂ حج۔۳۲)

یہ بات ہوچکی اور جو کوئی (دین) خدا کی یادگاروں کا ادب رکھے گا سو یہ (ادب) دلوں کی پرہیزگاری میں سے ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے:

ذٰلک ومن یعظم حُرُمٰتِ اللّٰهِ فهو خیرٌ لّه عند ربه.
(سورۂ حج۔۳۰)

یہ بات ہوچکی اور جو کوئی بھی اللہ کے محترم احکام کا ادب کریگا سو یہ اس کے حق میں اس کے پروردگار کے پاس بہتر ہوگا۔

عقل ومادّیت کے پرستاروں کے خلاف نعرۂ بغاوت:

اس کو کبھی اپنی سنجیدہ ومتین اور جامد عقل کے خلاف بھی بغاوت کی ضرورت پیش آتی ہے، اور اس میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ جو زندگی بغاوت اور انقلاب کے بغیر گذر جائے وہ کیا زندگی ہے، اس کو اس کی ضرورت ہے کہ عادات واطوار، پسند وناپسند، خودساختہ قوانین، مصنوعی تہذیب، ظاہری تکلفات، رسمی وضعداریوں اور اس سخت وبے رحم سماج کے بندھے ٹکے نظام اور فرضی بندھنوں کو توڑ کر آزاد ہو جائے، زمام کار اس عقل سے لے کر جو عرصہ سے اس پر قابض ہے تھوڑی دیر کیلئے جذبۂ دل اور رہوارِ شوق کے حوالہ کردے، کبھی اس طرح بادیہ پیمائی وصحرانوردی

کرے جس طرح عشاق ومحبین اپنے محبوب کیلئے کرتے ہیں، کبھی اس شوریدگی و آشفتہ سری کا مظاہرہ کرے جو اہل جنون واہلِ وفا کا شعار ہے اس لئے کہ جس کو سوسائٹی، سماج اور رسم ورواج نے اپنا غلام بنالیا ہو اس کو آزاد کون کہہ سکتا ہے؟ جو اپنی عادات وخواہشات اور مرغوبات کا اسیر ہو اس کو موحّد کیسے کہا جاسکتا ہے؟ اسی طرح اس شخص کو مطیع وفرماں بردار اور وفا شعار کیسے کہا جاسکتا ہے، جو ہمیشہ اپنی عقل پر اعتماد کرتا ہو اور جب تک اپنی محدود اور مخلوق عقل کے پیمانہ سے کسی چیز کو ناپ نہ لے اور اس کے محسوس اور مادی فوائد اس کے علم میں نہ آجائیں اس میں کسی کام کا ولولہ اور اطاعت کا جذبہ ہی پیدا نہ ہوتا ہو، یہ حج اپنی مخصوص شکل کے ساتھ عقل اور مادیت کے پرستاروں اور نظم وڈسپلن کے اسیروں کے خودساختہ قوانین اور زندگی کے اس ''روٹین'' کے بالکل منافی ہے جس کے وہ دلدادہ ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر ایمان بالغیب اور حکم کو محض حکم سمجھ کر بے چوں وچرا بجالانے کا جذبہ اور ملکہ پیدا ہو، اور اس عقل کو تھوڑی دیر کیلئے اپنے اس منصب سے ہٹادیا جائے جو ہر چیز کو منطق وفلسفہ، بحث ومناظرہ اور دلیل وحجت کے پیمانہ سے ناپتی ہے، اور ہر وقت اور ہر جگہ منطق واستدلال سے کام لیتی ہے۔

امام غزالیؒ نے حج کی حقیقت اور روح کو (جس کو ایمان بالغیب اور مطلق امتثال امر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے) بڑے عجیب اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے، اور اپنے موئے قلم سے اس کی دلکش اور دل آویز تصویر کھینچ دی ہے، انہوں نے دین کے اس اہم رکن کے قلب وجگر میں اتر کر اس کی بہت اچھی تشریح کی ہے، اور اس کے مغز اور جوہر کو ہمارے سامنے پیش کردیا ہے جو بہت سے قدیم وجدید اہل فکر کی

نظر سے رہ گیا تھا، وہ لکھتے ہیں:

"اس (بیت اللہ کی) وضع اور شکل ایک شاہی دربار یا شاہی ایوان کی طرح ہے، جہاں پر عشاق واہل فراق ہر دشوار گزار اور دور دراز مقام سے افتاں وخیزاں، آشفتہ سر اور پراگندہ مو ہو کر پہنچتے ہیں، رب البیت کے سامنے سر تسلیم ختم کئے ہوئے، اپنی حقارت کا احساس لئے ہوئے، اس کی عزت وجلال کے سامنے اپنے کو فراموش کئے ہوئے، اس علم واعتراف کے ساتھ کہ وہ اس سے پاک اور بلند و برتر ہے کہ کوئی گھر اور چہار دیواری اس کو گھیر سکے، یا کوئی شہر اس کا احاطہ کر سکے تاکہ ان کی عبودیت ورقت اپنی انتہا کو پہنچ جائے، اور اطاعت وانقیاد اور تسلیم ورضا میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔

اسی لئے ان کو ایسے اعمال اور نقل وحرکت کا پابند کیا گیا ہے، جن سے نہ نفس انسانی کو کوئی لگاؤ ہے، نہ عقل کی وہاں تک رسائی ہے، مثلاً رمی جمار (شیطان کو ایک خاص جگہ پہنچ کر پتھر مارنا) صفا ومروہ کے درمیان بار بار دوڑنا، اس قسم کے اعمال کمالِ عبودیت اور غایت درجہ فنائیت کو ظاہر کرتے ہیں، زکوٰۃ ایک قسم کی رحم دلی غمخواری ہے، اس کا مفہوم بھی آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے، اور عقل بھی اس کو قبول کرتی ہے، روزہ نفس کشی اور ان خواہشات بشری کی سرکوبی کے لئے ہے، جن کو شیطان اپنی مقصد براری کے لئے استعمال کرتا ہے، اور اس میں دوسرے مشاغل کم کر کے عبادت میں انہماک واشتغال کا پہلو واضح ہے، نماز میں رکوع و سجود اور ان افعال اور حرکات کے ذریعہ جن سے تواضع کی روح پیدا ہوتی ہے خدا کے سامنے اس کی کبریائی اور اپنے عجز کا اظہار ہے اور اس سے دلوں کو خاص لگاؤ

محسوس ہوتا ہے، لیکن رمی جمار اور سعی اور اس طرح کے دوسرے اعمال ایسے ہیں، جن سے دل کو کوئی حظ اور سرور حاصل نہیں ہوتا، طبیعت بشری بھی ان کی طرف مائل نہیں ہوتی اور عقل بھی ان کے معنی ومفہوم سے قاصر رہتی ہے، چنانچہ یہ عمل یا اقدام صرف اطاعت ہی کے جذبہ سے کیا جاتا ہے، یہ سمجھ کر کہ یہ خدا کا ایک حکم ہے جو بہر صورت واجب الاتباع ہے، اس سے مقصود عقل کو اس کے اختیارات سے محروم کر دینا اور نفس وطبیعت کو ان چیزوں سے دور رکھنا ہے، جن سے اس کو لگاؤ اور انس پیدا ہو سکتا ہو، اس لئے کہ جب کوئی چیز عقل سے اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے تو طبیعت اس کی طرف خود بخود چلنے لگتی ہے، اور طبیعت کا یہ رجحان خود اس عمل کا باعث اور محرک بن جاتا ہے اور اس میں کمال عبدیت اور مجرد اطاعت کی شان باقی نہیں رہتی، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر خصوصیت سے یہ لفظ کہے: " **لبّیک بحجة حقاً تعبّداً ورقاً** " لبیک حج پر سچے دل کے ساتھ غلامی اور عبدیت کے جذبہ کے ساتھ۔

حج کے علاوہ یہ الفاظ آپ نے کسی اور عبادت حتیٰ کہ نماز کے لئے بھی استعمال نہیں فرمائے۔"

حاجی حکم کا بندہ ہے اور اشاروں کا غلام ہے

حج اپنے سارے ارکان واعمال اور مناسک وعبادات کے ساتھ اطاعت محض، مجرد امتثال امر، بے چوں وچرا حکم بجالانے اور ہر مطالبہ کے آگے سر جھکا دینے کا نام ہے، حاجی کبھی مکہ میں نظر آتا ہے، کبھی منیٰ میں، کبھی عرفات میں، کبھی

مزدلفہ میں، کبھی ٹھہرتا ہے، کبھی سفر کرتا ہے، کبھی خیمہ گاڑتا ہے، کبھی اکھاڑتا ہے، وہ حکم کا بندہ اور چشم وابرو کا پابند ہے، اس کا خود نہ کوئی ارادہ ہوتا ہے، نہ فیصلہ، نہ انتخاب کی آزادی، وہ منیٰ میں اطمینان سے سانس بھی لینے نہیں پاتا کہ اس کو عرفات جانے کا حکم ملتا ہے لیکن مزدلفہ میں رکنے کی اجازت نہیں ہوتی، عرفات پہنچ کر وہ دن بھر دعا وعبادت میں مشغول رہتا ہے غروب آفتاب کے بعد اس کو اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ ذرا ستالے اور رات کو یہیں رہ جائے لیکن اس کے بجائے اس کو مزدلفہ جانے کا حکم ملتا ہے، وہ زندگی بھر نماز کا پابند رہا تھا، لیکن عرفہ میں اس کو اس کا حکم ہوتا ہے کہ مغرب کی نماز ترک کردے اس لئے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے، نماز یا اپنی عادت کا بندہ نہیں، وہ یہ نماز مزدلفہ پہنچنے کے بعد عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھتا ہے، مزدلفہ میں اس کا خوب جی لگتا ہے، اور سوچتا ہے کہ یہاں جی بھر کر ٹھہرے مگر اس بات کی اجازت بھی اس کو نہیں ملتی اور اس کو منیٰ کی طرف رُخ کرنے کو حکم ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سب انبیاء کرام اور ان کے بعد تمام عشاق و اہل محبت، اہلِ دل اور اہلِ طلب کی زندگی کا طرز یہی تھا کبھی سفر کبھی قیام کبھی وصل کبھی ہجر، نہ عادت کی غلامی، نہ ذوق کی اسیری، نہ خواہش کی تابعداری، نہ شہوت کے سامنے سپر اندازی۔

رحمتِ خداوندی کو متوجہ کرنے میں زمان ومکان کا حصہ:

اس کے لئے سب سے موزوں اور مناسب جگہ یہی تھی، جہاں اہلِ محبت کے پیشوا مخلصین کے امام اور اپنے زمانہ میں اللہ کے سب سے زیادہ محبّ اور محبوب

اور مقرب بندہ نے اخلاص ومحبت، وفاداری وجاں نثاری، اور ایثار وقربانی کی ایسی دلآویز اور حیرت انگیز کہانی پیش کی جو پاکیزہ محبت بے غرض وفاداری اور صدق و اخلاص کی تاریخ میں سب سے زیادہ تابناک اور دلفریب ہے ان کے بعد جتنے انبیاء کرام، موحّد و مخلص اور عاشق صادق پیدا ہوئے وہ سب اپنے اپنے دور میں انہی کے نقش قدم پر چلتے رہے، ان کی ایک ایک ادا کی نقل کرتے رہے اور صدق و وفا کی وہی کہانی دہراتے رہے، انہوں نے اسی طرح بیت اللہ کا طواف کیا، صفا و مروہ کے درمیان سعی کی، عرفات میں ٹھہرے مزدلفہ میں رات گذاری، جمرات میں کنکریاں ماریں اور منیٰ میں قربانی کی۔

اس طرح زمان ومکان میں، کہانی کی ان فصلوں میں جو برابر دہرائی جارہی ہیں، ان اعمال میں جن میں ان کی تقلید جاری ہے محبت کے ان جاں نواز اور روح پرور جھونکوں میں جن سے حجاج ازسرنو تازگی حاصل کرتے ہیں، اس ذوق وشوق میں جس میں وہ ہمہ وقت ڈوبے رہتے ہیں، امت کے ان مختلف طبقوں اور جماعتوں کی صحبت میں جن کی رفاقت ان کو میسر آتی ہے، اس دینی اور روحانی اجتماع میں جس کی نظیر روئے زمین پر کہیں اور نہیں ملتی اور ذکر ودعا، تلبیہ واستغفار کے دلآویز زمزموں میں جو ہر وقت اس فضا میں گونجتے رہتے ہیں اور دل میں بس جاتے ہیں، وہ چیز اب بھی موجود ہے جو مردہ دلوں کو حیاتِ نو بخشتی ہے، پست ہمتوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، مضمحل وافسردہ نفوس کو نئی زندگی عطا کرتی ہے، اور عشق کی اس دبی ہوئی چنگاری کو پھر سے بھڑکا دیتی اور چھیڑ دیتی ہے، جو بجھنے کے قریب تھی یا بجھ چکی تھی، رحمت الٰہی کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، اور اس میں جوش

پیدا کرتی ہے۔

مسلمانوں کے اس عظیم الشان اجتماع اور اہلِ ایمان کی دعاؤں میں رحمت الٰہی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی جو خاصیت ہے، اور اس کی بدولت سخت سے سخت دل والوں کو زندگی وحرکت اور ذوق وشوق کی جو کیفیت حاصل ہوتی ہے، اس کی طرف بہت سے اہل نظر واہل دل علماء اسلام نے متوجہ کیا ہے۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں:

’’جب ہمتیں کسی خاص نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں، دل تضرع و بیتابی میں مشغول ہوتے ہیں، ہاتھ خدا کے سامنے پھیلے ہوتے ہیں، نگاہیں آسمان کی طرف اٹھی ہوتی ہیں، اور سب ایک جان اور ایک دل ہوکر پوری توجہ کے ساتھ رحمتِ الٰہی کے امیدوار ہوتے ہیں تو اس وقت ایسا نہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو مایوس کردے گا، ان کی کوششوں کو ضائع فرمادے گا، اور اپنی رحمت سے ان کو محروم و بے نصیب رکھے گا۔‘‘ (احیاء العلوم ج۱ص۲۴۳)

حضرت شاہ ولی اللہ نے حج پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

’’حج کی حقیقت یہ ہے کہ صالحین کی ایک بڑی جماعت ایک خاص زمانہ میں جمع ہو اور ان لوگوں کا حال یاد کرے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا۔ مثلاً انبیاء وصدیقین، شہداء وصالحین اور اس جگہ جمع ہو جہاں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں موجود ہیں، اور جہاں ائمہ دین اور صالحین امت شعائر اللہ کی تعظیم میں سرشار ہوکر گڑگڑاتے، روتے ہوئے خیر وبخشش کے طالب اور کفارۂ سیئات کے امیدوار بن کر آئے ہیں، اس لئے کہ جب ہمتیں اس کیفیت کے ساتھ جمع ہوتی ہیں تو رحمت ومغفرت کے نزول میں تخلف نہیں ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شیطان اس قدر حقیر،

راندۂ درگاہ، ذلیل وخوار اور غصہ سے جلا ہوا کسی دن نہیں ہوتا جتنا عرفہ کے دن۔‘‘

ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’یہ بات بھی طہارت نفس میں داخل ہے کہ آدمی ان جگہوں میں اترے اور قیام کرے جہاں صالحین اور اولیاء اللہ ہمیشہ سے دل کی تعظیم اور ارادت کے ساتھ اترتے آئے ہیں، اور اس کو خدا کے نام سے معمور کرتے رہے ہیں، یہ اہلِ خیر کے حق میں ملائکہ اور ملاء اعلیٰ کو متوجہ کرنے کا باعث ہوگا، اور جب وہ وہاں اترے گا تو ان کا رنگ اس پر بھی چڑھ جائے گا۔‘‘

انسانیت کا سہارا:

حج اور اس موسم کے تمام مناسک اور ملت ابراہیمی کے فرزندوں کا مکہ میں یہ سالانہ اجتماع حضرت ابراہیمؑ اور ان کے نام لیواؤں وروحانی فرزندوں کے باہمی ارتباط اور ان معانی وعقائد اور مقاصد کی تجدید کے لئے بالکل کافی ہے، اور اس میں نہ صرف اس ملت بلکہ ساری انسانیت کی بقا ہے۔

جعل اللّٰہ الکعبۃ البیت	اللہ نے کعبہ کے مقدس گھر کو
الحرام قیٰماً للناس	انسانوں کے باقی رہنے کا مدار
والشھر الحرام والھدی	ٹھہرایا ہے (نیز) حرمت
والقلآئد . ذٰلک	والے مہینہ کو اور حرم میں قربانی
لتعلموآ ان اللّٰہ یعلم	کو، اور گلے میں پٹہ پڑے

مافی السمٰوٰت وما فی الارض و ان اللہ بکل شیءٍ علیم . (سورہ مائدہ-۹۷)	جانوروں کو، یہ اس لئے کہ تم یقین کرلو کہ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ اس سب کا علم رکھتا ہے، اور بیشک اللہ ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے۔

ہدایت وارشاداور اصلاح وجہاد کا ابدی مرکز:

عہد اسلامی اور رسالت محمدیؐ کے دور میں یہ گھر ہدایت وارشاد، روحانیت و للہیت، دل کی غذا اور طمانینت وسکینت کا ایک مستقل اور ابدی مرکز بن گیا، جہاں مناسک حج ادا کئے جاتے ہیں، روح ودل کو غذا اور قوت پہنچائی جاتی ہے، دل کے سرد خانہ کو پھر سے گرم اور روشن کیا جاتا ہے اور گویا اس کے استعمال شدہ ''سلز'' کی جگہ نئے اور طاقتور ''سِلز'' لگائے جاتے ہیں، پوری امت یہاں سے دینی پیغام حاصل کرتی ہے، سارا عالمِ اسلام ہر سال یہاں جمع ہوکر اپنی محبت واطاعت اور تسلیم وانقیاد کا خراج ادا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس مضبوط رسی اور اس رکن رکین کے ساتھ اپنی گہری وابستگی کا ثبوت دیتا ہے، دنیا کے بڑے سے بڑے فضلا وعلماء بادشاہ وامراء، اغنیاء وفقراء، سیاست داں اور حکمراں، عشق ومحبت اور جوش ووارفتگی کے ساتھ اس کا طواف کرتے ہیں، لیکن فہم وبصیرت اور احساس وشعور لئے ہوئے وہ اس کا عملی ثبوت دیتے ہیں کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد، تنوع کے باوجود ہم رنگ وہم خیال، انتشار کے باوجود شانہ بشانہ اور صف بصف، فقر کے باوجود غنی اور

ضعف کے باوجود قوی ہیں، وہ اگرچہ پورے عالم اسلام میں منتشر اور اپنے مسائل اور زندگی کے مطالبات میں منہمک ہیں، مختلف نسلوں اور مختلف قوموں سے تعلق رکھتے ہیں، اور متنوع تہذیبوں اور ثقافتوں سے وابستہ ہیں تاہم ایک خاص نقطہ پر پہنچ کر وہ سب ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں، اور ایک ہو جاتے ہیں، ان کی زندگی طواف وسعی، عبادت وقربانی، ایمان وعقیدہ اور ان کے سفر کی منزلیں منیٰ اور عرفات اور حج کے مقامات ہیں، وہ ہر وقت اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں رہتے ہیں، مستقل پیش قدمی اور ترقی نئی نئی ملاقاتیں اور تعارف نئی نئی منزلیں اور راہیں، یہ سفر در سفر ان کے دم واپسیں تک جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے مالک سے جاملتے ہیں۔

اسلامی وانسانی اخوت، اور عالمی برادری کا مظاہرہ:

حج ان وطنی، نسلی، لسانی اور علاقائی قومیتوں کے خلاف اسلامی قومیت کی جیت ہے جن کے بہت سے اسلامی ممالک (مختلف عوامل اور دباؤ کے ماتحت) شکار ہیں، وہ اسلامی قومیت کا مظہر اور اعلان ہے، یہاں پہنچ کر تمام اسلامی قومیں اپنے ان قومی وملکی لباسوں سے آزاد ہوکر جو ان کی پہچان بن گئے تھے، اور جن سے بہت سی قومیں تعصب کی حد تک وابستہ ہیں، اسلام کا ایک قومی لباس اختیار کرلیتی ہیں جس کو دین وفقہ اور حج وعمرہ کی اصطلاح میں ''احرام'' کہا جاتا ہے، سب عاجزی وانکساری احتیاج ولاچاری اور گریہ وزاری کے ساتھ ایک زبان میں ایک ترانہ اور ایک ہی نعرہ لگاتے ہیں:

لَبَّیکَ اَللّٰھم لبّیک لا شریک لک لبّیک اِنَّ الْحَمْدَ و النِّعمَۃَ لک والملک لا شریک لک	اے میرے اللہ میں حاضر ہوں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں، ساری تعریفیں اور نعمتیں تیرے ہی لئے زیبا ہیں اور حکومت و بادشاہت بھی، تیرا کوئی شریک نہیں۔

ان میں حاکم ومحکوم، آقا ونوکر، امیر وفقیر اور چھوٹے بڑے کی کوئی تفریق نہیں ہوتی، ان کے لباس اور صدا دونوں میں اسلامی قومیت جلوہ گر نظر آتی ہے یہی حال حج کے دوسرے اعمال، عبادات، مناسک اور شعائر ومقامات کا ہے، جہاں ہر قوم وملک کے لوگ دوش بدوش نظر آتے ہیں، اور قریب وبعید اور عرب وعجم کے سارے فرق مٹ جاتے ہیں، صفا ومروہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان سب ساتھ دوڑتے ہیں، منیٰ ساتھ سفر کرتے ہیں، عرفات ساتھ جاتے ہیں، اور جبل رحمت پر ایک ساتھ حاضر ہوکر دعا کرتے ہیں، اور سب ایک ہی جگہ رات گذارتے ہیں۔

فاذا أفَضْتُم من عَرَفاتٍ فاذکروا اللّٰہ عند المَشْعَرِ الحَرام وَاذْکُرُوہُ کما ھَداکم و ان کنتم من قبلہٖ لمن الضآلین . (سورہ بقرہ-۱۹۸)	پھر جب تم جوق در جوق عرفات سے واپس ہونے لگو تو اللہ کا ذکر مشعرِ حرام کے پاس کر لیا کرو، اور اس کا ذکر اس طرح جیسا اس نے تمہیں بتایا ہے، اور اس سے قبل تم یقیناً محض ناواقفوں میں تھے۔

سب ایک ساتھ واپس آتے ہیں، ایک ساتھ متحرک ہوتے ہیں، اور ایک ساتھ ساکن ہوتے ہیں:

ثم افیضوا من حیث افاض الناس واستغفروا اللّٰہ، ان اللہ غفورٌ رَّحیم (سورہ بقرہ-۱۹۹)	ہاں تو تم وہاں جا کر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں، اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بیشک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

منیٰ میں بھی قیام ایک ساتھ کرتے ہیں، اور نحر (قربانی) حلق (سر منڈانا) اور رمی (شیطان کو پتھر مارنا) کے سارے کام ایک ساتھ انجام دیتے ہیں۔

جب تک حج باقی ہے (اور وہ انشاء اللہ قیامت تک باقی رہے گا) اس وقت تک مسلمانوں کو یہ قومیتیں اور غیر اسلامی دعوتیں نگل لینے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں، اور وہ ان کا لقمۂ تر نہیں بن سکتے اور اپنے اپنے ملکوں میں (جن سے ان کو اپنے فطری جذبات اور قومی عصبیت کے لحاظ سے فطری محبت ہوتی ہے) کوئی ایسا نیا کعبہ بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکتے جو حج کی جگہ لے لے اور سارے مسلمان اس کے گرد جمع ہو جائیں یہ قبلہ ہمیشہ ایک ہی رہے گا، جہاں مشرق ومغرب اور عرب وعجم کے تمام رہنے والے اپنا رخ کریں گے، یہ بیت اللہ بھی ہمیشہ ایک رہے گا، جس کے حج کے لئے ہندی وافغانی اور یورپی وامریکی مسلمان سب برابر جاتے رہیں گے۔

و اذ جعلنا البیت مثابةً للناس و امنا . و اتخذوا من مَّقامِ ابراھیم مصلّٰی
(سورہ بقرہ-۱۲۵)

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے خانۂ کعبہ کولوگوں کیلئے ایک مقامِ رجوع اور مقامِ امن مقرر کیا اور مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو۔

روئے زمین کے ایک ایک دورافتادہ اور دشوار گذار گوشہ سے لوگ کھنچ کھنچ کر یہاں پہنچیں گے اس دن کے لئے منتیں مانیں گے اور دن گنیں گے اور اسی دربار میں حاضری کو اپنی سب سے بڑی تمنا اور سب سے بڑی سعادت وخوش نصیبی سمجھیں گے۔

☆...... ف: سبحان اللہ! کیا خوب تسلی بخش مضمون ہے جو حضرت مولانا کے کمال ایمان واحسان پر بین ثبوت ہے۔ (مرتب)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حج کے موضوع پر کلام کرتے ہوئے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ بالغہ'' میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

''حج کی اصل بنیاد ہر ملت میں موجود ہے، ان سب کے لئے ایک ایسے مقام کی ضرورت تھی جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے طور پر اپنے اسلام کی طرف منسوب قربانیوں اور اعمال ومناسک کی وجہ سے ان کی نظر میں متبرک ہوں اس لئے کہ ان سے ان مقربین اور ان کے اعمال کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

اور بیت اللہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے اس لئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کھلی ہوئی نشانیاں پائی جاتی ہیں، اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا جو

اکثر اقوام کے روحانی مورث ہیں، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک غیر آباد ویران مقام پر اللہ تعالیٰ کی عبادت اور حج کے لئے یہ پہلا گھر تعمیر کیا، اب اگر اس کے علاوہ کہیں اور کچھ ہے تو اس میں شرک، بدعت اور اختراع ضرور شامل ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۵۹)

اگر کوئی شخص اسلامی حج کا موازنہ اور تقابل دوسرے مذہب کے ساتھ کرے گا تو وہ بھی بآسانی اسی نتیجہ تک پہنچے گا اور یہ آیت اس کی زبان پر جاری ہوجائے گی:

لکل امةٍ جعلنا منسکاً ھم ناسکوہ فلا ینازعنک فی الامر وادعُ الیٰ ربک ، انک لعلیٰ ھدیً مستقیم.
(سورۂ بقرہ-۶۷)

ہم نے ہرامت کے واسطے ایک طریقہ (ذبح وعبادت کا) مقرر کررکھا ہے وہ اس پر چلنے والے ہیں، سوانہیں نہ چاہئے کہ آپ سے جھگڑا کریں (اس) امر میں اور آپ ان کو اپنے پروردگار کی طرف بلاتے رہئے بیشک آپ ہی سیدھے راستے پر ہیں۔

حج میں اسلام کا اصلاحی کردار:

اسلام نے گذشتہ تین ارکان کی طرح حج میں بھی اپنی اصلاحی وتجدیدی کارنامہ انجام دیا ہے، اہلِ جاہلیت نے حج میں بہت سی جاہلی عادات اور بہت سی بے اساس رسمیں اور بدعتیں شامل کردی تھیں، جو حج میں کھلی ہوئی تحریف تھی، اس نے حج کے فوائد ومقاصد کو بیحد نقصان پہنچایا، جاہلی حمیت، قبائلی نخوت، قریش کا

فخر وتکبر اور امتیازی برتاؤ ان تحریفات و اضافات کا سب سے بڑا محرک تھا، قرآن مجید اور شریعت اسلامی نے اس بدعت وتحریف کا خاتمہ کیا، ایک ایک بدعت کی بیخ کنی کی، اور جاہلیت کی ایک ایک خصوصیت اور ایک ایک نشان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور اس سے بہتر چیز عطا کی۔

جاہلیت میں قریش حاجیوں کے ساتھ عرفات نہیں جاتے تھے بلکہ حرم ہی میں رُکے رہتے تھے، وہ کہتے تھے کہ ہم اہل اللہ میں سے ہیں، اور بیت اللہ کے محافظ ومجاور ہیں، ان کا منشا یہ تھا کہ وہ بقیہ لوگوں سے ممتاز رہیں، اپنی پوزیشن اور حیثیت اور جو امتیاز وفوقیت ان کے خیال میں ان کو حاصل تھی، اس کو برقرار رکھ سکیں اللہ تعالیٰ نے اس جاہلی اور نسلی امتیاز کو ختم کیا اور ان کو حکم دیا کہ جس طرح لوگ کرتے ہیں، وہی وہ بھی کریں اور عرفات میں قیام کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ثُمّ افیضوا مِن حیثُ افَاضَ النَّاسُ (سورۂ بقرہ ۱۹۹)	ہاں تو تم وہاں جا کر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں۔

امام بخاری اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ قریش اور وہ لوگ جو ان کے طریقہ پر تھے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے، اور ان کو "حمس" کہا جاتا تھا، بقیہ سب عرب عرفات میں قیام کرتے تھے، جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو حکم دیا کہ عرفات جائیں اور وہاں قیام بھی کریں، پھر سب کے ساتھ وہاں سے واپس ہوں اور یہی اللہ تعالیٰ کا قول ہے ﴿من حیث

افاض الناس﴾ ابن کثیر، ابن عباس مجاہد، عطاء، قتادہ سُدی اور دوسرے اکابر کا یہی خیال ہے، ابن جریر سے بھی یہی مروی ہے اور سب کا اس پر اجماع ہے۔

عہد جاہلیت میں حج کا موسم ایک دوسرے پر فخر کرنے اور مناظرہ ومقابلہ کا اسٹیج بن گیا تھا، جس طرح "عکاظ"، "ذوالمجنۃ" اور "ذوالمجاز" کے بازار اور میلے تھے، اہلِ جاہلیت ہر ایسی تقریب اور ایسے موقع کی تلاش میں رہتے تھے جہاں قبائل کو جمع ہو کر قصیدہ خوانی اور لن ترانی کا موقع مل سکے اور اپنے آباء واجداد کے کارنامے بڑھ چڑھ کر بیان کئے جائیں، "منیٰ کا اجتماع" اس جاہلی جذبہ کی تسکین کا بہترین ذریعہ تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو منع فرمایا اور اس کا بہترین بدل عنایت فرمایا، ارشاد ہوا:

فاذا قضیتم مناسککم فاذکروا اللہ کذکرکم اٰبآئکم اَوْ اشَدّ ذِکراً (سورہ بقرہ-۲۰۰)	پھر جب تم اپنے مناسک ادا کر رہے ہو، تو اللہ کی یاد کرو، اپنے باپ داداؤں کی یاد کی طرح، بلکہ یہ یاد اس سے بھی بڑھ کر ہو،

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ "اہل جاہلیت حج کے موسم میں ایک دوسرے سے مفاخرت کرتے تھے، کوئی یہ کہتا تھا کہ میرے باپ اس طرح کھلاتے پلاتے تھے، اور اس طرح دوسروں کا بوجھ اٹھاتے تھے، اور دوسروں کی طرف سے خوں بہا دے دیتے تھے، اپنے آبا و اجداد کے کارناموں کی توصیف کے سوا ان کا کوئی کام نہ تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿فاذکروا اللہ کذکرکم اٰبآئکم او اشد ذکراً﴾

حج نے مرورِ زمانہ کی وجہ سے اپنا تقدس، پاکیزگی اور سادگی وصفائی بڑی حد تک کھودی تھی، اور جاہلیت کے میلوں کی طرح ایک میلہ بن کر رہ گیا تھا، جس میں ہر طرح کی تفریح، کھیل، تماشے اور لڑائی جھگڑے ہونے لگے تھے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کی مذمت فرمائی اور ارشاد ہوا:

فلا رفث و لا فسوق ولا جدال فی الحج (سورۂ بقرہ ۱۹۷)

تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہونے پائے اور نہ کوئی بے حکمی اور نہ کوئی جھگڑا۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ عبداللہ بن وہب نے بیان کیا وہ کہتے ہیں مالک نے کہا کہ ''اللہ تعالیٰ کا یہ قول ﴿ **ولا جدال فی الحج** ﴾ یہ تھا کہ قریش مزدلفہ میں مشعر حرام کے پاس قیام کرتے تھے، اور ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے تھے، ایک گروہ کہتا تھا ہم حق پر ہیں، دوسرا کہتا تھا، ہم حق پر ہیں، ہمارے خیال میں یہی بات تھی، باقی صحیح علم اللہ کو ہے'' محمد بن کعبؓ کہتے ہیں کہ ''قریش جب منیٰ میں جمع ہوتے تھے تو ایک دوسرے سے کہتا تھا کہ ہمارا حج تم سے زیادہ مکمل ہوا، دوسرے لوگ بھی اسی طرح جواب دیتے تھے۔

اسی طرح عہدِ جاہلیت میں عرب جب اپنے معبودوں کے لئے قربانیاں کرتے تھے تو گوشت ان معبودوں کے سامنے رکھ دیتے تھے اور خون ان کے اوپر چھڑک دیتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

لن ینال اللہ لحومھا ولا دمآئھا (سورۂ حج -۳۷)

اللہ تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون۔

ابن کثیر ابن حاتم سے روایت کرتے ہیں، وہ علی بن الحسین سے، وہ محمد ابن ابی حمّاد سے وہ ابراہیم بن المختار سے، وہ ابن جُریج سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اہل جاہلیت اونٹوں کا خون اور گوشت بیت اللہ پر ڈال دیا کرتے تھے، صحابۂ کرام نے یہ دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم اس کے زیادہ حق دار ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

لن ینال اللہ لحومھا ولا دمآئھا ولٰکن ینالہُ التقویٰ منکم (الحج-۳۷)

اللہ تعالیٰ تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون البتہ اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

عہد جاہلیت میں ایک رواج یہ تھا کہ جب حج کی نیت کر لیتے تھے، تو گھروں میں دروازے سے ہرگز داخل نہیں ہوتے تھے، اور اس کو بہت بڑا گناہ اور حج کو مجروح کرنے کے مرادف سمجھتے تھے، جب تک حالت اِحرام میں رہتے، پیچھے سے دیوار پھاند کر گھر آتے، اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی نفی فرمائی اور فرمایا کہ ایسا کرنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے۔

لیس البرَّ باَن تاتوا البیوت من ظُھُورِھا ولٰکن البِرَّ مَنِ اتقیٰ وَاتوا البُیوتَ من ابوابھا (سورۂ بقرہ-۱۸۹)

یہ تو (کوئی بھی) نیکی نہیں کہ تم گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آؤ، البتہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص تقویٰ اختیار کرے اور گھروں میں ان کے دروازوں ہی سے آؤ۔

بخاری میں عبیداللہ بن موسیٰ سے روایت ہے، وہ اسرائیل سے وہ ابواسحٰق سے وہ براء سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”اہل جاہلیت جب احرام میں ہوتے تو گھر کے پیچھے سے داخل ہوتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی :

لیس البرَّ بِاَن تاتوا البیوت من ظُهُورِها ولٰکن البرَّ مَنِ اتقیٰ وَاتوا البُیوتَ من ابوابها
(سورۂ بقرہ-۱۸۹)

یہ تو (کوئی بھی) نیکی نہیں کہ تم گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آؤ، البتہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص تقویٰ اختیار کرے اور گھروں میں ان کے دروازوں ہی سے آؤ۔

ابوداؤد طیالسی نے شعبہ، ابواسحٰق، براء سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”انصار سے کوئی شخص جب سفر سے واپس آتا تو گھر میں دروازہ سے داخل نہ ہوتا تھا اس پر یہ آیت اتری۔

ایک رواج یہ تھا کہ بعض لوگ حج کے لئے زادسفر کا انتظام کرنا اور اپنے ساتھ سامان لے جانا گناہ سمجھتے تھے، وہ توکل کا مظاہرہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اللہ کے مہمان ہیں اس لئے ہم کو زادِ سفر و راحلہ کی کیا ضرورت؟ البتہ سوال کرنے اور بھیک مانگ کر اپنی ضرورت پوری کرنے میں ان کو کوئی عار نہ ہوتا تھا، بلکہ اس کو وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ کا ایک مجاہدہ سمجھتے تھے اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی منع فرمایا اور ارشاد ہوا: ﴿**وتزوّدوا فان خیر الزّادِ التّقویٰ**﴾ (سورۂ بقرہ-۱۹۷) اور زادراہ لے لیا کرو اور بہترین زادراہ تو تقویٰ ہے۔

ابن کثیر، عوفی سے روایت کرتے ہیں، وہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے

ہیں کہ کچھ لوگ اپنے گھر سے اس حالت میں نکلتے کہ ان کے ساتھ کچھ بھی نہ ہوتا اور یہ کہتے کہ ہم بیت اللہ کا حج کرتے ہیں، کیا اللہ ہمیں نہ کھلائے گا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿**تَزَوَّدُوا**﴾ یعنی اتنا ضرور اپنے ساتھ رکھو جس سے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔“

بخاری میں ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اہلِ یمن حج کے لئے جاتے تھے تو اپنے ساتھ زادسفر نہ لیتے تھے، اور کہتے تھے ہم متوکلین میں سے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی :﴿**وتزوّدوا فان خیر الزّادِ التّقویٰ**﴾

اسی طرح اہلِ جاہلیت اس موسم میں تجارت کرنا بھی گناہ سمجھتے تھے، اور ایک حلال چیز کو حرام سمجھ بیٹھے تھے، بخاری میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ”عکاظ“ ذوالمجنۃ اور ذوالمجاز جاہلیت کے مشہور بازار تھے، لیکن حج کے موسم میں تجارت جرم تھی، اس پر یہ آیات نازل ہوئی:

لیس علیکم جناحٌ ان تبتغوا فضلاً من ربکم
(سورۂ بقرہ۱۹۸)

تمہیں اس باب میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے ہاں سے تلاش معاش کرو۔

مجاہد ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اہلِ عرب حج کے ایام میں بیع و شراء اور تجارت وکاروبار سے پرہیز کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ ذکر الٰہی کے دن ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿**لیس علیکم جناحٌ ان تبتغوا فضلاً من ربکم**﴾

ایک بہت بُرا رواج یہ تھا کہ بیت اللہ کا طواف بعض لوگ برہنہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم ان کپڑوں میں طواف نہیں کرتے جن میں ہم معصیت کرتے ہیں، یہ فساد عظیم کا دروازہ اور خالص جاہلی عادت تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

یٰبنی اٰدم خذوا زینتکم عند کل مسجدٍ	اے اولاد آدم ہر نماز کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔

(سورۂ اعراف-۳۱)

مسلم اور نسائی میں ابن جریر سے روایت ہے وہ اپنے الفاظ میں ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ''اہلِ جاہلیت کعبہ کا طواف برہنہ ہوکر کرتے تھے، مرد دن میں، عورتیں رات میں، عورتیں یہ شعر پڑھتی تھیں ؎

الیوم یبدو بعضہٗ او کلہٗ
وما بدا منہ فلا احلّہ

اس پر آیت نازل ہوئی ﴿خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ﴾
عوفی ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ﴿خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ کعبہ کا طواف عریانی کی حالت میں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو زینت کا حکم دیا، زینت وہ لباس ہے جو جسم کے قابل ستر حصوں کو چھپائے اور اس سے خوش پوشا کی بھی نمایاں ہو،'' ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''مجاہد، عطاء، ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر، قتادہ، سدّی، ضحاک، مالک اور زہری نے اس آیت کی تفسیر میں یہی مسلک اختیار کیا ہے، اور ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت مشرکین کے ان طبقوں کے لئے نازل ہوئی جو کعبہ کا طواف

برہنہ کرتے تھے۔

اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر اس کو ختم فرمایا اور حجۃ الوداع سے ایک سال قبل حضرت ابوبکرؓ کو وہاں بھیجا کہ وہ اس بات کا اعلان کریں کہ کوئی برہنہ شخص کعبہ کا طواف نہ کرے۔

بخاری اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ''حجۃ الوداع سے ایک سال قبل جس وفد پر حضرت ابوبکرؓ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر بنا کر بھیجا اس کو یہ ہدایت کردی کہ قربانی کے روز یہ اعلان کردے کہ اس سال کے بعد اب کوئی مشرک حج نہ کرے اور کوئی برہنہ شخص بیت اللہ کا طواف نہ کرے۔

(صحیح بخاری کتاب باب حج ابی بکر رضی اللہ عنہ بالناس)

بعض اہلِ جاہلیت کا عقیدہ یہ تھا کہ صفا ومروہ کا طواف نہ کرنا چاہئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

ان الصفا والمروۃ من شعآئر اللّٰہِ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ عْتَمَرَ فَلاَ جُنَاح علیہ اَنْ یَطَّوَّفَ بِھِمَا. (سورۂ بقرہ-۱۵۸)	صفا و مروہ بیشک اللہ کی یادگاروں میں سے ہیں، سو جو کوئی بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے اس پر (ذرا بھی) گناہ نہیں کہ ان دونوں کے درمیان آمد ورفت کرے۔

عروہؓ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ''حضرت عائشہؓ نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا کہ آیت ﴿ان الصفا والمروۃ من شعآئر اللّٰہِ فَمَنْ حَجَّ

الْبَیْتَ اَو اعْتَمَرَ فَلاَ جُنَاح علیه اَنْ یَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ کا مطلب کیا ہے؟
میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہی ہے کہ جو ان کا طواف کرے اس پر کوئی گناہ نہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میرے بھانجہ! تم نے بالکل غلط کہا، اگر اس کو اس مفہوم پر محمول کیا جائے جو تم کہہ رہے ہو تو آیت کو اس طرح ہونا چاہئے تھا﴿ فلا جناح علیه ان لا یطوف بهما ﴾ یہ آیت اس طرح نازل ہوئی کہ انصار اسلام سے پہلے اس (مناۃ) کے لئے تہلیل کرتے تھے، جو (مشلل) کے پاس واقع ہے جو اس کی تہلیل کرتا تھا، صفا ومروہ کے طواف کو برا سمجھتا تھا، پھر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارہ میں دریافت کیا اور کہا ہم جاہلیت میں صفا ومروہ کا طواف کرنا برا سمجھتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ ان الصفا والمروۃ من شعآئرِ اللّٰہِ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ عْتَمَرَ فَلاَ جُنَاح علیه اَنْ یَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کی سنت جاری فرمائی اب کوئی اس کو ترک نہیں کرسکتا (صحیحین)

امام بخاری محمد بن یوسف سے وہ سفیان سے وہ عاصم بن سلیمان سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے انسؓ سے صفا ومروہ کے بارہ میں دریافت کیا انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس کو پہلے جاہلیت کی نشانیوں میں سمجھتے تھے، جب اسلام آیا تو ہم نے اس کو جاہلیت کی بات سمجھ کر ترک کر دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿ ان الصفا والمروۃ من شعآئرِ اللّٰہِ ﴾

شریعت اسلامی نے ان دوررس اور اہم اصلاحات کے ذریعہ اس عظیم رکن کو وہ ابراہیمی اصل اور حقیقی و پاکیزہ شکل درحقیقت دوبارہ عطا کی ہے جو ہر قسم کی

تاویل وتحریف، آمیزش، ملاوٹ اور فریب کی دسترس سے دور اور ہر طرح مکمل اور محفوظ ہے۔

☆......ف : ان مضامین ومقالات کو پڑھ کر یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے دربرگ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

یعنی قارئین کرام ارکان اربعہ کے مندرجہ اقتباسات میں حضرت مفکر اسلامؒ کے علوم ومعارف اور باطنی ملکات وکیفیات کی جھلکیاں ضرور محسوس کریں گے، نیز دیگر تصنیفات کے انتخابات اور نادر مقالات کے مطالعہ سے آپ کے ایمانی جذبات اور مسلمانوں کی عام دینی ودنیوی زبوں حالی اور پست ہمتی پر آپ کے قلبی درد وکرب کا بالیقین احساس کریں گے۔

اللہ ہم سب کو حضرت مولاناؒ کے ظاہری علوم وآداب کے ساتھ باطنی احوال و کیفیات سے مشرف فرما کر ان کے افکار ونظریات کو عام وتام کرنے کی سعادت نصیب فرمائیں۔

وما ذٰلك علی الله بعزیز

محمد قمر الزمان الہ آبادی
جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
وصی آباد، الہ آباد

مطبوعات مکتبہ دارالمعارف الٰہ آباد

۶۳۹/ بی وصی آباد، الٰہ آباد، یوپی

اقوال سلف: ۶/ جلدیں	تربیت اولاد کا اسلامی نظام
وصیۃ الآداب	فیضان محبت (شرح عرفان محبت)
معارف صوفیہ	گلدستہ اذکار (ریاض السالکین من....)
تذکرۂ مصلح الامتؒ	روح البیان: ۳/ جلدیں
نقوش وآثار مفکر اسلامؒ	عرفان محبت
مشائخ نقشبندیہ مجددیہ	اخلاق سلفؒ
شیخان (عینان تجریان)	کمالات نبوت
درس قرآن	نکاح کی شرعی حیثیت
احسن السیر	دینی نصاب (اول)
حقیقی حج	جامع الاحکام
احادیث سلوکیہ	تسہیل قصد السبیل
علامات قیامت	تذکیر آخرت
مکتوب گرامی امام غزالیؒ	سو درود وسلام کا مقبول وظیفہ
چند وصیتیں	فرائض ووظائف

انگریزی مطبوعات

Understanding The Qur`an	Upbringing of Children The Islamic Approach
Nikah in The Islamic Shariah	A Handbook (Faraiz and Wazaif)
The Reality of Hajj	Few Wise Counsels

گجراتی مطبوعات

تربیت اولاد کا اسلامی نظام	تصفیۃ القلوب
فرائض ووظائف	نکاح کی شرعی حیثیت
علامات قیامت	حقیقی حج
قیمتی وصیتیں	مفتاح الرحمۃ

جلد منظر عام پر آنے والی کتابیں

اخلاق فاضلہ	تصفیۃ القلوب (اردو)
دینی نصاب (دوم)	اعتراف ذنوب

مثل مطبوعات

نماز احناف	تالیفات مصلح الامت (۵/ جلدیں)
قرآن اور جدید سائنس	حالات مصلح الامتؒ (۴/ جلدیں)